دیر و حرم کا افسانہ

سید وصی احمد بلگرامی

دیر و حرم کا افسانہ

اور

دوسرے مضامین

سید وصی احمد بلگرامی

صفیر بلگرامی اکیڈمی
کراچی

طبع اول	:	۲۰۰۳ء
صفحات	:	۳۰۴
طابع	:	احمد برادرز (پریس) ناظم آباد، کراچی
تعداد	:	ایک ہزار
قیمت	:	دو سو پچاس روپے (=/۲۵۰)

صفیر بلگرامی اکیڈمی

فلیٹ ۱۰۳- کرسٹل ہومز

۶۳ -شرف آباد

(بالمقابل: شرف آباد کلب)

کراچی ۷۴۸۰۰

فہرست

دیباچہ

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب مجھے بابائے اردو مولوی عبدالحق کے ساتھ کام کرنے کی سعادت حاصل تھی۔ ہر مہینے کی سولھویں تاریخ کو، اور اگر اُس دن تعطیل ہو تو دوسرے روز ایک بزرگ باقاعدگی سے انجمن ترقی اردو کے دفتر آتے تھے۔ گرمی ہو یا سردی، میں نے اُن کو ایک ہی انداز میں دیکھا۔ بھرا بھرا جسم، اوسط قد، گندمی رنگ، سردیوں میں کالی اور عام طور پر کبھی سلیٹی اور کبھی ہلکے پیلے رنگ کی شیروانی، چھوٹی مہری کا پاجامہ، سیاہ اونچی باڑھ کی ٹوپی۔

میں انجمن ترقی اردو کے اُس دفتر کی بات کر رہا ہوں جس کی عمارت کا سابقہ نام شاردا مندر تھا اور جس کا سنگِ بنیاد مہاتما گاندھی کی اہلیہ شریمتی کستوری بائی نے رکھا تھا اور جس کے عقبی صحن میں بابائے اردو آسودۂ خاک ہیں۔

تیسری منزل پر کتب خانۂ خاص تھا۔ اُس کے سامنے کے برآمدے کے ایک کونے میں دیوار اُٹھا کر ایک کمرہ بنا دیا گیا تھا۔ میں اُسی میں بیٹھتا تھا۔ میرے کمرے کے باہر بنچ رکھے تھے جو دفتری اہل کاروں کے بیٹھنے کے کام آتے تھے۔ لیکن یہاں عموماً سیّد بدر عالم بیٹھا کرتے تھے۔ سیّد صاحب بابائے اردو کے مددگارِ خاص تھے اور چوتھی منزل پر اُنھیں کے ساتھ رہتے تھے۔ جب مولوی صاحب صبح نو بجے کے قریب کتب خانۂ خاص میں علمی و

ادبی کاموں کے لیے تشریف لاتے تو سیّد صاحب اُس وقت تک میرے کمرے کے باہر رکھے بنچوں پر بیٹھے اخبار پڑھا کرتے یا کسی دوسرے اہل کار سے باتیں کرتے رہتے، جب تک مولوی صاحب کتب خانے میں موجود رہتے۔ ایک یا دو بجے دوپہر کو مولوی صاحب اپنی قیام گاہ پر تشریف لے جاتے اور اُن کے ساتھ ہی سیّد صاحب بھی۔

انجمن کے روح و رواں تو بابائے اردو تھے لیکن رونقِ انجمن سیّد صاحب تھے۔ انجمن کا سارا علمی و انتظامی عملہ اُن کی خوش اخلاقی کی وجہ سے اُن کا گرویدہ تھا۔ سیّد صاحب کی اہمیت کی اصل وجہ یہ تھی کہ وہ بابائے اردو تک پہنچنے کا وسیلہ تھے۔ مولوی صاحب جب اپنی قیام گاہ پر ہوتے تو سیّد صاحب کی اجازت کے بغیر کوئی اُن سے مل نہیں سکتا تھا۔ مولوی صاحب اِنھیں بے حد عزیز رکھتے تھے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اِن کا تعلق ساداتِ مارہرہ سے تھا۔ وہ حضرت صاحب عالم مارہروی کی اولاد میں سے تھے۔ یہ وہی بزرگ ہیں جن کے غالب سے گہرے دوستانہ مراسم تھے۔

ہر مہینے کی سولھویں تاریخ کو سیّد صاحب کی حالت دیدنی ہوتی تھی۔ وہ صبح ہی سے سفید چکن کا کڑھا ہوا کرتا اور کلف سے کڑکڑاتا پاجامہ زیبِ تن کیے، میرے کمرے کے سامنے کے برآمدے میں ٹہلتے رہتے تھے۔ بارہ بجے سے اُن کی نظریں سیڑھیوں پر مرکوز ہو جاتیں۔ ہر آنے والے کے قدموں کی چاپ سُن کر غور سے دیکھتے کہ کہیں مہمانِ عزیز آ تو نہیں گیا۔ بارہ اور ایک بجے کے درمیان وہ بزرگ تشریف لاتے جن کا سیّد صاحب کو انتظار ہوتا۔ وہ بزرگ سیّد صاحب کو دیکھتے ہی کڑک دار آواز میں السلام علیکم کے بعد پوچھتے "سیّد بدرِ عالم کیسے ہو؟" علیک سلیک کے بعد وہ کتب خانے میں داخل ہو جاتے۔ مولوی صاحب سے سلام دعا ہوتی۔ کبھی وہ چند لمحے اُن کے پاس بیٹھ کر گفتگو کرتے اور پھر کتب خانے کی اُن کتابوں سے استفادہ کرتے جن کی فہرست وہ بنا کر لایا کرتے تھے۔ اِسی دوران مولوی صاحب آرام کے لیے چوتھی منزل یعنی اپنی قیام گاہ پر تشریف لے جاتے اور سیّد صاحب اُنھیں وہاں پہنچا کر واپس آ جاتے۔ جب اپنے کام سے فارغ ہو کر وہ بزرگ کتب خانے

سے باہر نکلتے تو سیّد صاحب اُنھیں اپنے ساتھ بنچ پر بٹھا کر اُن کی تواضع چائے اور بسکٹوں سے کرتے۔ کچھ دیر سیّد صاحب سے باتیں کر کے یہ بزرگ واپسی کے لیے اُٹھتے۔ سیّد صاحب اُن کے ساتھ نیچے جاتے اور انجمن کے صدر دروازے پر اُنھیں رخصت کرتے۔

اِن بزرگ کے بارے میں معلوم ہوا کہ انجمن سے میری وابستگی سے برسوں پہلے سے اِن کا یہی معمول ہے۔ آندھی آئے، طوفان آئے، بارش ہو، اِن کے اِس معمول میں فرق نہیں آتا۔ اِس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ہر مہینے کی سولھویں تاریخ کو پنشن لینے ٹرژری آفس جاتے تھے اور واپسی پر انجمن میں تشریف لاتے تھے۔ مذکورہ دفتر اور اِن بزرگ کے مکان کے درمیان انجمن کا دفتر تھا۔ گویا یہ کہنا چاہیے کہ گھر واپس جاتے ہوئے وہ انجمن میں ٹھکی لیتے تھے۔

میں ہر مہینے اُنھیں دیکھتا۔ سامنا ہوتا تو علیک سلیک ہو جاتی۔ بہت شفقت سے پیش آتے۔۔ یہ تھے سیّد وصی احمد بلگرامی۔ اردو کے منفرد انشا پرداز۔ سیّد بدر عالم سے اِن کا تعلق یہ تھا کہ سیّد صاحب جن صاحب عالم مارہردی کی اولاد میں سے تھے، اُنھیں کے نواسے صفیر بلگرامی، سیّد صاحب کے دادا تھے۔ ☆

بلگرامی صاحب کی وضع داری بے مثال تھی۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے اور انگریزوں

☆ بلگرامی صاحب کے مختصر حالاتِ زندگی یہ ہیں: صفیر بلگرامی (وفات ۱۱رمئی ۱۸۹۰ء) کے اکلوتے بیٹے سیّد نور احمد کے دو بیٹے تھے۔ بڑے سیّد عنایت احمد اور چھوٹے سیّد وصی احمد۔ یہ دونوں شاعر تھے۔ اول الذکر کا تخلص دل گیر اور ثانی الذکر کا فانی تھا۔ لیکن سیّد وصی احمد نے شاعری کی طرف کبھی سنجیدگی سے توجہ نہ کی۔ لیکن اُن کی نثر اُن کے شاعرانہ مزاج کی عکاسی کرتی ہے۔ سیّد وصی احمد بلگرامی ۱۶ردسمبر ۱۸۸۹ء کو آرہ (بہار) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی۔ ۱۹۰۷ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے میٹرک کیا۔ انٹر تک تعلیم مظفر پور میں اور بی اے کا امتحان پٹنہ کالج، پٹنہ سے دیا (۱۹۱۱ء)۔ تمام امتحانوں میں امتیاز کے ساتھ کامیابیاں حاصل کیں۔ ۱۹۱۸ء میں سرکاری ملازمت اختیار کی۔ بہار کے مختلف مقامات (بکسر، پورنیہ، مونگیر، دربھنگہ، چھپرہ، پٹنہ وغیرہ) پر مختلف حیثیتوں سے (ڈپٹی کلکٹر، ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ، اسسٹنٹ رجسٹرار کواپریٹو، انڈر سکریٹری حکومت بہار) کام کیا۔ مئی ۱۹۴۷ء میں ملازمت سے ریٹائر ہوئے۔ اگست ۱۹۴۷ء میں پاکستان آ گئے۔ ۱۴رنومبر ۱۹۷۶ء کو کراچی میں انتقال کیا۔ پاکستان آنے کے بعد تقریباً تیس برس کا عرصہ اُنھوں نے لکھنے پڑھنے میں بسر کیا۔

کے زمانۂ حکومت میں ہندوستانیوں کے اُس مختصر گروہ کے رکن رہے جسے عمدہ ملازمتیں ملیں۔ سیّد بدرعالم صاحب معمولی تعلیم یافتہ اور ملازمت کے اعتبار سے بھی معمولی حیثیت رکھتے تھے۔ اِس کے باوجود بلگرامی صاحب اُن سے برابر کی سطح پر ملتے تھے اور مل کر نہایت خوش ہوتے تھے۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ وہ دراصل اُنھیں سے ملاقات کے لیے دفترِ انجمن میں تشریف لایا کرتے تھے۔

بلگرامی صاحب سے جب میری ملاقات ہوئی تو میں اُن کے نام اور کام سے اچھی طرح واقف تھا۔ اُن کے متعدد مضامین میری نظر سے گزر چکے تھے اور اُن کا مشہورِ زمانہ مضمون ''س۔ش۔ص'' تو میں کئی مرتبہ پڑھ چکا تھا جس کی اشاعت سے صوبۂ بہار کی دنیائے ادب میں ایک ہنگامہ برپا ہوا تھا۔

رفتہ رفتہ بلگرامی صاحب نے مجھے توجہ کے لائق سمجھا اور وہ میری استدعا پر میرے کمرے میں بھی آنے لگے۔ لیکن اُنھوں نے اپنی وضع داری ترک نہیں کی۔ سیّد صاحب کے پاس بھی وہ کچھ دیر ضرور بیٹھتے۔ پھر میں نے اُنھیں اپنے کمرے میں چائے نوشی پر آمادہ کرلیا تو اُنھوں نے شرط لگادی کہ بسکٹ سیّد بدرعالم ہی لایا کریں گے۔ یہ شرط اِس لیے عائد کی کہ سیّد صاحب کی دل آزاری نہ ہو اور وہ بلگرامی صاحب کی تواضع سے جو مسرّت حاصل کرتے ہیں، اُس میں کمی نہ ہونے پائے۔

یہ میری خوش قسمتی تھی کہ بلگرامی صاحب مجھ سے اِس حد تک مانوس ہوگئے کہ وہ اکثر دیر دیر تک میرے پاس ٹھہرتے اور میں اُن کی باتوں سے حسبِ مقدور استفادہ کرتا۔ بعض نادر کتابوں کا تذکرہ آتا اور میں اُنھیں دیکھنے کی خواہش ظاہر کرتا تو اگلی مرتبہ بلگرامی صاحب وہ کتابیں ساتھ لے آتے اور اگر ضرورت ہوتی تو وہ اُنھیں میرے پاس چھوڑ بھی دیتے۔ اور جب میری اِس قسم کی فرمائشیں بڑھنے لگیں تو اُنھوں نے بخوشی اِس کی اجازت دی کہ میں اُن کے دولت خانے پر حاضر ہوکر کتابوں سے استفادہ کروں۔ شاید میں واحد شخص

تھا جسے اُن کے کتب خانے تک رسائی حاصل تھی۔ اُس زمانے میں فوٹو اسٹیٹ کا زیادہ رواج نہ تھا۔ میں نے متعدد نادر کتابوں کو اپنے لیے نقل کرانے کی اجازت لی اور بلگرامی صاحب نے مجھ پر یہ خاص احسان کیا کہ وہ ہر نقل کا اصل سے مقابلہ کرتے تاکہ امکانی حد تک کوئی غلطی نہ رہ جائے۔ کتابوں کی یہ نقلیں آج بھی میرے پاس محفوظ ہیں اور میرے بہت کام آتی ہیں۔ یہ نقلیں زیادہ تر اُن کتابوں اور کتابچوں کی ہیں جو صفیرؔ و سخنؔ اور صفیرؔ و شادؔ کے استادی شاگردی کے جھگڑوں سے متعلق ہیں۔ اِن میں سے بعض تو اتنی نادر ہیں کہ اُن کا کوئی دوسرا نسخہ شاید ہی کہیں محفوظ ہو۔

یہ سب نوادر جب میری نظر سے گزرے تو میں نے ۱۹۶۹ء میں ”غالب اور صفیر بلگرامی“ کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا جو اُسی زمانے میں رسالہ ”صحیفہ“ لاہور کے غالب نمبر جلد دوم و سوم میں دو قسطوں میں شائع ہوا۔ اِس مقالے میں اگرچہ میں نے صفیرؔ کے بارے میں خطوطِ غالب بنام صفیر کے حوالے سے بعض سخن گسترانہ باتیں بھی عرض کی تھیں اور صفیرؔ کے بعض مخالفین کی تند و تیز تحریروں کے اقتباسات بھی دیے تھے مگر بلگرامی صاحب نے برا نہ مانا بلکہ مجموعی طور پر میرے مقالے کو پسند ہی کیا۔ یہ مقالہ نظرِ ثانی اور اضافوں کے ساتھ ۱۹۸۱ء میں کتابی صورت میں بھی شائع ہوا۔ افسوس کہ اُس وقت بلگرامی صاحب ہمارے درمیان موجود نہیں تھے۔ تاہم میں نے اِس کتاب کو بھی بلگرامی صاحب کی یاد کے تازہ رکھنے کا ذریعہ بنایا اور اِس کا انتساب اُنھیں کے نام کیا۔

غالب صدی کے موقع پر انجمن ترقی اردو کی طرف سے رسالہ ”اردو“ کا غالب نمبر دو جلدوں میں مرتب کرنے کے ساتھ نصف درجن سے زاید کتابوں کی اشاعت کا پروگرام بھی بنایا گیا۔ اِن میں سے کوئی کتاب ایسی نہیں ہے کہ اُسے ”خانہ پُری“ کے ذیل میں رکھا جا سکے۔ اِس موقع پر بھی بلگرامی صاحب نے میری دست گیری کی۔ اُنھوں نے ”گلِ رعنا“ کا ایک ایسا قلمی نسخہ عنایت فرمایا جس پر خود غالب کے قلم سے حواشی تھے۔ میں نے اپنے

کرم فرما اور ممتاز غالب شناس سیّد قدرت نقوی مرحوم سے اِسے مرتّب کرایا اور نہایت اہتمام سے شائع کیا۔

''س۔ش۔ص'' میں بلگرامی صاحب نے ایک مرثیۂ شادؔ کا ذکر کرتے ہوئے اُس کے اصل مسوّدے کے بارے میں لکھا ہے: ''یہ مسودہ آج انمول ہے۔ اُس کو گلِ بکاؤلی بھی نہیں پا سکتا۔ کیوں کہ وہ شنیدہ ہے اور یہ دیدہ ہے۔ شاد عظیم آبادی کی تحریر، صفیر بلگرامی کی تحریر، مرزا دبیر لکھنوی کی تحریر، اِن تینوں تحریروں کی زیارت ہو سکتی ہے تو اِسی مسوّدے میں''۔ میں نے اِس نادر مسوّدے کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو بلگرامی صاحب نے فرمایا: کسی دن اُس غریب خانے پر تشریف لایئے اور زیارت کر لیجیے۔ میں نے حاضری دی۔ بلگرامی صاحب نے گوہرِ مقصود میرے سامنے رکھ دیا۔ میں خاصی دیر تک اُسے دیکھتا رہا۔ معاً مجھے خیال آیا کہ اِس نادر دستاویز کو عکسی صورت میں بھی شائع ہونا چاہیے۔ میں نے جب یہ خیال ظاہر کیا تو بلگرامی صاحب نے نہایت خوش دلی سے اِس کی اجازت دی کہ میں یہ مسوّدہ اپنے ساتھ لے جاؤں اور مطلوبہ اوراق کے عکس بنوالوں۔ بعد میں میں نے اِس نادر مسوّدے کے بعض خاص خاص اوراق کے عکس اپنے وضاحتی نوٹ کے ساتھ رسالہ ''اردو'' میں شائع کیے۔ پورا مرثیہ بھی پہلی بار اِسی نوٹ کے ساتھ شائع ہوا۔ اِس مضمون کی اشاعت کے بعد بھی ایک اچھا خاصا ہنگامہ برپا ہو گیا۔ شاد کے نامور شاگرد پروفیسر مسلم عظیم آبادی نے لکھا کہ یہ مرثیہ جعلی ہے۔ اِس جعل سازی کی غایت یہ ہے کہ شادؔ کو صفیرؔ کا شاگرد ثابت کیا جا سکے۔ میری نظر میں تو اِس قضیے سے متعلق تمام تحریریں تھیں، لہٰذا میں نے مسلم صاحب کے مضمون کا جواب لکھا جو ''نگار'' میں شائع ہوا۔ پروفیسر مسلم صاحب سے مجھے بھی نیازمندی کا شرف حاصل تھا۔ ایک زمانے میں وہ انجمن کے کتب خانۂ خاص میں ''کلیاتِ قائم'' (قلمی) کا مطالعہ کرنے کے لیے تشریف لایا کرتے تھے۔ میرا جوابی مضمون چھپنے کے بعد وہ تشریف لائے اور فرمایا کہ آپ نے اپنے مضمون میں جن تحریروں کے حوالے دیے ہیں وہ مجھے دکھایئے۔ میں نے پہلے

تو اُن سے شرارتاً یہ کہا کہ میدانِ جنگ میں اسلحے کی صرف نمایش نہیں ہوتی، اُسے استعمال بھی کیا جاتا ہے۔ ایک طرف تو آپ میرے شائع کردہ مرثیے کو جعلی قرار دے رہے ہیں اور دوسری طرف اُن تحریروں کو بھی دیکھنا چاہتے ہیں جن کے حوالے سے میں نے اِس مرثیے کو اصلی ثابت کیا ہے۔ اِس موضوع پر قلم اُٹھانے سے پہلے آپ کو تمام مآخذ پر ایک نظر ڈال لینی چاہیے تھی۔ وہ خاموش ہوگئے۔ مگر میں نے اُن کی بزرگی کا خیال کرتے ہوئے تمام مطلوبہ تحریریں اُن کے سامنے رکھ دیں۔ اِس کے بعد اُنھوں نے اِس سلسلے میں کچھ نہیں لکھا۔ بلگرامی صاحب کو جب اِس واقعے کا علم ہوا تو اُنھوں نے فرمایا: ''جس حقیقت کو شادؔ خود تسلیم کر چکے ہیں، اُن کے شاگرد اُس سے انکار کر کے حقِ شاگردی ادا نہیں کر سکتے''۔

غرض کہ بلگرامی صاحب کے بے شمار واقعات ہیں جنھیں بیان کیا جا سکتا ہے مگر یہاں اِس کا موقع نہیں کیوں کہ فی الحال مجھے اُس کتاب کے بارے میں کچھ عرض کرنا ہے جو اِس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

بلگرامی صاحب سے میں نے کئی مرتبہ عرض کیا کہ وہ اپنے مضامین مرتب کر دیں تاکہ اُن کی اشاعت کا انتظام کیا جا سکے۔ لیکن اُنھوں نے میری درخواست کو کبھی درخورِ اعتنا نہیں سمجھا۔ وجہ ظاہر ہے کہ وہ نام و نمود سے بے نیاز تھے۔ اُن کے انتقال کے بعد میں نے ایک مجموعہ مرتب کر کے ایک علمی ادارے کو دیا۔ پہلے تو یہ خاصے عرصے تک اشاعت کے انتظار میں طاقِ نسیاں کی زینت بنا رہا اور پھر متعلقہ عہدے دار کے انتقال کے بعد مسودہ بھی غائب ہو گیا۔ اب ایک عرصے بعد برادر عزیز و مکرم سیّد احسان احمد بلگرامی (جو صحیح معنوں میں اپنے والدِ مرحوم کے علمی وارث ہیں) کی توجہ سے یہ طے کیا گیا ہے کہ بلگرامی صاحب کی تمام تحریروں کو کتابی صورت میں شائع کیا جائے۔ زیرِ نظر مجموعۂ مضامین اِس سلسلے کی پہلی کڑی ہے۔ اِس مجموعے میں تمام مضامین شامل نہیں ہیں۔ صرف اتنے ہی ہیں جتنے طے شدہ صفحات میں سما سکے۔ اِس مجموعے کو مضامین کا انتخاب بھی نہیں کہا جا سکتا کہ بلگرامی صاحب

کی کسی ایک تحریر کو کسی دوسری تحریر پر ترجیح دینے کا کوئی جواز بھی نہیں ہے۔

بلگرامی صاحب کا مطالعہ بے حد وسیع تھا۔ اردو اور فارسی ادب کے ساتھ ساتھ، تاریخِ اسلام، تاریخِ ہند، ہندوستانی و بابلی اساطیر، اسلام اور دیگر مذاہبِ عالم اُن کے پسندیدہ موضوعات تھے۔ اُنھوں نے جو کچھ لکھا، وہ اِنھیں موضوعات سے تعلق رکھتا ہے مگر جس انداز سے لکھا، اُس کی بنا پر ہر مضمون ایک ادب پارہ بن جاتا ہے۔ بلگرامی صاحب سیدھے سادے روایتی طریقے سے واقعات و حقائق کو اُس طرح بیان نہیں کرتے جس طرح مولانا حالی، مولانا شبلی یا ہمارے دوسرے اکابر بیان کرتے ہیں کہ مسئلہ زیرِ بحث کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے بتدریج اپنے مقصد تک پہنچتے ہیں بلکہ وہ مولانا محمد حسین آزاد کی طرح استعارے اور کنائے کی مدد سے ایسی فضا تخلیق کرتے ہیں جس میں قاری کو حقائق و شواہد کی روشنی میں مطلوب و مقصود نتیجۂ بحث تک پہنچنے میں آسانی ہو جاتی ہے۔ میں اپنی اِس بات کی وضاحت کے لیے ایک مثال دوں گا۔ بلگرامی صاحب کا ایک مشہورِ زمانہ مضمون ہے ''س۔ش۔ص'' جس کا اوپر کی سطروں میں ذکر آیا ہے۔ یہ بنیادی طور پر ایک تحقیقی مضمون ہے اور ایک خاص مقصد کے پیشِ نظر لکھا گیا ہے۔ سب سے پہلے تو اِس کا عنوان ہی چونکا دینے والا ہے۔ س۔ش۔ص تو تین حروفِ تہجی ہیں جو ساتھ ساتھ آتے ہیں، اِن سے آخر کیا نکتہ پیدا کیا گیا ہے؟ مضمون کی تمہید سے یہ راز کھلتا ہے کہ اِس سے مراد تین شاعر ہیں جن کے نام صوبۂ بہار کی ادبی تاریخ میں ساتھ ساتھ آتے ہیں۔ اور وہ ہیں سلطان عظیم آبادی، شاد عظیم آبادی، اور صفیر بلگرامی۔

مضمون کا بنیادی یا مرکزی موضوع یہ ہے کہ خواجہ فخر الدین سخن اور شاد عظیم آبادی نے اپنے استاد صفیر بلگرامی کی شاگردی سے جو انحراف کیا تھا، اُسے غلط ثابت کیا جائے۔ شاد نے تو آخر عمر میں اپنی غلطی کا اقرار کرتے ہوئے کھلے دل سے تسلیم کر لیا تھا کہ وہ صفیر کے شاگرد ہیں مگر سخن آخر وقت تک اپنے موقف پر قائم رہے۔ اگر کوئی دوسرا شخص اِس موضوع پر

مقالہ لکھتا تو وہ سیدھے سادے انداز سے تمام واقعات وحقائق کو بیان کر دیتا مگر بلگرامی صاحب نے ایسا نہیں کیا۔ اُنھوں نے پہلے ایک طلسماتی فضا تعمیر کی۔ غالب کے حوالے سے آبِ سوہن کا ذکر کیا اور پھر دریائے سوہن کے کنارے آباد آرہ کا بیان ہے جہاں دریائے سخن بہتا ہے۔ پھر سلطان عظیم آبادی کا تذکرہ ہے جس کا بڑا حصہ حیدر جان سے اُن کے معاشقے کی تفصیلات پر مشتمل ہے۔ انداز ایسا ہے جیسے کوئی الف لیلوی کہانی سنائی جارہی ہو۔ مقالے کا پہلا باب اس کہانی پر ختم ہو جاتا ہے۔ اِس کے بعد شاد وصفیر سے متعلق ابواب ہیں اور ان میں بھی انداز قصہ گوئی کا سا ہے۔ اِن ابواب میں متعدد دستاویزی حوالے بھی ہیں، خطوط بھی ہیں اور منظومات بھی۔ اِس طرح یہ مضمون یا مقالہ ایک دلچسپ داستان کی صورت میں اپنا جادو جگاتا چلا جاتا ہے۔ اور جس مقصد کے لیے یہ مقالہ لکھا گیا ہے خود بخود ذہن نشین ہوتا چلا جاتا ہے۔

''س۔ش۔ص'' کی طرح بلگرامی صاحب کے دوسرے مضامین میں بھی ایک مخصوص طلسماتی فضا ملتی ہے جس کی تعمیر میں استعارہ، رمز اور کنایہ بنیادی حصہ لیتے ہیں اور یوں بلگرامی صاحب ایک عالم اور مورخ سے زیادہ ایک انشا پرداز کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ اِس کی ایک مثال ملاحظہ ہو۔ مضمون ''زلف ورخ'' میں دارا شکوہ کے بیان میں وہ لکھتے ہیں:

> ''عالم گیر تخت پر بیٹھا تو شریعت نے طریقت اور کفر دونوں سے جنگ شروع کردی۔ سہ شنبہ ۲۰/ذی الحجہ ۱۰۶۹ ہجری کو دارا شکوہ گرفتار ہو کر دلّی آیا اور قلعے میں قید کیا گیا۔ علمائے شریعت نے وہی فتویٰ دیا جو عالم گیر چاہتا تھا۔ یعنی دارا شکوہ کافر ہے اور کافر کشتنی! اتنے میں محرم کا چاند ہوا۔ ۱۰۷۰ ہجری۔ عین چاند رات کو دارا شکوہ کی کوٹھری میں جلاد پہنچا۔ جلاد نے اپنا کام کیا۔ دارا شکوہ نے اپنا کام کیا۔ دارا شکوہ عشق کا مارا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں معشوق۔ اُس کے دل

میں معشوق۔ معشوق اپنے گھر میں کسی اور کو آنے نہیں دیتا۔ چنانچہ داراشکوہ نے جلاد کو نہیں دیکھا۔ جلاد کی تلوار کو نہیں دیکھا۔ جلاد تلوار لیے سامنے کھڑا تھا اور داراشکوہ؟ مجنوں لیلیٰ سے باتیں کر رہا ہے.... وہ دن بھی آئے گا جب آسمان پھٹ جائیں گے۔ وہ وقت بھی آئے گا جب تارے بے نور ہو جائیں گے۔ یاد رہے کہ اُس دن اور اُس وقت بھری محفل میں ہم تیرا دامن پکڑیں گے اور پوچھیں گے کہ اے لیلیٰ! تیرے مجنوں کی گردن آخر کس گناہ پر ماری گئی''۔

کیا داراشکوہ کی شہادت/قتل کا بیان اِس سے بہتر لفظوں میں ممکن ہے؟ لیکن یہ ایک مورخ کا نہیں ایک انشا پرداز کا بیان ہے۔ اور اِسی انشا پردازی ہی نے تاریخ کو ادب بنا دیا ہے!

غرض کہ بلگرامی صاحب کے مضامین اردو میں اپنی نوعیت کے منفرد مضامین ہیں۔ ایسی نثر اُن سے پہلے اور اُن کے بعد بھی کسی نے نہیں لکھی۔ یہ صحیح ہے کہ اُنھیں وہ شہرت نہیں ملی جو ملنی چاہیے تھی، لیکن ادب کو شہرت کی کسوٹی پر نہیں پرکھا جاسکتا۔ تاہم یہ بھی نہیں ہے کہ بلگرامی صاحب کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہو۔ اُن کے قدر دانوں میں سیّد سلیمان ندوی، مولانا عبدالماجد دریابادی اور نیاز فتح پوری جیسے اکابر شامل تھے۔ نیاز فتحپوری نے نہ صرف اُن کے بعض مضامین ''نگار'' میں درج کیے بلکہ ایک مضمون ''ملکِ خطا کے شہزادے'' کو نگار بک ایجنسی کی طرف سے کتابی صورت میں اپنے استدراک کے ساتھ شائع کیا۔ اِسی کتابچے کو ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے بھی ۱۹۹۳ء میں ''نگار'' میں اپنے اِس نوٹ کے ساتھ شائع کیا:

''اردو کے ادیب شہیر جناب وصی احمد بلگرامی (مرحوم) کی بہت مشہور مختصر سی کتاب ''ملک خطا کے شہزادے'' نذرِ قارئین کی جارہی ہے۔ اِس کا موضوع بیک وقت اسلامی تاریخ، سیاسیات، ثقافتی تحریکات، دینیات و اسلامیات اور توہمات و تعصبات، سب کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے لیکن موضوع کی ہمہ گیری سے بڑھ کر اِس کتاب کا وہ اسلوب ہے جو اِسے ادب اور تخلیقی ادب کا

شہکار بنا دیتا ہے اور یہی اسلوب اِس کے مطالعے پر ہمیں مجبور کرتا ہے''۔

عابد رضا بیدار نے اردو نثر کا انتخاب ''اردو نثر کا حسن'' کے نام سے دو جلدوں میں ۷۰-۱۹۶۸ء میں شائع کیا تھا جو بیسویں صدی کے صاحبِ طرز نثر نگاروں کی تحریروں پر مشتمل ہے۔ اِس میں بلگرامی صاحب کا مضمون ''دیر و حرم کا افسانہ'' شامل ہے۔ بیدارؔ نے دیباچے میں بلگرامی صاحب کو اردو کے طرح دار ادیبوں کے زمرے میں شامل کیا ہے---

اِن گزارشات کا مقصد یہ ہے کہ بلگرامی صاحب کے جاننے اور پہچاننے والے آج بھی ہمارے درمیان موجود ہیں، یہ دوسری بات ہے کہ اُن کی تعداد بہت کم ہے۔

کراچی، یکم ستمبر ۲۰۰۳ء　　　　مشفق خواجہ

زُلف و رُخ

باب اوّل

عہدِ اکبری

ابو الفضل دکن میں تھا کہ شاہزادہ سلیم نے بغاوت کی۔ اکبر نے ابوالفضل کو دکن سے آگرے بلایا۔ شاہزادہ سلیم نے خیال کیا کہ یہ شاطر آگرے پہنچا اور ہماری بازی مات ہوئی، اِس لیے شاہزادے کے اشارے سے راجا بیر سنگھ دیو بندیلہ نے ریاست گوالیار ضلع نرور موضع انتری میں ابوالفضل کا کام تمام کردیا۔ اور سر کاٹ کر شاہزادے کے پاس الہ آباد بھیج دیا۔ (جمعہ ۴/ ربیع الاول ۱۰۱۱ ہجری)

ابوالفضل اپنے زمانے میں بہت بدنام تھا۔ اہل اسلام اس کو ننگِ اسلام سمجھتے تھے، چنانچہ میرزا عزیز اعظم خاں کوکہ نے تاریخِ رحلت کہی:

یَفعَلُ اللّٰہ مَایَشَاءَ یَحکُمُ اللّٰہ مایرید

تیغ اعجازِ نبی اللہ سر باغی بُرید

اللہ جو چاہتا ہے وہی ہوتا ہے۔ اور رسولؐ اللہ کا اعجاز تو دیکھو کہ تیغ نے اِدھر باغی کا سر کاٹا اور اُدھر تاریخِ قتل ہاتھ آگئی۔ یعنی باغی (۱۰۱۱)۔ اِس کا جواب عالمِ غیب سے خود ابوالفضل نے اور عالمِ شہود سے شاہ ابوالمعالی لاہوری نے دیا۔ میر محمد عسکری بلگرامی اپنی تالیف ''صحائف شرائف'' میں لکھتے ہیں:

ا۔ ''گویند شیخ درخواب آمدہ گفت کہ تاریخ فوتِ من بندۂ ابوالفضل است۔ چرا در کارخانۂ حق حیراں ماندہ۔ فضلِ او وسیع است۔

کسے نا اُمید نہ شود''۔

ترجمہ: ایک شخص نے (غالباً میرزا عزیز کوکہ نے) ابوالفضل کو خواب میں دیکھا کہ کہہ رہا ہے۔ بھائی! ہمارے مرنے کی تاریخ بندۂ ابوالفضل (۱۰۱۱) ہے، اِس پر تم کو اتنی حیرت کیوں ہے؟ یہ اللہ کے کارخانے ہیں! اُس کے فضل کی انتہا نہیں۔ کوئی اُمیدوار نا اُمید نہیں پھرتا۔

۲۔ ''از شاہ ابوالمعالی قادری کہ ازخدا پرستانِ لاہور است آوردہ اند کہ گفت۔ من ازکار ہاے ابوالفضل انکار داشتم۔ شبے در خواب دیدم کہ در مجلس شفیع المذنبین علیہ السلام ابوالفضل حاضر گردید، حضرتؐ جبۂ مبارک را بروے شیخ انداختہ در مجلس نشاند و فرمود کہ ایں مرد در حیاتِ خود چند روز مرتکب افعالِ بدگشتہ۔ اما ایں مناجاتِ او کہ ابتدایش این است: ''الٰہی نیکاں را بوسیلۂ نیکی سرفرازی بخشی و بداں رابہ مقتضاے کرمِ خود دلنوازی کنی'' سبب نجات او شدہ۔ آمرزشِ حضرتِ آمرزگار براے نجات گنہ گارانِ خود بہانہ و وسیلہ می جوید۔ تقدس و تعالیٰ شانہٗ''۔

ترجمہ: شاہ ابوالمعالی قادری لاہوری کا بیان ہے کہ ابوالفضل سے ہم بہت بیزار تھے، لیکن ایک شب خواب میں دیکھا کہ حضرت شفیعؐ الامم کے دربار میں ابوالفضل حاضر ہوا۔ آنحضرتؐ نے اپنا جبۂ مبارک اُس کو عطا فرمایا اور بیٹھنے کی اجازت دی۔ پھر فرمایا کہ دنیا میں یہ شخص کچھ عرصے تک گناہوں میں گرفتار رہا لیکن حضرتِ آمرزگار کی رحمت تو بہانہ ڈھونڈتی ہے۔ چنانچہ اُس نے ایک مناجات لکھی تو رحمتِ ایزدی کو بہانہ مل گیا اور اِس طرح اُس کی نجات ہوگئی۔ وہ مناجات یوں شروع ہوتی ہے: خدایا! تیری رحمت سے کوئی محروم نہیں۔ نیک بندوں کو اُن کی نیکی بچالیتی ہے۔ اور گناہ گاروں کو تیری رحمت!

ابوالفضل کی رسوائی قصہ طلب ہے۔ اُس زمانے میں شیخ عبدالنبی اور

مخدوم الملک نے جنت اور دوزخ کی کنجیاں اپنے قبضے میں کر لی تھیں۔ مذہبی امور میں اکبر بادشاہ تک اِن دونوں کے سامنے دم نہیں مار سکتا تھا۔ ملک میں کہرام تھا۔ قتل و غارت کا بازار گرم تھا۔ بات بات پر کفر کا فتویٰ اور کافر بمعنی گردن زدنی! مچھوا ہر روز جال ڈالتا تھا۔ بیوقوف مچھلیاں ہر روز اُس کے جال میں تڑپا کرتی تھیں۔ مچھوے نے حسب معمول ایک دن جال ڈالا۔ قضا کار دو مچھلیوں نے اُس دن حرفت یہ کی کہ جال ہی لے بھاگیں۔ مچھوا منھ دیکھتا رہ گیا۔ یہ مچھلیاں آفتِ روزگار تھیں... فیضی اور ابوالفضل!

فیضی اور ابوالفضل نے اکبر کے دربار میں پہنچتے ہی مخدوم الملک اور عبدالنبی کا ٹاٹ الٹ دیا۔ ماہ رجب ۹۸۷ ہجری میں ایک محضر نامہ تیار کیا۔ اُس کا مضمون یہ تھا کہ بادشاہ ظل اللہ ہے۔ اولی الامر ہے۔ امامِ عادل ہے۔ مجتہد العصر ہے۔ وہ کسی کا پابند نہیں۔ اُس کا حکم سب پر بالا۔ اِس محضر نامے پر عبدالنبی کو دستخط کرنا پڑا۔ اور مخدوم الملک کو بھی! اِس کے بعد ظل اللہ نے فتح پوری مسجد میں جمعے کی نماز پڑھائی۔ خطبہ فیضی نے لکھا اور اس طرح شروع کیا:

بنام آں کہ ما را سروری داد
دلے دانا و بازوے قوی داد
بود وصفش زحدِ فہم برتر
تعالیٰ شانہٗ اللہ اکبر!

اِس کے چند سال بعد اکبر نے ایک نئے مذہب کی بنیاد ڈالی اور اُس کا نام دینِ الٰہی رکھا۔ اِس دینِ الٰہی پر ایمان لانے والا اقرار کرتا کہ:

''من کہ فلاں ابن فلاں باشم بہ طوع و رغبت و شوقِ قلبی از دین اسلام مجازی و تقلیدی کہ از پدران دیدہ و شنیدہ بودم ابرا و تبرا نمودم۔ در دینِ الٰہی اکبر شاہی درآمدم۔ و مراتب چہارگانۂ اخلاص کہ ترک مال و جان و ناموس و دین باشد قبول نمودم''۔

اس دینِ الٰہی کی اشاعت کے لیے اکبر نے کشمیر میں ایک بت خانہ بنوایا۔ غالباً ۹۹۸ ہجری میں اس بت خانے کا کتابہ ابوالفضل نے لکھا اور کون لکھ سکتا تھا؟ ابوالفضل کا قلم جادو کا قلم۔ ابوالفضل کا کلیجا باگھ کا کلیجا!

کتابۂ بت خانۂ کشمیر کہ ابوالفضل نوشتہ:

الٰہی بہ ہرخانہ کہ می نگرم جویاے تو اند۔ و بہ ہر زبان کہ می شنوم گویاے تو:

کفر و اسلام در رہت پویاں
وحدہٗ لاشریک لہٗ گویاں

اگر مسجد است بیادِ تو نعرۂ قدوس می زند۔ واگر کلیسا است بشوق تو ناقوس می جنباند:

گہ معتکفِ دیرم و گہ ساکنِ مسجد
یعنی کہ ترا می طلبم خانہ بخانہ!

اگر خاصان ترا بکفر و اسلام کارے نیست ایں ہر دو را در پردۂ اسرار تو بارے نہ:

کفر کافر را و دیں دیندار را
ذرّۂ دردے دلِ عطّار را

ایں خانہ کہ بہ نیت ائتلاف قلوبِ موحدانِ ہندوستان خصوصاً معبود پرستانِ عرصۂ کشمیر تعمیر یافتہ:

بفرمانِ خدیوِ ہفت کشور
چراغِ آفرینش شاہ اکبر
نظامِ اعتدالِ ہفت معدن
کمالِ امتزاجِ چار عنصر

ہر خانہ خرابے کہ نظرِ صدق نینداختہ ایں خانہ را خراب سازد، باید کہ نخست

معبدِ خود را بر اندازد۔ چہ اگر نظر بر دل است با ہمہ ساختنی است۔ واگر چشم بر آب و گِل است ہمہ بر انداختنی:

خداوندا چو دادِ کار دادی

مدارِ کار بر نیت نہادی

توئی بر بارگاہِ نیت آگاہ

بہ پیشِ شاہ داری نیتِ شاہ

ترجمہ : اے ہرجائی! تو کہاں ہے؟ ہر دل میں تیرا ہی شور ہے۔ ہر زبان پر تیرا ہی فسانہ! وہ کفر ہو یا اسلام۔ تیری راہ میں دونوں سرگرداں! تو ایک ہے۔ اِس ایک کا کوئی ساجھی نہیں۔ یہی کفر کہتا ہے، یہی اسلام!

یا قدوس کا نعرہ بیت اللہ میں تیرے لیے ہے تو بیت الصنم میں بھی تیرا ہی سنکھ بج رہا ہے! عاشق نے کبھی یہ گھر جھانک لیا۔ کبھی وہ گھر جھانک لیا۔ شاید تو یہاں ہو۔ شاید تو وہاں ہو۔ پروانہ شمع کا دیوانہ! دیوانے کو مکہ اور کاشی کا ہوش کہاں؟ پروانے کو معانی کا پروانہ ہے۔ شمع کی لو میں وہ جائے گا جہاں چاہے گا:

پروانہ چراغِ حرم و دیر نداند!

اے جانِ عالم! جو تیرے ہو چکے ان کو اوروں سے کیا غرض؟ کفر ہو یا اسلام۔ دونوں غیر، دونوں اجنبی، دونوں نا محرم۔ کفر و اسلام کے پاس وہ پاؤں کہاں جو تیرے بھیدوں تک پہنچ سکے۔ اور وہ ہاتھ کہاں جو تیرے چھوڑے ہوئے پردوں کو اُٹھا سکے! اِس لیے کفر کافر کو مبارک دین دیندار کو مبارک۔ عطآر کا دل تجھ سے درد مانگتا ہے۔ زیادہ نہیں۔ صرف ایک چٹکی!

ہر طرف جنگ ہی جنگ ہے۔ چار عنصر میں جنگ۔ ہفت جوہر میں جنگ۔ کفر و اسلام میں جنگ۔

اِن عاشقانِ جنگ کو ہم آہنگ و ہم سنگ و ہم رنگ وہی کر سکتا ہے جو روزِ آفرینش سے آفتاب و ماہتاب ہو۔ وہ چراغِ آفرینش جلال الدین محمد اکبر ہے۔ چاند

سورج کی طرح اکبر بھی صاحبِ ہفت کشور ہے۔ خلق اللہ کے لیے ایک چراغ ہے۔ یہ تینوں چراغ این و آں میں اور کفر و اسلام میں فرق کرنا نہیں جانتے۔ اِس لیے فرمان اکبری یوں ہوا کہ ایک گھر ایسا تعمیر ہو جہاں ہندوستان کے واحد پرست اور خصوصاً کشمیر کے معبود پرست ایک نقطے پر آسکیں۔ یہ عبادت خانہ اِسی نیت سے بنایا گیا ہے۔

اب جو حق پوش و بد اندیش و خانہ خراب اِس گھر کو ڈھانا چاہے، اُس کو چاہیے کہ پہلے خود اپنا گھر ڈھا دے، کیوں کہ یہ سارا جھگڑا ہے دل اور آب و ِگل کا۔ دل چیر کے دیکھا جائے تو ہر دل بیت اللہ ہے۔ ہر دل منزلِ جاناں ہے۔ اور صرف آب و ِگل پر نظر ہو تو خانۂ کعبہ تک آب و ِگل ہے!

اے وہ جو دل دیکھتا ہے آب و ِگل نہیں دیکھتا! تو ہی جانتا ہے کہ بادشاہ کی نیت کیا ہے! اے وہ جو روح دیکھتا ہے قالب نہیں دیکھتا! ہر کام کا اجر تو نے نیت ہی پر رکھا ہے!

ابو الفضل نے اکبر کو خدیو ہفت کشور یعنی بادشاہ ہفت اقلیم کہا تو مطلب یہ کہ ہندوستان بذات خود ہفت اقلیم ہے۔ جس طرح آنکھ کی سیاہی میں آدمی کی چھوٹی سی تصویر نظر آتی ہے جس کا نام عربی میں انسان العین، فارسی میں مردمک اور اردو میں پتلی ہوا، اُسی طرح چشم بینا ہفت اقلیم کی تصویر اُس سیاہی میں دیکھتی ہے جس کا نام ہندوستان ہے۔ ہندوستان گویا مردمکِ چشم عالم ہے۔ جب ہفت اقلیم کی تصویر اِس پتلی یعنی ہندوستان میں نظر آتی ہے تو ثابت ہوا کہ ہندوستان کا بادشاہ ہفت اقلیم کا بادشاہ ہے۔

ابوالفضل کی طرح قطرے میں دریا اور جزو میں کل کا تماشا دیکھنے والا غالبؔ بھی ہے۔ غالبؔ کلکتے کو ایک شہر نہیں بلکہ پورا ملک قرار دیتا ہے۔ اور چوں کہ اہلِ یونان نے آباد دنیا کو سات ہی حصوں میں تقسیم کیا تھا، اِس لیے غالبؔ شہرِ کلکتہ کو ہفت اقلیم سے الگ کر کے اقلیم ہشتم قرار دیتا ہے:

حالِ کلکتہ باز جستم، گفت   باید اقلیم ہشتمش گفتن

خدیوِ ہفت کشور کی بحث لطف سے خالی نہیں۔ جہانگیر، شاہجہاں، عالم گیر اور

شاہ عالم اِس بحث سے خارج نہیں۔

(ا) امیر تیمور کی اولاد نے امیرزادہ ہونے کی وجہ سے اپنا لقب میرزا قرار دیا۔ مثلاً میران شاہ مرزا، محمد مرزا، ابو سعید مرزا، عمر شیخ مرزا اور بابر مرزا۔

بابر مرزا نے ۹۱۳ ہجری میں قندھار فتح کیا تو اپنا لقب ''مرزا'' سے ''بادشاہ'' کیا۔ اِسی سال کابل میں ہمایوں پیدا ہوا۔ اِس کے بیس برس بعد ۹۳۲ ہجری میں بابر بادشاہ نے ہندوستان فتح کیا تو وہ ''بادشاہ غازی'' ہوا۔

پھر ۹۷۷ ہجری میں خانقاہ چشتیہ فتح پور سیکری میں وارث تخت و تاجِ اکبری پیدا ہوا تو شیخ الاسلام حضرت شیخ سلیم چشتی نے اُس کا نام اپنے نام پر سلطان سلیم رکھا۔ اِس نام سے لوگوں کو بہت دھوکا ہوتا تھا کیوں کہ اُسی زمانے میں ایک دوسرا سلطان سلیم ملک روم کا بادشاہ تھا۔ سلیم بادشاہِ روم ۹۸۲ ہجری میں مرحوم ہوگیا پھر بھی شاہزادہ سلیم نے ۹۹۴ ہجری میں تخت نشینی کے وقت اپنا نام نورالدین اور لقب جہانگیر کردیا۔ اکبر خدیوِ ہفت کشور تھا تو اس کا بیٹا جہانگیر کیوں نہ ہوتا؟

سلیم جہانگیر ہوگیا۔ لیکن جہان بے نور تھا۔ مہرالنسا سورۂ نور کی صورت آئی۔ تب اندھیرے سے اجالا ہوا، عالم میں نور پھیلا، ذرہ ذرہ چمک اٹھا، آفتاب آمد دلیلِ آفتاب۔ اِس لیے مہرالنسا نورجہاں ہوئی۔ بات یہ ہے کہ میزانِ الفت ہو یا میزانِ ابجد دونوں میں نورجہاں (۳۱۵) آبِ دیدۂ جہانگیر (۳۱۵) تھی!

جہاں گیر کا نام نور الدین تھا۔ مجنوں نے ''نور الدین'' سے نور چھین کر اور ''جہاں گیر'' سے جہان چھین کر اپنی مہرالنسا کو سونپ دیا۔ اِس لیے مہرالنسا نورجہاں ہوئی۔ خود مجنوں کا بیان ہے کہ من سلطنت را بہ نور جہاں بیگم ارزانی داشتم۔ چنانچہ شاہی فرمان پر نور جہاں کی مہر اور سکے پر نور جہاں کا نام ہوتا تھا۔

بیتِ مہر:

نور جہاں گشت بحکمِ الٰہ
ہمدم و ہم رازِ جہانگیر شاہ

بیتِ سکہ:

بحکمِ شاہِ جہانگیر یافت صد زیور
بنامِ نور جہاں بادشاہ بیگم زر

(۲) شاہزادہ خرم اپنی مٹھی میں ملک دکن لے کر پہنچا تو اِس فتح و نصرت پر جہانگیر باغ باغ ہوگیا۔ خوشی میں جھروکے سے نیچے اتر آیا۔ بیٹے کو گلے سے لگایا۔ اپنے ہاتھوں سے لعل و زمرد نچھاور کیا۔ اور جلنے والوں کو اور جلانے کے لیے شاہ جہاں خطاب دیا۔ مرزا خرم اِس طرح شاہ جہاں ہوا۔

تقریباً دس برس بعد ۱۰۳۷ ہجری میں شاہجہاں تخت پر بیٹھا تو بادشاہِ روم سلطان مراد نے مبارک باد کے خط میں ایک چٹکی لی۔

''خطابِ شاہ جہانی باوجود بادشاہ روم، ایران و توران معنی ندارد۔ بچہ وجہ خود را شاہ جہاں قرار دادہ اند؟''

یعنی آپ کچھ خدائی فوجدار نہیں۔ آپ بادشاہ ہیں تو صرف ہندوستان کے نہ کہ سارے جہان کے! پھر آپ کو شاہ جہاں کس نے کہہ دیا؟

اس فقرے پر شاہ جہانی دربار شہرِ خموشاں ہوگیا۔ شاہ جہاں نے وزیرِ سلطنت یمین الدولہ آصف خاں کی طرف دیکھا۔ وہ بھی خموش! تب ملک الشعرا ابو طالب کلیم کاشانی نے علی ابن ابی طالب کے صدقے میں یوں مشکل کشائی کی:

ہند و جہاں زروے عدد ہر دو چوں یکی ست
شہ را خطاب شاہ جہانی مبرہن ست!

یعنی جو عدد ہند کے وہی جہان کے۔ دونوں ۵۹۔ اِس لیے ثابت ہوا کہ شاہ ہند، شاہِ جہاں ہے!

یہ سننا تھا کہ مردے جی اٹھے۔ شہرِ خموشاں چلاّ اٹھا کہ ہند نے روم کو شکست دی۔ لاریب! اِس کلیم کو کون پا سکتا ہے؟ یہ کلیم وہ ہے جس کے ہاتھ میں پہنچ کر: قلم گوید کہ من شاہ جہانم! اب شاہ جہاں کا کیا پوچھنا! اُسی وقت اُس نے کلیم کو سونے

کے برابر تولا۔ اور پھر بادشاہِ روم کو جواب دیا:

ہند و جہاں زروے عدد چوں برابر ست

بر ما خطابِ شاہ جہاں زاں مقررست!

اِسی واقعے کو یاد کر کے غالب دیباچۂ ''مہر نیمروز'' میں حضرت سراج الدین محمد بہادر شاہ سے خطاب کرتا ہے اور خون کے آنسو بہاتا ہے:

''قاآن شیوہ خاقانا و خواقین خدا یگانا!

اگر چناں کہ بدوران تو ام بروزگار فرزانہ جمشید بودے، جمشید روزگار را آفریں گفتے! و اگر بد انساں کہ ثنا خوانِ شہر یارم، فرخ فریدوں را ستودے، فریدوں چرخ و ستارہ راگرد سر گشتے! دراں انجمن کے زردشت آتش افروخت و ژند آورد، اگر من بدیں دم آزر فشاں جا داشتے، آزر ازبیم من زبانہ نہ زدے! از دل فریبیِ بیانِ من کس بشنیدنِ ژند نپرداختے...!

سرت گردم! تو نیز بدیں گرمیِ ہنگامہ نیاز کہ ہمچو غالب بندۂ آتشیں نوائے داری، اگر بہ اندازۂ ہنر دادِ التفات می دہی، جائے مردمکِ دیدہ بمن باز گزار و درِ دل بہ روے من بکشائے!

گویند در عہدِ جہان بانیِ حضرت صاحب قرانِ ثانی بفرمانِ آں خسروِ دریا دل کلیم را صدرہ بسیم و زر و لعل و گہر سختہ اند۔ من آں خواہم دیدہ وراں را دستوری دہی تا از کشش کوشش نہ رنجند۔ و یک بار گفتارِ مرا با کلامِ کلیم بسنجند!''

ترجمہ: غالبؔ اگر جمشید کے زمانے میں ہوتا تو جمشید اپنی قسمت پر ناز کرتا۔ اور غالب اگر فریدوں کی مدح کرتا تو فریدوں کا دماغ عرش پر ہوتا۔

کلامِ غالب کی آگ؟ اللہ ری آگ! زردشت کی امت یہ آگ دیکھ پاتی تو ژند کو آگ میں جھونک دیتی۔ اور اپنے پیغمبر سے رُوگرداں ہو کر غالبؔ کی امت میں

داخل ہو جاتی! باقی رہا آزر، تو کوہِ آتش فشاں کے سامنے دیا سلائی کا نام؟

بہادر شاہ! تجھ کو چاہیے تھا کہ غالبؔ کو اپنی آنکھوں میں جگہ دیتا:

آج مجھ سا نہیں زمانے میں
شاعرِ نغز گوے خوش گفتار
رزم کی داستاں اگر سنیے
ہے زباں میری تیغ جوہردار
بزم کا التزام گر کیجے
ہے قلم میرا ابرِ گوہر بار
ظلم ہے گر نہ دو سخن کی داد
قہر ہے گر کرو نہ مجھ کو پیار

ایک کلیم کاشانی تھا جس کو صاحب قرانِ ثانی نے سونے کے برابر تولا۔ اور ایک غالبؔ ہے جس کا کوئی گاہک نہیں۔ کوئی ایسا بھی نہیں جو ترازو کے ایک پلّے میں غالبؔ کا کلام اور دوسرے پلّے میں کلیم کا کلام رکھ کر دیکھتا کہ پلّہ کس کا بھاری ہے!

(۳) شاہزادہ اورنگ زیب ۱۰۲۸ہجری میں پیدا ہوا تو کلیم کاشانی نے برقِ طور کے ایسی چمکتی ہوئی تاریخ کہی۔ یعنی: آفتاب عالم تاب (۱۰۲۸)۔

چالیس برس بعد ۱۰۶۸ہجری میں دارا شکوہ اور اورنگ زیب میں جنگ ہوئی۔ شاہ جہاں آگرے میں تھا کہ اورنگ زیب میدان جیت کر آگرے پہنچا۔ اور شہر کے باہر ہی باغ نور میں ٹھہر گیا۔ شہر کے باہر ٹھہرنے کی وجہ یہ تھی کہ شاہ جہاں دارا شکوہ کو اپنا ولی عہد کر چکا تھا اور اب تک اُسی کا طرف دار تھا۔ اِس لیے داراشکوہ کی شکست دراصل شاہ جہاں کی شکست تھی۔

باغ نور سے اورنگ زیب نے ایک عرض داشت شاہ جہاں کو بھیجی کہ خدا شاہد ہے جو کچھ ہوا مجبوری میں ہوا۔ اِس عرض داشت کو پا کر شاہ جہاں نے اورنگ زیب کو اپنے پاس بلا بھیجا۔ اور جواب کے ساتھ ایک تلوار بھی انعام کی۔ اِس تلوار کا آنا غضب

ہوگیا۔ اورنگ زیب نے اِس انعام میں انتقام کی جھلک دیکھی۔ سمجھا کہ ہم پر قابو پانے کے لیے یہ طلبی اور انعام و اکرام ہے۔ اِسی بدگمانی میں اورنگ زیب نے قلعے پر اپنا پہرا بٹھلا دیا۔

شاہ جہاں نے جو تلوار بھیجی تھی، اُس کا نام عالم گیر تھا۔ وہ تلوار بھی عجب فتنۂ روزگار نکلی۔ بھیجنے والے کو اُس نے قید کرا دیا اور پانے والے کو عالم گیر کر دیا۔

عالم گیر تلوار اورنگ زیب کو عالم گیر نہ بناتی تو بھی ''آفتابِ عالم تاب'' سے عالم لے کر اور اپنے دادا ''جہاں گیر'' سے گیر لے کر اورنگ زیب عالم گیر ہو ہی جاتا!

عالم گیر کی رسم تاج پوشی دو مرتبہ ہوئی۔ اول بعجلت ۱۰۶۸ ہجری میں اور پھر باطمینان ۱۰۶۹ ہجری میں۔ پہلے جلوس کی ایک خداداد تاریخ، تاریخِ ولادت میں صرف م بڑھا کر ہاتھ آگئی۔ یعنی: آفتاب عالم تابم (۱۰۶۸) دوسرے جلوس کی تاریخ ہوئی: بادشاہِ ملک ہفت اقلیم (۱۰۶۹) ۔یہ دونوں تاریخیں اصل میں ایک ہیں۔ آفتاب کی عالم گیری مسلّم ہے تو آفتاب عالم تاب واقعی بادشاہ ملکِ ہفت اقلیم ہوا۔

اِس کے آٹھ برس بعد ۱۰۷۶ ہجری میں شب دو شنبہ ۲۶ر رجب کو شاہ جہاں نے رحلت کی۔ تاریخِ رحلت رضی اللہ (۱۰۷۶)۔ اِس کے چند ماہ بعد ۱۱ر ذیقعدہ کو پنجاہ سالہ جشن عالم گیری تھا۔ سالگرہ کے دن دشمن نے دشمن کا منھ دیکھا۔ یعنی عالم گیر کے دربار میں شیوا جی☆ مرہٹہ سلام کے لیے حاضر ہوا۔ سلام کے بعد ہی شیوا جی نے کچھ ایسی باتیں کیں کہ آٹھ دن کے بعد عالم گیر نے مجبوراً نظر بندی کا حکم دے دیا۔ اور شیوا جی کے سر پر کوتوالِ شہر فولاد خاں کو مسلط کر دیا۔ لیکن اِس نظر بندی کے ۹۹ دن بعد سلطنت مغلیہ ننانوے کے پھیر میں پڑ گئی۔ وہ اِس طرح کہ ۲۷ر صفر ۱۰۷۷ ہجری کو شیوا جی فولاد خاں کی آنکھوں میں دھول ڈال کر قید خانے سے بھاگ نکلا۔ اور پھر جوگیوں کا بھیس بدل کر آگرے سے متھرا اور متھرا سے الہ آباد بنارس ہوتا ہوا گیا پہنچا۔ گیا میں دشنو پدمندر کا درشن کر کے شیوا جی پوری جگن ناتھ ہوتا ہوا دکن پہنچا۔ اور وہاں پہنچ کر فتنۂ عظیم برپا کیا۔

شیواجی آگرہ سے بھاگا تو حافظ ہدایت اللہ نے تاریخ کہی اِنَّ شَانِئَکَ ھُوَالْاَبْتَر (۱۰۷۷)۔ اِس کی خبر آگ کی طرح ہندوستان سے ایران پہنچی تو شاہِ ایران سلیمان صفوی نے عالم گیر کو یہ خط بھیجا:

''... دریں ایام از تقریرِ صادر و وارد بظہور پیوستہ کہ در ممالک ہندوستان اکثر جا مفسدان سرکش آں سلیمان وش را ناتوان و بے سر انجام پنداشتہ غبارِ آشوب بلند ساختہ اند... سرگردہِ آنہا سیوا نام کافرے ست کہ ہیچ کس شناسائے نام و نشانِ او نبودہ۔ الحال بے سرانجامیِ سامی باعثِ سر انجام آن گمنام شدہ، خروج نمودہ۔ اکثر قلعہ جاتِ کوہ شکوہ بتصرف خود آوردہ۔ سپاہِ آں سلطنت پناہ را بزیرِ تیغ بے دریغ کشیدہ۔بسیارے را اسیر نمودہ۔ ملک را تاراج کردہ۔ دعویِ ہمسریِ آں والا دودمان دارد۔ وآں خلافت مآب پدر گیری را عالم گیری نام نہادہ۔ از کشتن برادران کہ وارث ملک بودند خاطر جمع کردہ سر رشتہ قدر دانی و جہاں بانی و داد و دہش را از دست دادہ۔ بصحبتِ جماعتے کہ افسوں خوانی و وسوسۂ شیطانی را شیوۂ حق دانی می پندارند، مشغولِ اند......''۔

اِسی بہانے شاہِ ایران نے باز پرس کی کہ ایک پدر گیر و برادر کُش کیوں کر عالم گیر ہوسکتا ہے جب گم نام و بے نشان شیواجی مرہٹہ تک اُس کے قابو میں نہیں آتا!

عالم گیر نے اِس کا جواب اسد خاں کے ہاتھ بھیجا تھا۔ اور حمد باری تعالیٰ کے سلسلے میں اپنی عالم گیری اِس طرح جتائی تھی:

''سبحان اللہ صاحب قدرتے کہ جمیع ذراتِ ہستی و موجوداتِ بلند و پستی پرتوِ آفتابِ عالم تاب اوست...''

چوں کہ آفتابِ عالم تاب خود اورنگ زیب کی تاریخ ولادت تھی اور آفتاب کی ہمہ گیری سے ایران بھی انکار نہیں کرسکتا تھا، اِس لیے حمد ہی میں عالم گیر نے اپنا کام

نکال لیا تھا۔

۱۱۱۸ ہجری میں آفتاب عالم تاب روپوش ہوا یعنی عالم گیر نے رحلت کی تو تاریخ رحلت ہوئی: آفتاب عالم تابِ من (۱۱۱۸)۔

(۴) عالم گیر شاہزادہ محمد معظم کو بہادر شاہ کہتا تھا۔ بہادرشاہ ۱۱۱۹ ہجری میں تخت نشیں ہوا تو تاریخ جلوس عالم گیری میں (م + الف + ی) بڑھا کر اُس نے خود اپنے جلوس کی تاریخ کہی: ما آفتابِ عالم تابیم (۱۱۱۹) اور پھر خطاب ''بہادر شاہ'' سے ''شاہ'' لے کر اور اپنے باپ ''عالم گیر'' سے ''عالم'' لے کر وہ شاہ عالم ہوگیا۔

اِسی شاہ عالم کا لڑکا عظیم الشان تھا جس نے رحلتِ عالم گیر کے تین سال پہلے ۱۱۱۵ ہجری میں پٹنہ کو عظیم آباد کیا۔ عظیم آباد کی کیا بات ہے! یہ بات دلّی اور آگرے تک کو نصیب نہیں...

عظیم آباد (۱۰۲۸) آفتاب عالم تاب (۱۰۲۸) ہے۔ اِس طرح اورنگ زیب کی تاریخ ولادت عظیم آباد ہے!:

ایں سعادت بزور بازو نیست ایں سعادت بزور ابجد ہست!

جلوس عالم گیری سے چند سال پہلے یعنی ۱۰۶۶ ہجری کے لگ بھگ ایسٹ انڈیا کمپنی نے پٹنے میں تجارت شروع کی اور لبِ دریائے گنگ گلزار باغ محلّے میں اپنی فیکٹری قائم کی۔ پٹنہ ۱۱۱۵ ہجری میں عظیم آباد ہوا۔ اس کے ستاون سال بعد عظیم آباد میں گلزار باغ فیکٹری کے بالا خانے پر شاہزادہ عالی گوہر نے تاج شاہی پہنا۔ لقب ''شاہ عالم'' (ثانی) ہوا۔

۴؍ جمادی الاول ۱۱۷۳ ہجری۔ تاریخ جلوس: فضل ربانی (۱۱۷۳)۔ اِس کے پانچ برس بعد ۲۴؍ صفر ۱۱۷۹ ہجری کو بہار بنگال اڑیسہ کی دیوانی سوتے پہرے بھک کر کمپنی کے پاس چلی گئی۔ دلی کا دیوالہ نکل گیا۔ آفتابِ سلطنت لبِ بام تھا تو کوئی کس مُنھ سے اپنے کو آفتابِ عالم تاب کہتا۔ اِس لیے عالی گوہر (شاہ عالم ثانی) نے تبرکاً اپنا تخلص ''آفتاب'' کرلیا تھا۔ ۷؍ ذیقعدہ ۱۲۰۲ ہجری کو نمک حرام غلام قادر نے بادشاہ کی

دونوں آنکھیں نوکِ خنجر سے بے نور کر دیں۔ آفتاب نے اپنے زوال کا مرثیہ خود کہا۔ بیس میں تین شعر یہ ہیں:

آفتابِ فلکِ رفعتِ شاہی بودیم!
بُرد در شامِ زوال آہ سیہ کاریِ ما
چشمِ ما کندہ شد از دستِ فلک، بہتر شد!
تا نہ بینم کہ کند غیر جہانداریِ ما
بود جانکاہ زر و مالِ جہاں ہمچو مرض
دفع از فضلِ الٰہی شدہ بیماریِ ما

حاشیہ

☆۔ طوفان کے بعد حضرت نوح علیہ السلام کے تین لڑکوں حضرت سام، حضرت حام اور حضرت یافث سے ساری دنیا آباد ہوئی۔ اِن تینوں کی اولاد جہاں جہاں پہنچی اور پھیلی دنیا کا وہ حصہ اُسی کے نام سے مشہور ہوا۔

ا۔ حضرت حام بن نوح کے چھ لڑکے: ہند، حبش، بربر، سند، زنج، نوبہ۔ اِن میں سے ہند نے ملک ہند، سند نے ملک سندھ اور باقی چار نے افریقہ میں ملک حبش، زنجبار، بربر اور نوبہ اپنے اپنے نام پر آباد کیا۔

۲۔ ہند بن حام بن نوح کے چار لڑکے۔ اِن میں سے دوسرے لڑکے بنگ نے ملک بنگالہ اور تیسرے لڑکے دکھن نے ملک دکن آباد کیا۔

۳۔ دکھن بن ہند کے تین لڑکے: مرہٹ، کنبھر، اور تلنگ۔ مرہٹ نے ملک مرہٹہ، کنبھر نے ملک کناری اور تلنگ نے ملک تلنگانہ آباد کیا۔ اس طرح مرہٹہ قوم مرہٹ کی یادگار ٹھہری۔ مرہٹ بن دکھن بن ہند بن حام بن حضرت نوح علیہ السلام۔

یہ اہلِ تاریخ کا بیان ہے جس کو غلام حسین سلیم زید پوری نے اپنی تالیف ''ریاض السلاطین'' میں نقل کیا ہے، مطبوعہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ ۱۸۹۰ء (ص ۱۸۔۲۰)

توراۃ باب تکوین فصل دہم میں حضرت حام بن نوح کے فرزند اکبر کا نام ''کش'' ہے۔ یہ نام ''ریاض السلاطین'' میں ''ہند'' اور توراۃ میں ''کش'' ہے تو اِس اختلاف کا یہ مطلب نہیں کہ ''ریاض السلاطین'' کا بیان لغو و مہمل ہے بلکہ یہ غور و فکر کا مقام ہے۔ حضرت نوح کا پوتا ہند ملک ہند میں جس گلی سے آیا، اُس گلی میں اُس کا نقشِ قدم آج تک موجود ہے۔ یعنی کوہ ہندوکش۔ ہند+ (و) + کش:

ابھی اِس راہ سے کوئی گیا ہے
کہے دیتی ہے شوخیِ نقشِ پا کی!

باب دوم

عہدِ عالم گیری

عالم گیر تخت پر بیٹھا تو شریعت نے طریقت اور کفر دونوں سے جنگ شروع کردی۔ سہ شنبہ ۲۰/ ذی الحجہ ۱۰۶۹ ہجری کو دارا شکوہ گرفتار ہو کر دلی آیا اور قلعے میں قید کیا گیا۔ علمائے شریعت نے وہی فتویٰ دیا جو عالم گیر چاہتا تھا۔ یعنی دارا شکوہ کافر ہے اور کافر کشتنی! اتنے میں محرم کا چاند ہوا ۱۰۷۰ ہجری۔ عین چاند رات کو دارا شکوہ کی کوٹھری میں جلاد پہنچا۔ جلاد نے اپنا کام کیا۔ دارا شکوہ نے اپنا کام کیا۔

دارا شکوہ عشق کا مارا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں معشوق، اس کے دل میں معشوق۔ معشوق اپنے گھر میں کسی اور کو آنے نہیں دیتا۔ چنانچہ دارا شکوہ نے جلاد کو نہیں دیکھا۔ جلاد کی تلوار کو نہیں دیکھا۔ جلاد ننگی تلوار لیے سامنے کھڑا تھا۔ اور دارا شکوہ؟ مجنوں لیلیٰ سے راز و نیاز کی باتیں کر رہا تھا:

روزے کہ شود اِذَا لسَّمَاءُ الفَطَرَتْ
واں دم کے بود اِذَ النُّجُومُ انکَدَرَتْ
من دامن تو بگیرم اندر عرصات
گویم صنما! بِاَیِّ ذَانبٍ قُتِلَتْ؟
(دارا شکوہ)

وہ دن بھی آئے گا جب آسمان پھٹ جائیں گے۔ وہ وقت بھی آئے گا جب

تارے بے نور ہو جائیں گے۔ یاد رہے کہ اُس دن اور اُس وقت بھری محفل میں ہم تیرا دامن پکڑیں گے اور پوچھیں گے کہ اے لیلیٰ! تیرے مجنوں کی گردن آخر کس گناہ پر ماری گئی؟

دارا شکوہ کے بعد سرمد کی باری آئی۔ دارا شکوہ سرمد کا معتقد تھا۔ اِس لیے عالم گیر سرمد سے بدظن تھا۔ سرمد ستر پوشی نہیں کرتا تھا۔ عالم گیر نے علما سے پوچھا۔ علما نے وہی کہا جو عالم گیر چاہتا تھا۔ یعنی سرمد بھی کشتنی ہے! چنانچہ قتل گاہ نے سرمد کی زیارت کی۔ جلاد سامنے آیا۔ حسب دستور آنکھوں پر پٹی باندھنے لگا۔ سرمد نے کہا، اِس کی ضرورت نہیں۔ اور مسکرا دیا۔ مسکرا کر جلاد سے کہا:

''تو بہر صورتے کہ می آئی من ترا می شناسم!''

پھر سرمد نے یہ شعر پڑھا اور تلوار کے سائے میں گردن جھکا دی:

عریانی تن بود غبارِ رہِ دوست

آں نیز بہ تیغ از سرِ ما وا کردند!

اِس خونِ ناحق کی تاریخ: ''بود مقبول سرمد مقتول'' (۱۰۷۰)۔ الغرض اِسی طرح شریعت اور طریقت میں جنگ ہوتی رہی۔

طریقت کے بعد کفر کی باری آئی۔ بُت کدوں کو حکم ہوا کہ مسجدوں کے لیے جگہ خالی کرو۔ اکبر نے بت خانہ بنایا۔ عالم گیر نے بت خانہ ڈھایا۔ یہ ہوتی آئی ہے۔ آزر نے بُت بنایا۔ فرزندِ آزر نے بُت توڑا۔ اکبر نے بُت خانہ بنایا تو ابوالفضل نے کتابہ لکھا۔ ابو الفضل اکبر آبادی تھا۔ عالم گیر نے بُت خانہ توڑ کر مسجد بنائی تو عبدالعزیز نے کتابہ لکھا۔ عبدالعزیز بھی اکبر آبادی تھا۔ شیخ عبدالعزیز خلف شیخ عبدالرشید... تاریخ رحلت: نور از چراغ عالم بردند۔ چراغ عالم ۱۳۴۵۔ نور ۲۵۶۔ چراغِ عالم بے نور یعنی ۱۰۸۹ ہجری... اکبر آبادی نے اکبر آبادی کا جواب لکھا۔ عبدالعزیز اکبر آبادی کی تحریر ابوالفضل اکبر آبادی کی تحریر کا جواب تھی:

کتابہ مسجدے کہ بعد از انہدام بت کدہ بنا شد

معبود واجب الوجود کہ حقیقتش از ہمہ ماہیات بالاست۔ و ہویتِ

اُو تمثال آیہ سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی۔ اشارۂ ابروئ عقلِ اسلام کیشاں در سجدہ بایں ماہیت ہست۔ و کفر منشاں راگاہ پرستش در حضور و غیبِ صنم سنگ برشیشۂ نیت:

زبت نہ گوشۂ چشمے نہ چینِ ابروے!
بحیرتم کہ دل برہمن ز کف چوں شد؟

بنائے بیت المعمور مسجد نام تعمیر کعبۂ دل است و نہادِ دارالصنم نافرجام تنگِ آب و گِل۔ پرست گاہِ صفاکیشاں چو مروہ در پاک بازی است و خاکِ معبد بُتِ شاں از آب تیشۂ نمازی۔ چپ، از راست ناشناسے کہ ایں دو خانہ را ہم سنگ دیدہ دنیا آباد دیں خرابے ست کہ بر از ایں دقیقہ نرسیدہ۔ اہل توحید را جز رموزِ ایماں اسرارے نیست۔ و الحاو را ور عالمِ عرفاں روز بازارے نہ۔ صلح کفر و اسلام ازروئے نارسائی ست۔ و جویائے مسجد و دیر ہرزہ گرد ہرجائی:

بہ سعی تیشہ صنم خانہ باصفا گردد
شود چو پاک ز بت جائے اصفیا گردد
مشو کرامتِ بت خانۂ مرا منکر
کہ چوں خراب شود خانۂ خدا گردد

وہ کسی سے پوچھ کر نہیں آیا۔ وہ پوچھتا کس سے؟ وہ پوچھتا کیوں؟ کوئی اُس کو لایا نہیں۔ اُس کو لاتا کون؟ کوئی تھا کہاں؟ وہ خود آیا ہے۔ وہ خود آ ہے۔ اِس لیے خدا ہے! وہ خود آیا اور اِس شان سے آیا کہ:

مرو را رسد کبریا و منی
کہ ملکش قدیم است و ذاتش غنی

(سعدی)

جوخودی کا تاج پہنے آیا اور آنے میں کسی کا محتاج نہ ہوا، وہ صاحبِ جبروت و جلال اپنی ہستی اور بقا میں کب کسی کا محتاج ہوسکتا ہے؟ هُوَ الْاَوَّلُ مگر اول کی ابتدا نہیں معلوم۔ هُوَالْاٰخِرُ مگر آخر کی انتہا نہیں معلوم۔ اِسی ابتدا اور انتہا نے سب کچھ گھیر لیا۔ مگر دائرے کا اور چھور نہیں معلوم۔ اتنا معلوم ہے کہ هُوَالْبَاقِی۔ باقی کچھ نہیں معلوم!

جو باقی وہی معبود۔ جو معبود وہی واجب الوجود۔ واجب الوجود وہ جس کے آگے کسی کا وجود نہیں۔ جس کا وجود کسی اعتبار سے محدود نہیں۔ جس کی حقیقت ہر حقیقت سے بالا۔ جس کا آئینہ وحدت سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی۔ سجدے میں نمازی اسی حقیقت کا اقرار کرتا ہے۔ بت کدے میں کافر اِسی حقیقت سے انکار کرتا ہے۔

کفر کا ظہور نیّت کا فتور۔ واجب الوجود کو چھوڑنا لا موجود کو پکڑنا حق پوشی ہے۔ باطل کوشی ہے۔ کفر ہے۔ کفرانِ نعمت ہے۔ کافر کا خدا بھی عجیب خدا ہے۔ بُت بنا بیٹھا ہے۔ ہل نہیں سکتا۔ کچھ کر نہیں سکتا۔ پھر بھی محمود ہے۔ معبود ہے۔ مسجود ہے۔ خدا کی شان کہ پتھر خدائی کررہا ہے۔ پتھر کی خدائی پر ایمان لانے والا ابوجہل! ابوجہل کون؟ جس کی عقل پر پتھر پڑے ہیں۔ جس کے سینے میں دل نہیں پتھر ہے۔ جس کا دل تنگِ آب و گِل۔ جس کی روح قَالُوْا بَلٰی کو بھول کر آج تک حرمِ محترم میں ماتم کر رہی ہے:

سینۂ ما از محمدؐ داغ داغ!
از دمِ او کعبہ را گل شد چراغ!
پاش پاش از ضربتش لات و منات
انتقام از وے بگیر اے کائنات

اے منات اے لات ازیں منزل مرو
گر ز منزل می روی از دل مرو!

(اقبال)

آدم کا دل؟ اللہ اکبر! کعبے میں سنگ اسود ہے تو دل پر بھی ایک سیاہ نقطہ ہے۔ دل کا یہی سویدا کعبے کا سنگ اسود ہے۔ آدم کا دل کعبہ ہے۔ بیت المعمور ہے۔ ملائکہ کی زیارت گاہ ہے۔ پاکی میں صفا مروہ ہے۔ تجلی میں طورِسینا ہے۔ جانِ عالم کی جلوہ گاہ ہے!...... اِس بیت المقدس میں اہرمن کیوں آیا؟ کعبے میں بت کیوں آیا؟ دل میں کفر کیوں آیا؟ کفر آیا تو چور آیا۔ چور کا کالا منھ! اسلام اور کفر میں صلح کیسی؟ طہارت اور نجاست میں صلح کیسی؟ سعادت اور شامت میں صلح کیسی؟ نہیں ہوسکتی۔ صلح نہیں ہوسکتی۔ قیامت تک نہیں ہوسکتی۔ بیت اللہ بیت الصنم نہیں۔ دو کو ایک سمجھنے والا حساب نہیں جانتا۔ جاہل ہے۔ دیوانہ ہے۔ دیوانگی کی حد یہ کہ دائیں اور بائیں تک کی پہچان نہیں۔ دین بیچتا ہے۔ دنیا خریدتا ہے۔ آج مسجد میں۔ کل بت خانے میں۔ مارا مارا پھرتا ہے۔ ڈانواں ڈول ہے۔ بارہ باٹ ہے!

اللہ والوں کی شان؟ اللہ ری شان! اِن کے آگے لات و منات تک خدائی کرنا بھول جاتے ہیں۔ اللہ اکبر کی ضرب لات و منات کو پاش پاش کر دیتی ہے: شکست بت سے آتی ہے صدا اللہ اکبر کی!

جَاءَ الْحَقُّ حق آگیا۔ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ اور باطل نیست و نابود ہوا۔ اِنَّ الْبَاطِلَ کوئی شک نہیں کہ باطل، کَانَ زَهُوْقًا ناپید ہونے ہی کے لیے تھا۔

عالم گیری مسجد کا کتابہ جو شیخ عبدالعزیز اکبر آبادی نے لکھا وہ غور طلب ہے۔ بلاغت کا یہ عالم ہے کہ دریا کوزے میں بند ہے۔ بات یہ ہے کہ عالم گیر اور عبدالعزیز دونوں کے سامنے وہ کتابہ تھا جو عہد اکبری میں ابوالفضل بت خانہ کشمیر کے لیے لکھ چکا تھا۔ ابوالفضل کا دعویٰ تھا کہ طریقت کی ترازو میں کفر اور اسلام دونوں کا پلہ برابر ہے۔ عبدالعزیز نے دعویٰ کیا کہ شریعت کی ترازو میں طریقت اور کفر دونوں کا پلہ برابر ہے۔ عبدالعزیز نے جو کچھ لکھا اُس کی تشریح کے لیے دفتر چاہیے، اُس دفتر کے چند اوراق یہ ہیں:

(۱) سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰے۔

عربی میں رب بمعنی پروردگار۔ یہی لفظ سنسکرت میں ربی ہوگیا۔ ربی بمعنی آفتاب۔ مثلاً...

(الف) ربندر ناتھ ٹیگور...... ربی آفتاب۔ اندر جس کی سبھا مشہور۔ ناتھ مالک۔ اور ٹیگور ٹھاکر۔

(ب) ربی بار...... ربی آفتاب۔ بار دن۔ جو ربی بار وہی اتوار۔ سنسکرت اور نیز قدیم پارسی یعنی زبانِ دری میں ایت بمعنی آفتاب۔ اس لیے اتوار دراصل ایت + وار ہے۔

(ج) ربی نندنی...... ربی آفتاب۔ نندنی لڑکی۔ اس سے مراد جمنا ندی۔

(د) ربی پتر...... ربی آفتاب۔ پتر لڑکا۔

مہا بھارت کا قول ہے کہ کُنتی نام کی ایک کنواری تھی جس کو ایک دن ربی یعنی آفتاب کا جلوۂ خاص نصیب ہوا۔ اِس جلوۂ خاص کے اثر سے ربی اور کُنتی کی جو اولاد ہوئی اُس کا نام کرن ہوا۔ سنسکرت کرن بمعنی کان۔ مثلاً کرن پھول۔ اردو زبان کو ربی کُنتی اور کرن کی کہانی خوب یاد ہے۔ جس کو شک ہو وہ آفتاب کی کرن سے پوچھ لے۔ سورج کی کرن سورج بنسی جس طرح انگور کی شراب دخترِ رز۔

ماحصل یہ کہ عربی کا رب سنسکرت میں ربی ہو کر پروردگار سے پروردہ،

غیر متناہی سے متناہی، اور رَبُّ الْعَالَمِیْن سے ایک معمولی آفتاب ہو کر رہ گیا۔ آفتاب بے داغ نہیں۔ آفتاب کو زوال ہے۔ آفتاب کو گہن بھی لگتا ہے۔ اور رَبُّ الْعَالَمِیْن؟ لازوال۔ بے عیب لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ۔ پاک۔ برتر۔ اعلیٰ۔ سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی:

آنکھیں جھپکانے کا ہے برقِ تجلی کو مرض!

کس طرح کوئی دکھا دے رخِ روشن اُن کا؟

(منیر شکوہ آبادی)

(۲) پرست گاہ صفا کیشاں چوں مروہ در پاک بازی است:

ایک زمانے میں مصر اور بابل دونوں کو خدائی کا دعویٰ تھا۔ مصر میں فرعون۔ بابل میں نمرود۔ فرق یہ تھا کہ فرعونیت نمرودیت سے ۱۰۶ قدم آگے تھی۔ نمرود (۳۰۰) فرعون (۴۰۶)۔ فرعونیت کا یہ حال کہ ملک کے کسی گوشے میں حسن کو پناہ نہیں ملتی تھی۔ ہر صاحبِ جمال قانوناً فرعون کی ملکِ خاص تھی۔ کنواری ہوتی تو ماں باپ سے چھین لی جاتی۔ بیاہی ہوتی تو شوہر مار ڈالا جاتا۔ فرعونیت کی یہ چکی سب سے زیادہ قبطیوں کو پیس رہی تھی۔ قبط حضرت نوحؑ کا پوتا۔ قبط کی نسل جو مصر میں پھیلی ہوئی تھی وہ قبطی۔

اِنھیں فاقہ کش قبطیوں کے گھر ایک لڑکی تھی۔ صورت میں کوہ نور، سیرت میں کوہِ طور، عفت میں دامنِ مریمؑ، طہارت میں آب زمزم، رفعت میں ہفت اختر، منزلت میں سورہ کوثر!... فرعونیت کا ہاتھ آخر اُس لڑکی تک پہنچا۔ اور یہ فرعون کے سامنے پیش کی گئی۔ خلوت میں اِس لڑکی نے فرعون کو وہی جواب دیا جو صدیوں بعد اُسی مصر میں یوسفؑ نے زلیخا کو دیا۔ اِس جواب سے فرعون کی آتشِ غضب بھڑک اٹھی۔

یہاں مصر میں یہ آگ بھڑک رہی تھی اور وہاں بابل میں دوسری آگ بھڑک رہی تھی۔ بابل میں نمرود انگاروں پر لوٹ رہا تھا، کیوں کہ اُس کی خدائی میں بٹا لگ چکا تھا۔ ہر طرف شور تھا کہ ابراہیمؑ کا خدا واقعی خدا ہے جس نے ابراہیمؑ کو آگ سے بچالیا۔ نمرود خدا تھا تو آگ نے نافرمانی کیوں کی؟ یہ سُن سُن کر نمرود مبہوت تھا۔ سوچتا تھا کہ ابراہیمؑ کا قتل کوئی بڑی بات نہیں۔ مگر چھری نے بھی آتش کی شاگردی کرلی تو پھر کیا

ہوگا؟ چھری نے بھی چلنے سے انکار کردیا تو پھر ہم کہاں رہیں گے؟۔ کاش کوئی صورت ایسی نکلتی کہ ابراہیمؑ اِس ملک سے خود ہی چلا جاتا۔ بارے وہ صورت یوں نکلی کہ ملک میں قحط پڑا۔ اور حضرت ابراہیمؑ نے ہجرت فرمائی اور پھر اپنی بی بی کے ساتھ مصر کی راہ لی۔ حضرت ابراہیمؑ کی بی بی ان کی چچیری بہن تھیں۔ ہاران کی بیٹی۔ آزر کی بھتیجی۔ روایت ہے کہ حسن و جمالِ آدمؑ کا آدھا حصہ یوسفؑ کو ملا۔ اور چھٹا حصہ ہاران کی بیٹی کو ملا۔ چنانچہ ہاران کی بیٹی یعنی حضرت ابراہیمؑ کی بی بی اِسی دولتِ حسن کے ساتھ مصر میں داخل ہوئیں۔

مصر آ کر حضرت ابراہیمؑ کو فرعونیت کا حال معلوم ہوا۔ حضرت نے اپنی بی بی سے فرمایا کہ تم ہماری بہن بھی ہوتی ہو۔ کوئی پوچھے تو کہہ دینا کہ ہم تمھارے بھائی ہیں۔ ہماری جان یوں ہی بچ سکتی ہے۔ چنانچہ پوچھنے والے آئے تو یہی جواب دیا گیا۔ پوچھنے والوں نے حضرت ابراہیمؑ کو بھائی سمجھ کر چھوڑ دیا۔ اور اُن کی بی بی کو فرعون کی خلوت میں پہنچا دیا۔

خلوت میں آپ نے فرمایا کہ اے فرعون! پہلے ہم کو نماز پڑھ لینے دے۔ فرعون نہیں جانتا تھا کہ نماز کیا چیز ہے۔ فوراً اجازت دے دی۔ اور آپ نے نماز شروع کی۔ دیر کے بعد فرعون نے دیکھا کہ نماز کسی طرح ختم نہیں ہوتی۔ بے ادب نے ہاتھ بڑھایا۔ فوراً دونوں ہاتھ سوکھ گئے۔ سانس رکنے لگی۔ مُنھ سے کف جاری ہوگیا۔ تب نمازی نے فریاد کی کہ اے اللہ! یہ ظالم مر گیا تو اِس کے لوگ ہم کو جیتا نہیں چھوڑیں گے! نمازی کی دعا قبول ہوئی۔ فرعون اُسی وقت اچھا ہوگیا۔

اچھا ہوتے ہی فرعون نے پھر بے ادبی کی۔ ہاتھ پھر سوکھ گئے۔ سانس پھر رکنے لگی۔ کف پھر جاری ہوگیا۔ نمازی نے پھر دعا کی۔ دعا پھر قبول ہوئی۔ فرعون پھر اچھا ہوگیا... اچھا ہوتے ہی ظالم نے پھر بے ادبی کی۔ موت پھر دامن گیر ہوئی۔ نمازی نے پھر دعا کی۔ ظالم پھر اچھا ہوگیا۔

اب ظالم نے اپنے آدمیوں کو بلایا۔ حکم دیا کہ... لے جاؤ اِس عورت کو! یہ

جادو جانتی ہے۔ ہماری جان کی گاہک ہے۔ شہر بدر کرو اِس ساحرہ کو! اور ہاں خوب یاد آیا۔ اُس سرکش کو بھی حاضر کرو جو آج تک رام نہیں ہوئی۔ وہی قبطی کی لڑکی! اِسی ساحرہ کو دے دو کہ اپنے ساتھ اُس کو بھی لیتی جائے!

جلّ جلالہ! آسمان پر ایک چاند لیکن فرعون کے محل سے اُس وقت دو چاند نکلے!... یہ دونوں چاند گہن سے نکل کر آفتاب کے پاس پہنچے۔ آفتابِ رسالت اُس وقت سجادے پر جلوہ فرما تھا۔ حضرت ابراہیمؑ نے نماز ختم کی تو اِن دونوں کو دیکھا۔ اپنی بی بی سے پوچھا یہ لڑکی کون ہے؟ بی بی نے کہا کہ چلتے وقت فرعون نے یہ لڑکی ہمارے ساتھ کردی ہے۔ ہم نے اِس لڑکی کو آپ کے لیے مباح کیا۔ گھر بے چراغ ہے۔ ہماری گود خالی ہے۔ اللہ نے چاہا تو یہی لڑکی گھر میں چراغ جلائے گی!

وہ لڑکی بی بی ہاجرہ۔ اور چراغ کی تمنا کرنے والی بی بی سارا۔ جو بی بی سارا نے چاہا وہی اللہ نے چاہا۔ اللہ نے بی بی ہاجرہ کی گود بھردی۔ بے چراغ گھر کے لیے گوہرِ شب چراغ بھیج دیا۔ چراغ کا نام اسماعیلؑ!

کیسا قحط اور کہاں کا نمرود؟ بات یہ ہے کہ اللہ کی ایک فرماں بردار کنیز فرعون کے جال میں گرفتار تھی۔ اُس کو جال سے چھڑالینا کوئی بات نہ تھی۔ لیکن اُس کا استقبال کرنا ایک بڑی بات تھی۔ روئے زمین پر کس کا مُنھ تھا جو اُس کی پیشوائی کرسکتا؟ کون اس قابل تھا جو اُس کے استقبال کے لیے بھیجا جاتا؟ اگر کوئی تھا تو وہ خلیل اللہ تھا۔ اِس لیے اللہ نے اپنے دوست کو اپنی چہیتی کی پیشوائی کے لیے شہر بابل سے شہر مصر بھیجا۔ اللہ اللہ کیا پایہ تھا بی بی ہاجرہ کا!

اللہ نے بی بی ہاجرہ کو مصر سے بیت المقدس اور وہاں سے مکہ پہنچایا۔ اُس وقت مکہ غیر آباد تھا۔ ہتھیلی کی طرح صاف۔ بالکل چٹیل میدان۔ نہ سایہ نہ پانی۔ ایک دن گرمی کا یہ حال تھا کہ آسمان سے آگ برس رہی تھی۔ بی بی ہاجرہ کی گود میں شیرخوار بچہ تھا۔ بچہ پیاس سے تڑپ رہا تھا۔ پاس ہی دو پہاڑیاں تھیں۔ صفا اور مروہ۔ بچے کی حالت غیر ہوئی تو بی بی ہاجرہ اُس کو چھوڑ کر پانی کی تلاش میں صفا پر گئیں۔ چاروں

طرف نظر دوڑائی۔ کہیں پانی نہ ملا۔ صفا سے بچے کے پاس آئیں اور پھر پانی کی تلاش میں مروہ پر گئیں۔ وہاں بھی پانی نہ ملا تو بچے کو دیکھتی ہوئی پھر صفا پر گئیں۔ اِسی طرح سات مرتبہ آئیں اور گئیں۔ اب جو آتی ہیں تو کیا دیکھتی ہیں کہ بچہ ایڑیاں رگڑ رہا ہے اور زمین سے پانی ابل رہا ہے!

بھلا ایسی بھی بات تھی کہ ابراہیمؑ اور ہاجرہ کا لال ایڑیاں رگڑتا اور اللہ دیکھتا رہتا؟ زمین کو حکم ہوا کہ شق ہو جا۔ پانی کو حکم ہوا کہ باہر آجا۔ زمین کی چھاتی پھٹ گئی۔ آبِ زم زم پھوٹ نکلا۔ زم زم نے اسماعیلؑ اور ہاجرہ کی پیاس بجھائی۔ زمین کیوں نہ پھٹ جاتی؟ زم زم[☆۱] کیوں نہ پھوٹ نکلتا؟ ابھی چھری کو صبرِ اسماعیلؑ اور عشقِ ابراہیمؑ کا متحان لینا باقی تھا:

طغیان ناز بین کہ جگر گوشۂ خلیلؑ
در زیرِ تیغ رفت و شہیدش نمی کند!

(عرفی شیرازی)

بی بی ہاجرہ جو پانی کی تلاش میں سات مرتبہ آئیں گئیں تو حاجیوں کو بھی صفا اور مروہ کے درمیان سات مرتبہ سعی کرنے کا حکم ہوا۔ صفا اور مروہ کی عظمت کا گواہ خود کلام اللہ ہے۔ ان الصفا والمروۃ من شعائر اللّٰہ۔ بے شک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہزاروں برس سے صفا اور مروہ کے میدان میں میلا لگا ہوا ہے۔ اِسی میدان میں شاہانِ ملک عرفاں اور تاج دارانِ ملکِ فقر وتسلیم و رضا کے بستر لگے ہوئے ہیں۔ اِسی میدان میں حضرت ہودؑ، حضرت صالحؑ اور حضرت شعیبؑ ہیں۔ قدم قدم پر انبیا، اوصیا اور اولیا ہیں۔ یہی زمین آسمان ہے۔ گوشۂ امن ہے۔ وادیِ ایمن ہے۔ دارالسلام ہے۔ حد ہوگئی کہ اِسی میدان میں خانۂ کعبہ ہے۔ حجرِ اسود کے پاس بی بی ہاجرہ اور حضرت اسماعیلؑ ہیں۔ مختصر یہ کہ "پرست گاہ صفا کیشاں چوں مروہ در پاکبازی ست!" اہلِ صفا کی عبادت گاہ صفا اور مروہ کی طرح پاک اور مقدس ہے!

(۳) ''چپ از راست ناشناسے کہ ایں دو خانہ راہم سنگ دیدہ''۔

وہ قیامت! وہ شہادت! وہ عدالت! وہ ہجوم!

اور کہیں تم بھول جاؤ وعدۂ دیدار کو!

(صفیر بلگرامی)

ایک عاشق نے طورِسینا پر دیدار کی تمنا کی۔ لن ترانی نے تجلی کی زبان سے کہا ہوش میں آ۔ اُس دن سے عاشقوں کی بستی میں کہرام تھا۔ عہد توریت میں۔ عہد زبور میں۔ عہد انجیل میں۔ تب عاشقوں نے قرآن سے پوچھا۔ قرآن نے جواب دیا (سورۃ الواقعہ)۔

اِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ.......... جب قیامت آئے گی۔

لَیْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ.......... جس کا آنا ہرگز جھوٹ نہیں۔

خَافِضَةٌ رَافِعَةٌ.......... جو پست کرنے والی ہے۔ جو بلند کرنے والی ہے۔

اِذَا رُجَّتِ الْاَرْضُ رَجًّا.......... جب زمین جھولا جھولے گی۔

وَّبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا.......... اور پہاڑ سرمہ ہوجائیں گے۔

فَكَانَتْ هَبَآءً مُّنْۢبَثًّا.......... اور غبار کی طرح ہوا میں پھیل جائیں گے۔

وَّكُنْتُمْ اَزْوَاجًا ثَلٰثَةً.......... اس دن تم تین گروہ ہوجاؤ گے!

اول۔ وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ○ اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ○ اور آگے بڑھنے والے تو آگے ہی بڑھنے والے ہیں وہی تو مقرب بارگاہ ہیں۔

دوم...... وَاَصْحٰبُ الْيَمِيْنِ○ مَآ اَصْحٰبُ الْيَمِيْنِ○ اور داہنے ہاتھ والے۔ کیا کہنا ہے داہنے ہاتھ والوں کا۔

سوم...... وَاَصْحٰبُ الشِّمَالِ○ مَآ اَصْحٰبُ الشِّمَالِ○ اور بائیں ہاتھ والے۔ کیا بری گت ہوگی بائیں ہاتھ والوں کی...... اِس طرح قیامت میں تین صفیں ہوں گی۔ سب سے آگے عاشقان خدا۔ داہنے ہاتھ کی طرف اللہ کی فوج اور بائیں ہاتھ کی طرف بتوں کی فوج۔

عاشقانِ خدا وہ ہیں جن کے عشق کا امتحان لیا جاتا ہے بھوک سے، پیاس سے، چُھری سے، آگ سے، طوق سے، زنجیر سے، زہر سے، وار سے، رسن سے، دنیا بھر کی مصیبتوں سے! یہ وہ مجرمانِ عشق ہیں جن کو محشر میں شرفِ حضوری اور شربتِ دیدار نصیب ہوگا۔ یہ وہ گنہ گارانِ عشق ہیں جن کو حضوری اور دیدار کے لیے سب سے آگے جگہ دی جائے گی۔ محشر میں طورِ سینا نہیں تو لن ترانی کیسی؟

ہم عاشقوں کی عرش کے آگے جمی ہے صف!
محشر میں غل ہے ''تیرے گنہگار آئے ہیں!''

(صفیر بلگرامی)

اَصْحٰبُ الْیَمِیْنِ[۲۴] اور اَصْحٰبُ الشِّمَالِ۔ داہنے ہاتھ والے اور بائیں ہاتھ والے۔ کیا کہنا ہے داہنے ہاتھ والوں کا۔ کیا بری گت ہوگی بائیں ہاتھ والوں کی۔ اِن دونوں میں وہی فرق ہے جو بیت اللہ اور بیت الصنم میں۔ اِن دونوں میں جو فرق نہیں کرتا اُس کو داہنے ہاتھ اور بائیں ہاتھ کی تمیز نہیں۔ یعنی......

''چپ از راست ناشناسے کہ ایں دو خانہ راہم سنگ دیدہ!''

(۴):

مشو کرامتِ بت خانۂ مرا منکر
کہ چوں خراب شود خانۂ خدا گردد

یہ شعر چندر بھان کا ہے۔ چندر بھان برہمن لاہوری۔ شاگرد عبدالحکیم سیالکوٹی۔ اصل شعر یوں ہے:

ببیں کرامتِ بت خانۂ مرا اے شیخ
اگر خراب شود خانۂ خدا گردد!

چندر بھان برہمن دارا شکوہ کا منشی تھا۔ دارا شکوہ ۱۰۷۰ ہجری دارالامتحان سے دارالسلام کو سدھارا تو چندر بھان بھی آقا کے سوگ میں بنارس چلا آیا۔ اور پھر پاؤں توڑ کر بیٹھ رہا۔ سال رحلت ۱۰۷۳ ہجری۔ چندر بھان اپنے تخلص برہمن سے وہی کام لیتا

تھا جو بعد میں حکیم مومن خاں دہلوی نے اپنے تخلص مومؔن سے لیا۔

دارد خیال رُوے تو در دیده برہمن
من ذرهٔ حقیرم و مہمانم آفتاب!

یہ کیوں کہو کہ برہمن آفتاب پرست ہے؟ یوں کہو کہ سلیمانؑ چیونٹی کے گھر مہمان ہے۔ اور ذرے کی زبان سے کہنا ہو تو یوں کہو کہ:

ایں خانہ تمام آفتاب ست!

بے جزو ره بہ کل نتواں برد برہمن
ہر جزوِ روزگار نمودارِ آں کل است!

سمندر کی تمنا ہو تو قطرے میں فنا ہو جاؤ۔
ہر قطرہ اپنی جگہ پر معرفت کا سمندر ہے۔
برہمن اِس راز کو جانتا ہے۔ اِسی لیے برہمن قطرے میں گم ہو کر سمندر سے جا ملتا ہے۔ اور کائنات کے ذرے ذرے کو مسجود سمجھتا ہے!

لازم آمد بر سرِ ما خدمتِ بت برہمن
محو کے گردد ہر آں نقشے کہ در دل ہا نشست؟

برہمن کے دل پر بت کا سکہ بیٹھا ہوا ہے۔
یہ نقش مٹ نہیں سکتا۔ پتھر کی لکیر ہے!
دارا شکوہ چندر بھان کو ایک مرتبہ شاہ جہاں کے دربار میں لے گیا۔
شاہِ جہاں نے کہا... ''از گفتۂ خود شعرے بخواں''۔ چندر بھان نے اپنا یہ شعر پڑھا:

مرا دلے ست بکفر آشنا کہ چندیں بار
بہ مکہ بردم و بازش برہمن آوردم!

برہمن کا دل بھی بڑا کافر نکلا۔ بارہا ہم اِس کو مکے کی زیارت کرا چکے، پھر بھی آج تک یہ برہمن کا برہمن ہی ہے!

یہ شعر سن کر شاہ جہاں کو جلال آ گیا۔ حکم دیا: ''کسے تواند کہ جواب ایں کافر برساند؟'' بارے وزیرِ سلطنت نواب افضل خاں کو گلستان سعدی خوب یاد تھی۔ برجستہ جواب دیا:

خرِ عیسیٰ اگر بمکہ رود

چوں بیاید ہنوز خر باشد!

حواشی:

۱۔ ہندوستانی اس پانی پر مرتے ہیں۔ چنانچہ ۱۳۲۶ ہجری میں ایک ہندوستانی نے چاہ زم زم میں کود کر جان دے دی۔ اُس کی لاش نکالنے کے لیے جدّہ سے آدمی بلائے گئے۔ تاریخ الحرمین الشریفین مؤلفہ مولانا عبدالسلام ندوی۔ ص ۱۴۴۔

ہم نے یہ واقعہ پڑھا تو خیال ہوا کہ اُس غریق چاہ زم زم کو آبِ رحمت کی کتنی تلاش ہوگی جو دنیا بھر سے منھ موڑ کر اُس نے زم زم سے چاہ کی۔ اور اس طرح اپنی پیاس بجھائی۔ یہ خیال آتے ہی بے اختیار منھ سے نکلا: ''جو بات کی خدا کی قسم لاجواب کی۔'' اب اُس مرحوم کی قسمت اور چاہِ زم زم کی کرامت دیکھیے کہ تاریخِ رحلت بے دھڑک سامنے آ گئی:

تاریخ لاجواب ہے! تاریخ لاجواب!

''جو بات کی خدا کی قسم لاجواب کی!''............۱۳۵۰

(لا) جواب۱۲+ (لا) جواب۱۲............ ۲۴-

۱۳۲۶ ہجری

۲۔ (الف) حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ایک معجزہ یہ تھا کہ اُن کا عصا اژدہا بن جاتا تھا۔ جس وقت یہ معجزہ عطا ہوا تھا اُس وقت عصا حضرت کے داہنے ہاتھ میں تھا۔

وما تلک بیمینک یموسیٰ (سورۂ طٰہٰ)۔ اور اے موسیٰ! یہ تمھارے داہنے ہاتھ میں کیا ہے؟

(ب) قیامت میں نامۂ اعمال دیا جائے گا تو نیکوکار کو داہنے ہاتھ میں اور بدکار کو بائیں ہاتھ میں۔

فاما من اوتی کتبہ بیمینہ (سورۂ حاقہ)

واما من اوتی کتبہ بشمالہ (سورۂ حاقہ)

پھر جس کا اعمال نامہ اُس کے داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا۔

اور جس کا اعمال نامہ اُس کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا۔

(ج) اول کسے کہ علم برجامہ کرد و انگشتری در دست چپ جمشید بود۔

گفتندش چرا زینت بچپ دادی وفضیلت راست راست۔

گفت راست را زینت راستی تمام است...... (گلستاں باب ہشتم)

جمشید پہلا شخص تھا جس نے کپڑوں پر بیل بوٹے بنائے اور انگوٹھی بائیں ہاتھ میں پہنی۔ کسی نے پوچھا کہ داہنے ہاتھ کو چھوڑ کر تو نے بائیں ہاتھ کو زینت کیوں بخشی؟ جمشید نے جواب دیا کہ

دستِ راست کی زینت خود اُس کی راستی ہے۔ اب کسی اور زینت کی اِس کو حاجت نہیں رہی۔
(د) بزرگے را پرسیدند با چندیں فضیلت کہ دستِ راست راہست، خاتم در انگشتِ چپ چرا می کنند۔ گفت ندانی کہ اہلِ فضیلت ہمیشہ محروم اند...... گلستاں باب ہشتم۔
ایک بزرگ سے کسی نے پوچھا کہ داہنے ہاتھ کی بزرگی مسلم ہے تو انگوٹھی بائیں ہاتھ میں کیوں پہنی جاتی ہے؟ بزرگ نے جواب دیا کہ دنیا اِسی کا نام ہے۔ یہاں اہلِ فضیلت کو کوئی نہیں پوچھتا۔
(ہ) چوں کہ داہنے ہاتھ کی فضیلت اصحب الیمین سے ثابت ہے، اِس لیے مسلمان بادشاہوں نے وزیراعظم کے لیے خطاب ''یمین الدولہ'' مناسب سمجھا...... مثلاً یمین الدولہ آصف خاں وزیر شاہ جہاں۔

باب سوم

عہدِ بہادر شاہی

بابر کے بھیس میں قیامت لاہور سے پانی پت پہنچی تو سلطان ابراہیم لودی بھی دلی سے پانی پت پہنچا۔ پانی پت میں سیلاب سیلاب سے ٹکرایا۔ لاہور کا سیلاب دلّی کے سیلاب کو نگل گیا۔ پانی پت کی لڑائی بابر نے جیتی۔ اِس جیت کی تاریخ... ابراہیم لودی شہید شد (۹۳۲)۔

ابراہیم لودی کے درباریوں میں شیخ محمد راضی ابن شیخ محمد رضی قریشی بھی تھا۔ محمد راضی نے بابر کے خوف سے حصار فیروزہ میں پناہ لی۔ یہ حصار فیروزہ وہی ہے جس کا ڈانڈا سہرام سے ملا ہوا ہے۔ سہرام ضلع شاہ آباد میں شیرشاہ کا روضہ ہے۔ اور حصار فیروزہ میں فرید خاں سوری عرف شیرخاں عرف شیرشاہ بادشاہ دہلی پیدا ہوا تھا۔ الغرض شیخ محمد راضی قریشی نے حصار فیروزہ میں پناہ لی تو اِسی وجہ سے وہ حصاری مشہور ہوا۔ اور اِسی حصار سے اِس خاندان کی شہرت کا دائرہ دور اکبری و جہانگیری میں بڑھتا گیا۔ حتیٰ کہ عہد شاہ جہانی میں اِس خاندان کے چشم و چراغ داؤد خاں پر دارا شکوہ کی نظر پڑی۔ دارا شکوہ نے نواب داؤد خاں کو آگرہ اور دہلی کی خدمتِ راہ داری اور متھرا مہابن وغیرہ جاگیراتِ خاص کی فوج داری سپرد کی۔

عہد عالم گیری میں نواب☆ داؤد خاں نے پندرہ سال تک صوبے داری کی۔ اس صوبے داری کی شان پٹنے نے دیکھی۔ برہان پور نے دیکھی۔ ناگ پور نے دیکھی۔

الہ آباد نے دیکھی۔ آج الہ آباد، ناگ پور، برہان پور اور عظیم آباد سے پوچھا جائے کہ داؤد کون تھا تو چاروں یہی کہیں گے کہ داؤد نگر سے پوچھو۔

۱۰۳۲ ہجری میں تلسی داس شاعر نے بنارس میں اور شاہ ارزاں نے پٹنے میں انتقال کیا۔ ہندوستان میں اُس وقت نور جہانی سکہ چل رہا تھا۔ اِس کے پورے چالیس سال بعد ۱۰۷۲ ہجری میں ضلع گیا میں داؤد نگر کی بنیاد پڑی۔ شہر اور قلعے کی تکمیل ۱۰۸۴ ہجری میں ہوئی۔ یہ تیرھواں سال تھا اور تیرہ کی نحوست یہ کہ بانیِ داؤد نگر نواب داؤد خاں نے اِسی سال رحلت کی۔ داؤد خاں کی موت داؤد نگر کی موت اور داؤد خاں کا مرثیہ داؤد نگر کا مرثیہ۔ چنانچہ نواب عنایت اللہ خاں عرف نواب حمید خاں ثانی خلف نواب جیون خاں فرماتے ہیں (تاریخ داؤدیہ مؤلفہ سید محمد ناصر بلگرامی مطبوعہ آئینی پریس الہ آباد)۔

چہ دل بندی دریں دنیا؟ کہ افسون ست و افسانہ!
ہزاراں عاقل و فرزانہ را کردست دیوانہ!
بزیرِ گردشِ گردوں چہ امیدِ بقا باشد؟
کجا ماند سلامت درمیانِ آسیا دانہ؟
اگر آید دمِ اوّل ، دمِ دیگر مجو از پس
کہ آں بد آشنا اوّل در آخر ہست بیگانہ!
قیاس از حشمتِ داؤد خاں کن کز سپاہِ او
شدے آباد شہرے ، گر گزر کردے بہ ویرانہ
بسے شمشیر ہا زد بر سرِ بنگالہ و دکھن
کزو شد داستانِ رستمِ دستاں بہ افسانہ!
چوں جاں بسپرد ایماں برد در راہِ جواں مردی
بتاریخش خرد گفتا : باایماں رفت مردانہ!
۱۰۸۴ ہجری

پانچواں شعر افسانہ نہیں، واقعہ ہے۔ ۱۰۶۹ ہجری میں عالم گیر نے اپنے بھائی

سلطان شجاع کی سرکوبی کے لیے میر جملہ کو بنگالے بھیجا۔ میر جملہ کی مدد کے لیے پٹنے سے نواب داؤد خاں بھاگل پور اور کہل گاؤں ہوتا ہوا مالدے پہنچا۔ سلطان شجاع کو میدان چھوڑنا پڑا۔ آخر وہ اپنی جان لے کر بنگالے سے ملک اراکان پہنچا۔ لیکن راجا اراکان ملک الموت سے رشوت لے چکا تھا، اُس نے شجاع کو بال بچوں سمیت ایک کشتی میں بٹھا کر دریا میں غرق کرا دیا۔ چنانچہ وہ غریق دریائے رحمت اپنی پریشان حالی اور خانہ بربادی کی تصویر اپنے ہاتھ سے کھینچ کر ۱۰۷۱ ہجری میں دنیا سے چل بسا:

نمی دانم کہ گردوں چوں بکام من نمی گردد
پریشانی اگر عیب است زلفِ یار ہم دارد!

(شاہزادہ شجاع)

جو حال بنگالے کا ہوا وہی دکن کا ہوا۔ دکن میں نواب داؤد خاں کا ادنیٰ کارنامہ یہ تھا کہ ۱۰۷۵ ہجری میں خود شیواجی مرہٹے کو دربارِ داؤد میں سلام کے لیے حاضر ہونا پڑا۔ چنانچہ مشہور مورخ پروفیسر جدوناتھ سرکار اپنی کتاب ''شیوا جی'' (مطبوعہ ۱۹۱۱ء، ص ۲۱۳۔ ۲۱۱) میں اقرار کرتے ہیں:

"The only officer who made an attempt to uphold the imperial prestige in the Deccan was Daud Khan Qureshi during Jai Singh's Maratha campaign of 1665.... The Emperor in open court highly praised Daud Khan for his spirit in invading the enemy's country, regardless of the smallness of his own force...." (Shivaji and His Times)

ترجمہ: ۱۶۶۵ء میں راجا جے سنگھ اور مرہٹوں میں جنگ ہوئی تو داؤد خاں قریشی ہی ایک ایسا شخص نکلا جس نے ملک دکن میں سلطنت مغلیہ کی آبرو رکھ لی... خود بادشاہ نے تعریف کی اور سرِ دربار فرمایا کہ صد آفریں ہے داؤد خاں کو کہ فوج اُس کے پاس اتنی کم، پھر بھی اُس نے مطلق پروا نہ کی اور دشمن کے ملک میں دلیری کے ساتھ بڑھ گیا۔

اِسی طرح چوتھا شعر بھی افسانہ نہیں، واقعہ ہے۔ جمادی الاول ۱۰۷۲ ہجری میں داؤد خاں نے پلاموں کا قلعہ فتح کیا۔ بعدِ فتح یہ پٹنے جا رہا تھا کہ راستے میں ایک

جگہ شکار کے لیے ٹھہر گیا۔ اِس جنگل کا نام انچھا تھا۔ یہاں کسی نے آ کر خبر دی کہ حضور! علی بابا اور چالیس چور اِسی جنگل میں رہتے ہیں:

انچھا لانگھے اور بھدوہی
تب جانو گھر آئے بٹوہی!

یعنی یہ شکار کی جگہ نہیں، یہ ٹھگوں کی راج دھانی ہے۔ انچھا اور بھدوہی سے راہی بٹوہی اپنا سر سلامت لے گیا تو جانو کہ موت کے چنگل سے چھوٹا۔ داؤد خاں قریشی تھا۔ قریشی کو غیظ آ گیا۔ غیظ میں سارا جنگل کاٹ کر میدان کر دیا۔ اور عالم گیر کو عرض داشت بھیجی تو یہ کہاوت بھی لکھ دی۔ بادشاہ نے فتحِ پلاموں کی خوشی میں انچھا، گوہ اور منورہ تین پرگنے داؤد خاں کو انعام کیے۔ اور داؤد خاں نے مٹی جس کنویں کی تھی، اُسی کنویں میں لگا دی۔ یعنی تینوں پرگنوں کی آمدنی اِسی ویرانے پر نچھاور کر دی۔

یہی ویرانہ آباد ہو کر داؤد نگر ہوا۔ یادش بخیر داؤد نگر کا ہر محلہ اُس وقت شاعر کا ایک دیوان تھا۔ اور اِس طرح شہر داؤد نگر گویا کلیات داؤدی تھا۔ جس طرح ایک دیوان دوسرے دیوان کا تابع نہیں ہوتا، اُسی طرح داؤد نگر کا ایک محلّہ دوسرے محلے کا دست نگر نہیں تھا۔ جس طرح دیوان میں غزلیں الف سے ی تک ہوتی ہیں اسی طرح ہر محلے میں اہل حرفہ بھی الف سے ی تک آباد کیے گئے۔ ڈوم چمار وغیرہ کے لیے جگہ کلیات داؤدی کے حاشیے پر نکالی گئی۔ اِس ترتیب خاص میں داؤد نگر اپنی نظیر آپ تھا۔ اِسی چہل پہل کو یاد کر کے کہنے والا کہتا ہے:

قیاس از حشمتِ داؤد خاں کن کز سپاہِ او
شدے آباد شہرے، گر گزر کردے بہ ویرانہ!

نواب داؤد خاں کے بیٹے نواب حمید خاں نے ۱۰۹۲ ہجری میں اور پوتے نواب جیون خاں نے ۱۱۲۴ ہجری میں رحلت کی۔ نواب جیون خاں کے دو لڑکے: عنایت اللہ خاں عرف نواب حمید خاں ثانی اور فقیر اللہ خاں عرف نواب احمد خاں۔ مورخین اِن کو نواب احمد خاں حصاری کہتے ہیں کیوں کہ اُسی زمانے میں اُن کے ہم نام

نواب احمد خاں بنگش فرخ آباد میں موجود تھے۔ نواب احمد خاں حصاری کا قیام عرصے تک عظیم آباد محلّہ مغل پورہ میں رہا۔ ۱۱۴۵ ہجری میں احمد خاں نے داؤد نگر کے متصل احمد گنج آباد کیا۔ اور بعد میں وہ وہیں مولا باغ میں مدفون ہوئے۔

داؤد نگر اور احمد گنج کی دولت کا شہرہ دور دور تھا۔ ۱۱۵۷ ہجری میں ایک عیار شاطر بالاجی راؤ مرہٹہ نواب مہابت جنگ علی وردی خاں سے شطرنجِ سیاست کھیلنے کے لیے مرشد آباد جارہا تھا، راستہ کاٹ کر بالاجی راؤ یکایک داؤد نگر پہنچ گیا۔ نواب احمد خاں نے غوث گڈھ میں پناہ لی اور پچاس ہزار روپے صدقہ کر کے اپنے سر سے یہ بلا ٹالی۔

مری عقل اِس جا پہ حیران ہے
کہ یارب یہ کیسا گلستان ہے!
کبھی ہے خزاں اور کبھی ہے بہار
نہیں اک وتیرے پہ لیل و نہار!

میر حسن

گلستانِ داؤد نگر میں خزاں بندوبست دوامی کے وقت آئی۔ لارڈ کارن والس نے پرگنات انچھا، گوہ، منورہ پر جمع باندھ دی۔ اولادِ داؤد خاں نے سر پیٹ لیا۔ کہا کہ یہ شاہانِ مغلیہ کا عطیہ ہے۔ بزرگوں کا تبرک ہے۔ قدیم معافی ہے۔ اِس پر سرکاری جمع کیسی؟ مگر جو ہونا تھا وہی ہوا۔ تینوں پرگنے اِس خاندان کے قبضے سے نکل گئے۔ اور صرف تین پشتوں کے لیے پانچ سے (۵۰۰) روپے ماہانہ وظیفہ مقرر ہوا۔ یعنی سیر بھر نیلم الماس اور لعل کے بدلے پاؤ بھر ستو! چوتھی پشت هیں الله کا نام!:

چہ دل بندی دریں دنیا کہ افسوں ست و افسانہ
ہزاراں عاقل و فرزانہ را کردست دیوانہ!
بزیرِ گردشِ گردوں چہ امید بقا باشد
کجا ماند سلامت درمیانِ آسیا دانہ؟

ہم باز آئے ایسی دنیا سے۔ اے بھائی! یہ مردار دل لگانے کے قابل نہیں۔ یہ چھچھوندر ہے۔ سانپ ہے۔ بچھو ہے۔ افسوں ہے۔ افسانہ ہے۔ مکڑی کا جالا ہے۔ اندرائن کا پھل ہے۔ کامروپ کا جادو ہے۔ اہلِ ہوش اِس سے پناہ مانگتے ہیں۔ لیکن اِس کا جادو ہوش والوں کو بھی نہیں چھوڑتا۔ درمیان آسیا دانہ! چکی کے دو پاٹ۔ زمین اور آسمان۔ بیچ میں ایک مٹھی گیہوں۔ چکی آٹھوں پہر چل رہی ہے۔ صورت یہ ہے تو گیہوں کی خیریت معلوم!

گلستانِ داؤدنگر سے بہار جب روٹھ کر چلی گئی اور کلیاتِ داؤدی کے اوراق جب پریشان ہوگئے تو بلبلیں بھی اِس باغ سے کوچ کر گئیں اور اوراقِ پریشاں بھی ہوا میں منتشر ہوگئے۔ مثلاً حضرت اکبر الٰہ آبادی اور لالہ وزیر مل۔

سیّد محمد زماں رضوی فوجِ بنگال میں صوبے دار تھے۔ اور لارڈ کلایو کے ساتھ جنگِ پلاسی میں شریک تھے۔ بعدِ فتح اُن کو قرب داؤدنگر میں جاگیر ملی۔ اُن کے بڑے لڑکے سید فضل محمد رئیس داؤدنگر۔ عہدِ آصف الدولہ میں یہ داؤدنگر سے لکھنؤ گئے۔ اور پھر کان پور گئے۔ وہاں اُنھوں نے عہدۂ نظارت قبول کیا اور ۱۲۷۲ ہجری میں رحلت کی۔ سید مظفر علی مجنوں بلگرامی نے تاریخِ رحلت کہی۔ اور کیا خوب کہی: ''زہے برحالِ او فضلِ محمد'' (۱۲۷۲)۔

سیّد فضل محمد کے تین لڑکے: سیّد وارث علی، سیّد واصل علی، اور سیّد تفضل حسین۔

مولانا سیّد تفضل حسین کے دو لڑکے: سیّد اکبر حسین اکبر الٰہ آبادی اور سیّد اکبر حسن۔ مولانا سید تفضل حسین اور حضرت اکبر الٰہ آبادی دونوں کو حضرت مولانا شاہ محمد قاسم دانا پوری سے شرف بیعت حاصل تھا۔ ولادت اکبر الٰہ آبادی: دو شنبہ ۲۶/ ذیقعدہ ۱۲۶۲ ہجری۔ رحلت حضرت شاہ محمد قاسم دانا پوری: پنج شنبہ ۱۷/ شوال ۱۲۸۱ ہجری۔ اِس طرح حضرت اکبر الٰہ آبادی نے آغازِ شباب ہی میں بیعت کرلی تھی۔

مرحوم و مغفور داؤدنگر میں لالہ وزیر مل ایک ادیب تھا۔ فکرِ معاش اُس کو بھی داؤدنگر سے بریلی لے گئی۔ اور وہاں عدالت اپیل میں اللہ نے اُس کا سامان کر دیا۔

سالِ رحلت غالباً ۱۲۶۸ ہجری۔ اِس ادیب نے اپنے خالو لالہ جواہر مل فدا داوٗدنگری سے تعلیم پائی تھی۔ یہ تعلیم عہد بہادر شاہی کی تعلیم تھی۔ چنانچہ زمانے کی گردش نے داوٗدنگر کی جامع مسجد کو بھی نہ چھوڑا تو مسجد کی حالت دیکھ کر لالہ وزیر مل سے رہا نہ گیا۔ آخر اُس کے قلم کو جنبش ہوئی:

تحریر لالہ وزیر مل درباب جامعِ مسجد داوٗدنگر:

جامعِ مسجد قصبہ داوٗدنگر کہ از مدت بہ نیتِ نماز برپا بود۔ و دیوارش از غایت کہنگی برکوع آمدہ۔ قریب است کہ بہ سجدۂ ہم رود۔ تاب آں ندارد کہ بے پشتیِ امدادِ بلند اقبالاں قد قامت گویاں سر برآورد۔

چوں جائے کہ بارگاہِ احدیت اوست نمی داند تفاوتے درمیانِ دشمن و دوست و مغز و پوست در نخلستانِ عزتش خار و ثمر از یک نہال۔ و بکارخانۂ قدرتش ظرفِ طینتِ موافق و منافق ساختہ یک کلال۔ زنار ترسا و سبحۂ پارسا سرشتۂ یک رشتہ۔ وتخمِ کیفیتِ خدا شناساں ونخلِ حقیقتِ رام پرستان یک باغبان گشتہ۔ محرمان دیر و حرم و واقفانِ کعبہ و بیت الصنم دریک مقام راہ بر۔ ہندو و مسلمان چہ مدرّسان بید و پران و تلاوتیانِ حدیث و قرآن طریق حق پرستی بیک منزل پے سپر۔ شیخ خانقاہ و راہب صنم گاہ ہر دو بذکر آں یگانۂ مطلق، قرنائے ناقوس نواز و صدائے بانگِ نماز بیادِ آں واحد برحق:

ہر ہمہ را روے بدرگاہِ اُو
کام زبان آمدہ در راہِ اُو
سر بسر اندر طلبش در بدر
گردِ رہِ کعبہ و بت خانہ سر

عالم تمام از رخِ جانانہ روشن است!
از یک چراغ کعبہ و بت خانہ روشن است!

جمیع مسلمانان اہلِ اسلام و ہنودان فرمان پذیرِ رام نظر برکار خیر ساختہ۔ کعبہ و دیر را پرستش گاہ معبود حقیقی دانستہ بقدر استطاعتِ خودہا امداد فرمایند۔ و از مرمتِ خانۂ خدا ابوابِ ثواب بر روئے صلاحیتِ خود کشایند۔ الٰہی توفیق خیر رفیق کناد۔

داؤد نگر کی جامع مسجد نماز کی نیت باندھے ،رت سے کھڑی تھی۔ اُس کی دیوار جو پیرانہ سالی کی وجہ سے رکوع میں تھی، اب سجدے میں آیا ہی چاہتی ہے۔ رکوع سے سر اٹھانے کی اس میں تاب کہاں جب تک کہ قَدْ قَامَتِ الصَّلوٰۃ کہنے والے سہارا دے کر اُس کو خود نہ اٹھائیں۔

وہاں باغ میں ڈالی جھوم رہی ہے۔ یہاں کمھار کا چاک چکر میں ہے۔ وہ کیوں جھوم رہی ہے؟ یہ کیوں چکر میں ہے؟

مالی ایک ہی ڈالی سے رنگ رنگ کی چیزیں نکال رہا ہے۔ یہ کانٹا ہوگیا۔ وہ پھل۔ یہ کفر ہوگیا۔ وہ اسلام۔ یہ مشاہدہ کرتے ہی ڈالی جھوم گئی۔ وجد میں آ گئی۔ سبحان تیری قدرت!

کمھار ایک ہی چاک سے طرح طرح کے پیالے اتار رہا ہے۔ یہ نمرود ہوگیا۔ وہ خلیل اللہ۔ یہ فرعون ہوگیا۔ وہ کلیم اللہ۔ یہ مشاہدہ کرتے ہی چاک کو حال آ گیا۔ مستی میں ناچنے لگا۔ سبحان تیری قدرت!

جو حال ڈالی اور چاک کا وہی زمین اور آسمان کا۔

کن فیکون کا تماشا دیکھتے ہی کائنات وجد میں ہے۔ دنیا

گھوم رہی ہے۔ آسمان چکر میں ہیں۔ شش جہت سے آواز آرہی ہے۔ ''سبحان تیری قدرت!''

پس داوٗد نگر کی جامع مسجد بھی بارگاہ ہے، اُسی بے نیاز و یکتا کی جس کی نگاہ میں دشمن و دوست اور مغز و پوست دونوں ایک اُسی رب العزت کی جس کے باغ میں پھل اورکانٹے دونوں مہمانِ عزیز، اُسی صاحب قدرت کی جس کے کارخانے میں ظروف کفر اور ظروف اسلام دونوں ایک۔

جو رشتہ تسبیح و زنار میں وہی ایزد پرست اور آتش پرست میں، جس مالی نے خدا پرستی کا بیج بویا اُسی نے رام پرستی کا درخت بھی لگایا۔ دیر و حرم اور کعبہ و بیت الصنم کے جاننے والوں کی منزل مقصود ایک۔ بید و پران اور حدیث و قرآن کا شاہد مقصود ایک!:

یہ تعلق ہو مبارک کافر و دیں دار کو
ایک رشتہ ہے ہر اک تسبیح سے زنار کو

(صفیر بلگرامی)

وہی یگانۂ مطلق ہے جس کا شور خانقاہوں میں اور بت خانوں میں۔ وہی واحد برحق ہے جس کا بول بالا ناقوس سے اور اذاں سے۔ اُسی قبلہ عالم کی تلاش میں رہروان دیر وحرم آج تک دربدر اور خاک بسر ہیں۔ اللہ ری رخ جاناں کی تجلی! چوکھ جوت ہے! عالم جگمگ جگمگ کررہا ہے۔

حرم و دیر میں ہے جلوۂ پُر فن اُن کا
دو گھروں کا ہے چراغ اک رخ روشن اُن کا

منیر شکوہ آبادی

اِس لیے اہلِ اسلام اور بندگانِ رام سے عرض ہے کہ بیت اللہ اور بیت الصنم کو معبود حقیقی کی عبادت گاہ سمجھ کر اپنی حیثیت

کے مطابق اِس کارِ خیر میں شریک ہوں۔ اور خانۂ خدا کی مرمت کے وسیلے سے اپنے لیے ثواب کا دروازہ کھولیں۔

خدا اِس کی توفیق سب کو دے!

تحریرِ لالہ وزیر مل کے چند فقرے تشریح طلب ہیں۔ اِس تشریح سے یہ بھی معلوم ہوجائے گا کہ عرفان کس کو کہتے ہیں۔ اور اہلِ معرفت کی پہچان کیا ہے۔

(ا) جائے کہ بارگاہِ احدیتِ اوست نمی داند تفاوتے درمیانِ دشمن و دوست۔

کسی شیعہ نے لعن طعن کیا۔ تبرائی کی گرفتاری کے لیے مجمع ہوا۔ یہ مجمع سعداللہ اور مجدالدین کے مشورے سے ہوا۔ یہ دونوں ایک عارف باللہ کے حلقہ بگوش تھے۔ عارف باللہ کو اِس ہنگامہ آرائی اور خود اپنے مریدوں کی شرکت کا حال معلوم ہوا تو اُس نے دونوں کو ایک خط بھیجا:

مکتوب عارف بنام غیرعارف

برادرم مجدالدین و فرزندم شیخ سعد اللہ بدانند کہ خبر مجتمع شدن بند ہائے الٰہی بگرفتار نمودن جوانِ رافضی مفصل رسید۔ می گویند کہ ایں اجماع باستصواب شما ہا بود۔ اگر حق است براہ باطل رفتہ آید۔ و اگر غلط ست در صحت نسخۂ ہستیِ شما گفتگو نیست۔ چہ آن مسکینِ زبان دراز ہر چہ گفتہ بود اگر دروغ است واجب الرحم ست کہ منصب او منصب بے خبران ست۔ و اگر راست ست پس سیاست برائے چہ؟ شعر:

راستی موجب رضائے خداست
کس ندیدم کہ گم شد از رہِ راست

ایں احوالی راچہ باید گفت کہ او را و خود را دوتا دانستید۔ چوں مخلوق چنیں شدہ آید معاف باید داشت۔ شما را حکم در نواصب و روافض نکردہ ام۔ برائے خود در وجود آوردہ ام۔ مرا بشناسید و در

من گم شوید۔ من کیستم کہ من میگویم۔ من گفتنم بیجاست۔ توئے و اوئے مقابل خود ندارم۔ ہر چہ کردی خوب کردی۔ کردید نمی گویم کہ مخبر از دوئی ست۔ و ایں ہم نمی دانم کہ بہ کہ می گوید و چہ می گوید و چرا می گوید زیادہ ازیں چہ پوچ بگویم۔ و تا کجا یاوہ چاویدہ باشم۔ خود کارِ بد کردن و نفرین دیگراں یعنی چہ۔ گاہے زبان را بہ سبِ صحابہ وا می کنم۔ و گاہے بگرفتار کردنِ خود می روم۔ و گاہے خود را بگرفتار کردن خود ملوم می سازم۔ دیوانۂ عشقم۔ ہر چہ خواہم بگویم۔ و ہر چہ خواہم بکنم۔ (''چار شربت'' مصنفہ مرزا قتیل ص ۷۳)

تبرا یا تو حق ہے یا ناحق۔ جائز ہے یا ناجائز۔ سچ ہے یا جھوٹ۔ اگر سچ ہے تو سچ بات پر رافضی کی گرفتاری کیسی؟ اگر جھوٹ ہے تو ثابت ہوا کہ رافضی غریب حقیقت سے بے خبر اور اس لیے واجب الرحم ہے۔

غضب ہے کہ تم نے اپنے کو اور اُس رافضی کو دو سمجھا۔ اور ستم ہے کہ اپنی حد سے باہر پاؤں نکالا۔ تم ہوتے کون ہو شیعانِ علی و دشمنانِ علی میں حق و ناحق کا فیصلہ کرنے والے؟ تمھارا کام تھا ہم کو پہچاننا۔ افسوس کہ یہی کام تم نے اب تک نہیں کیا۔ اب بھی وقت ہے کہ پہچان لو۔

تبرا کون کرتا ہے.......... ہم کرتے ہیں!

تبرائی کو گرفتار کون کرتا ہے؟.......... ہم کرتے ہیں!

گرفتار کرنے والے کو ملامت کون کرتا ہے؟.......... ہم کرتے ہیں!

جو کچھ کرتے ہیں ہم کرتے ہیں۔ رافضی ہم۔ رافضی کے دشمن ہم۔ دشمنِ رافضی کے دشمن ہم۔ ہمارے سوا کوئی دوسرا نہیں۔

ہمارے سامنے دوئی کا پردہ نہیں:

بنی آدم اعضائے یک دیگر اند

کہ در آفرینش زیک جوہر اند

صوبۂ الہ آباد کی حکومت شاہزادہ دارا شکوہ کے ہاتھ میں آئی تو اس نے ایک مکتوب حضرت شیخ محبّ اللہ الہ آبادی کو بھیجا جس میں اٹھارہ سوالات تھے۔ مثلاً......

سوال سوم...... کدام علم است کہ او را حجاب الاکبر گفتہ اند؟

سوال ہشتم...... ظلوماً جھولاً در مدح انسان ست یا در مذمت؟

سوال دہم...... طالب را بعد از موت وصل ممکن باشد یا نہ؟

سوال دو از دہم...... تفرقۂ درد و عشق چیست؟

سوال پانز دہم...... غیر متناہی در متناہی چہ گو نہ گنجد؟

آغاز مکتوب میں دارا شکوہ نے لکھا تھا کہ صوبہ الہ آباد جو ہمارے ہاتھ میں آیا، اس کی خوشی زیادہ تر اِس وجہ سے ہے کہ آپ وہاں موجود ہیں۔ گزارش ہے کہ مسلمانوں کی بھلائی اور بہبودی کا جو کام بھی آپ کے پیش نظر ہو اُس کو مرزا باقی بیگ اثر حاکمِ الہ آباد سے ضرور فرما دیا جائے۔ وہ آپ کے حکم کا ہمیشہ منتظر رہے گا۔

مکتوب کے اِس حصے کا جواب شیخ محبّ اللہ نے یہ دیا کہ شاہزادۂ بلند اقبال کو کیا نہیں معلوم کہ اللہ رب العالمین اور اللہ کا رسولؐ و رحمت للعالمین ہے؟ اور کیا نہیں معلوم کہ ازروئے کلام اللہ آسمان والے زمین والوں کے لیے ہر وقت مغفرت کی دعا کرتے ہیں؟ اور کیا نہیں معلوم کہ خلق اللہ، اللہ کی امانت ہے؟ اور کیا نہیں معلوم کہ اللہ کی امانت میں ظل اللہ یعنی حاکم وقت خیانت نہیں کرسکتا؟ صورت حال یہ ہے تو پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ شاہزادۂ بلند اقبال نے اللہ کی امانت میں خیانت کیوں کی؟ ظل اللہ نے کافر کو خلق اللہ کی چٹائی سے باہر کیوں کردیا؟ اور کافر و مومن میں صرف مومن کی بہبودی کا خیال کیوں رکھا؟

مکتوب دارا شکوہ اور جواب حضرت شیخ محبّ اللہ الہ آبادی کی یہاں گنجایش

نہیں۔ چند سطریں ملاحظہ ہوں۔

مکتوب داراشکوہ

قُلِ اللّٰہُ ثُمَّ ذَرْھُمْ

جامع علوم ظاہری و باطنی، حاویِ مراتب صوری و معنوی، میاں شیخ محبّ اللہ را از محبِّ فقرا دعا و سلام برسد۔ از گرفتنِ صوبہ الہ آباد بیشتر خوش حالی از وجودِ شریفِ ایشان است، ہر کارے و مہمے کہ دراں رفاہیتِ مومنان باشد بہ باقی بیگ اثری نمودہ باشند...

جواب شیخ محبّ اللہ الہ آبادی

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

ملاذِ عارفان و معاذِ جہانیان، عرفاں پناہ، حقائق آگاہ ضابطۂ احکام دینی و حاویِ مراتبِ کشفی و یقینی، عین الانسان و انسان العین، سلطانِ عالمِ صوری و معنوی بر سریرِ سلطانی و منصۂ شہود و حقائق جلوہ گر باشند... الحمدللہ کہ شاہزادۂ این زمانہ صالح و عارف ربانی اند۔ و چوں ایں صوبہ بنامِ بندگان آں جنابِ عالی شد بساطِ شکرِ سابق مضاعف گشت۔ الحمدللہ کہ ماحکوم عارف سبحانی شدیم... و نیز شرفِ صدور یافتہ بود کہ ہر امرے کہ دراں رفاہیتِ مومناں باشد بہ باقی بیگ می گفتہ باشی۔ جزاک اللہ احسن الجزاً... حق آں ست کہ اندیشۂ رفاہیتِ خلق خدا دامن گیرِ خاطر حکام باشد۔ چہ مومن وچہ کافر کہ خلق خدا ودیعت خداست۔ و سند ایں کہ صاحبِ آں مقام بہ ہر کسے صالح و فاجر و مومن و کافر مترحّم باشد ترحّم رسولؐ خدا است۔ چناں کہ بیاں یافتہ در فتوحات و وارد است در قرآن۔ وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ بر سبیل عموم مثل ربّ العالمین۔

غالباً افاضۂ رحمت بر ہر کسے تحت مرتبۂ آں باشد۔ و از حالِ بعضے ملائک در قرآن خبر دادہ و گفتہ:

وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِي الْاَرْضِ.

زنارِ ترسا و سبحۂ پارسا سرشتۂ یک رشتہ:

مرزا محمد رفیع سودا فرماتے ہیں:

ہوا جب کفر ثابت ہے یہ تمغائے مسلمانی
نہ چھوٹی شیخ سے زنارِ تسبیح سلیمانی!

اِس شعر کا مطلب خواجہ امام الدین نے مرزا محمد حسن قتیل سے پوچھا تو قتیل نے جواب دیا:

(۱) تمغا بمعنی زرے کہ گزربانان و راہ داران بحکمِ حاکم از تاجران و دیگر راہ گزاران گیرند۔ در استعمال بمعنی سود و نفع۔

(۲) سلیمانی سنگے ست برنگِ کبود کہ درمیانِ آں رگِ سفید باشد کہ آں را زنار می گویند۔

''غرضِ شاعر این ست کہ کفر و اسلام ہر دو دراصل یک است و فرقِ ظاہری نزدیکِ اہلِ تحقیق نا معتبر۔ ہر گاہ کفر ثابت شد، ہماں ثبوتِ کفر ثبوت مسلمانی ست۔ یعنی اسلام عین کفر و کفر عین اسلام است۔ ہر دو از ہم جدا نمی شوند۔ بنوعے کہ زنار از تسبیح سلیمانی منفک نمی تواند شد، ہمیں صورت کفر از اسلام و اسلام از کفر جدا نمی گردد۔ شیخ با ایں ہمہ تقوئ نتوانست کہ زنار از تسبیح سلیمانی جدا سازد۔''

مرزا سودا نے جو کچھ کہا اور مرزا قتیل نے جو کچھ سمجھا، اُس کی ایک مثال یہ ہے کہ داہنا ہاتھ بائیں ہاتھ کو دھوتا ہے اور بایاں ہاتھ داہنے کو دھوتا ہے۔ اِسی طرح اسلام کفر سے اور کفر اسلام سے بے نیاز نہیں۔ رخ کی بہار زلف سے اور زلف کی بہار رخ سے۔ وہ رخ نہیں جس پر زلف شب گوں کا سایہ نہیں۔ وہ ابراہیمؑ نہیں جو صنم

کدے کا پروردہ نہیں۔ وہ زلف نہیں جس کے پاس چاند سا مکھڑا نہیں۔ وہ فرعون نہیں جس کی گود میں موسیٰ نہیں۔ ماحصل یہ کہ اسلام عین کفر اور کفر عین اسلام:

وہ زلف و رخ ہیں ایک ہماری نگاہ میں
بس رنگ کا ہے فرق سپید و سیاہ میں

(صفیر بلگرامی)

یہ مطلع مطلع آفتاب ہے۔ آفتاب آمد دلیل آفتاب۔ دلیل یہ کہ ابجد کے آئینے میں سیاہ سپید ہے اور سپید سیاہ۔ دونوں ۷۶۔ اِس لیے جو سپید وہی سیاہ۔ جو رخ وہی زلف۔ جو اسلام وہی کفر۔ دونوں ایک۔ مگر شرط یہ ہے کہ دوئی کا رنگ باقی نہ رہے۔ دوئی کا پردہ بیچ سے اٹھا دیا جائے!

حاشیہ

☆۔ خان بہادر سید ضمیر الدین احمد مرحوم نے ایک مضمون بہار اُڑیسہ ریسرچ جرنل ستمبر ۱۹۱۸ء میں شائع کیا تھا۔ حافظ سید عبدالرؤف اورنگ آبادی نے اردو میں ایک اچھوتا مضمون ''معارف'' اعظم گڑھ اکتوبر نومبر ۱۹۳۷ء میں شائع کیا تھا۔ خان بہادر مرحوم نے مطبوعہ کتابوں سے اور حافظ صاحب نے فرامین اور قلمی بیاضوں سے مدد لی۔ یہ دونوں مضمون قابلِ قدر ہیں۔

[رسالہ ''سہیل'' گیا۔ خاص نمبر ۱۹۴۰ء]

جنگل کی مہارانی

ایک جنگل میں درختوں کا اپنے دشمنوں سے برا حال تھا۔ برق و باراں دشمن، طوفان و آتش دشمن، آدم زاد دشمن، حشرات الارض دشمن۔ یہ باہر کا حال تھا، گھر کا حال یہ کہ ہر درخت کو سرداری کا دعویٰ تھا۔ خار دار کو بے خار سے بغض اور بے ثمر کو ثمر دار سے بغض۔ اِس آگ کو ہوائیں اور بھڑکاتی تھیں۔

آخر درختوں نے فیصلہ کیا کہ خانہ جنگی اور آفات ارضی و سماوی سے نجات پانے کے لیے ایک بادشاہ کا ہونا ضروری ہے۔ بادشاہت کے لیے نظرِ انتخاب تین پر پڑی۔ زیتون، انجیر اور انگور۔

(۱) پہلے زیتون کو سلطنت پیش کی گئی۔ زیتون نے کہا: سبحان اللہ! اِس مردار سلطنت کے لیے ہم اپنی آبرو کھو دیں؟ ہماری آبرو ہمارا روغن۔ اِسی سے ہمارا بول بالا ہے، فرش سے عرش تک، بنی آدم سے اللہ تک۔ یہ آبرو اللہ کی دی ہوئی ہے، اِس نعمت کو سلطنت نہیں پا سکتی۔ بادشاہت ذلت ہے۔ کفرانِ نعمت کا منہ کالا:

من بندۂ حضرتِ کریم
پروردۂ نعمتِ قدیم
(سعدیؔ)

(۲) تب انجیر کو سلطنت پیش کی گئی۔ انجیر نے کہا: معاذ اللہ! سلطنت کی تلخی موت کی تلخی، شیرینی کو تلخی سے اور ہم کو بادشاہت سے کیا کام؟ حضرتِ عرش نشین سے ہم کو خود ایک نعمتِ خاص مل چکی ہے۔

ہزار آفریں بر من و دینِ من
کہ منعم پرستی ست آئینِ من
(غالبؔ)

(۳) تب انگور کو سلطنت پیش کی گئی۔ انگور نے کہا: وَالتِّيْنِ وَ الزَّيْتُوْنِ۔ قسم ہے انجیر کی اور قسم ہے زیتون کی۔

ثنا می کنم ایزدِ پاک را
ثریا دہِ طارمِ تاک را
کہ خورشید را صورتِ جام ازوست
شراب شفق در خمِ شام ازوست
(ملا ظہوریؔ)

جو بلندی ثریا کو وہی ہماری۔ اس کے دو گواہ، جام خورشید و شفق شام۔ وہ غریب جم ہو یا چشمِ خوباں۔ کسی کو نہ ایسا جام نصیب نہ ایسی شراب نصیب۔ اس کے بھی دو گواہ۔ صبح و شام۔ پس ازل سے ابد تک۔ جس ازل کی صبح نہیں اور جس ابد کی شام نہیں۔ حمد و ثنا کا سزا وار صرف وہ ہے جس نے شفقِ شام کو مے لالہ فام اور خورشیدِ صبح کو ہم شکل جام بنایا اور جس نے ہم کو جنت کا پروانہ دیا۔ وانھٰر من خمر: ۲۶ محمد (۱۵)

کہاں حضرت بے نیاز و بندہ نواز کی جنت اور کہاں اس جنگل کی بادشاہت۔ کہاں ذلت کہاں عزت۔ یہ ذلت ہم کو منظور نہیں۔

ما گدایانِ خیلِ سلطانیم!
شہر بندِ ہوائے جانانیم!
(سعدیؔ)

(۴) زیتون، انجیر اور انگور نے انکار کیا تو سلطنت اُمِ غیلان کو پیش کی گئی۔

اُمِ غیلان مادرِ غول بیابانی یعنی ببول کا درخت جہاں مہا سبھا ہوتی ہے دنیا بھر کے بھوتوں کی پلیدوں کی۔ اِسی اُمِ غیلان کا سپوت خار مغیلان، ببول کا کانٹا۔

سلطنت پیش ہوئی تو اُمِ غیلان نے کہا کہ تاجِ شاہی لاریب اُسی کو زیبا ہے جو ہماری طرح سایہ گستر اور بندہ پرور اور فی سبیل الشیطان خنجر بکف ہو۔ اِس حق سے بادشاہت ہم کو قبول۔

لیکن یاد رہے کہ کل تم نے پھر کسی زیتون، کسی انجیر، کسی انگور کو یاد کیا تو سیاست ہماری اس جنگل کو آگ لگا کر راکھ کر دے گی۔

حشرت الارض نے کہا:

زندہ باد اُمِ غیلان!

[رسالہ ''مہر نیم روز'' کراچی ۱۹۷۰ء]

سپاہی کی بیٹی

دیکھا کہ ایک بُڑھیا چلی آ رہی ہے... ہزار سالہ، تصویرِ آہ و نالہ، خمیدہ کمر، خاک بسر، خانماں برباد، سراپا فریاد، نقش قدم زنجیر پا، دیدۂ عبرت کا توتیا، آنکھیں طاقِ فریدوں کا جواب، مرغ روح رگوں کے جال میں بے تاب۔

اور دیکھا کہ اس بُڑھیا کے ساتھ ایک ماہ دو ہفتہ بھی ہے۔ چودھویں کا چاند لیکن گہن میں۔ یہ دیکھ کر ہم نے بُڑھیا سے پوچھا:

کہاں سے آئی ہے؟ جاتی کہاں ہے؟ قصد ہے کیا؟
یہ اور کون ہے؟ تو کون؟ کیوں ہے یوں دل گیر؟
وہ بولی: حال دلِ خستگاں چہ می پرسی؟
خجل ز عمرِ خودم از حوادثِ تقدیر
من آنم آہ کہ عبرت سراست خانۂ من
سنوح سانحہ ام حشر را کند تعبیر
من آنم آہ کے نامم شدہ غریبِ وطن
شروع قصۂ من می کند ز درد خبیر
من آنم آہ کہ بودم ز انتخابِ زماں
کنوں ببیں بچہ حالم ز گردشِ تقدیر

غریب ماندہ ام و کارواں گزشت و گزاشت
پے کشاکش و پامالِ صغیر و کبیر
بداں کہ گوہرم از فارس است و ترکستان
بپاک طینتیم معترف بود تقدیر
نخست ہمرہِ محمود غزنوی سوے ہند
رسید موکبِ عالیِ من بصد توقیر
سن مسیح بُدہ نہ صد و نود با نہ! (۹۹۹)
اگرچہ کرد شہِ غزنوی بسے تدبیر
نیافت ہیچ شگونِ قیام در حدِ ہند
مرا گرفتہ و برگست صورتِ تقدیر

بڑھیا نے کہا ہمارے حال پر مت جائیو! حال اور ماضی کے بیچ میں ایک گاڑھا پردہ ہے۔ اس پردے کو اٹھا کر دیکھو! ہم کون ہیں؟ یہ ہم سے کیوں پوچھو؟ پوچھنا ہے تو فارس سے پوچھو۔ ترکستان سے پوچھو۔ فارس ہم کو لکھتا ہے، نورِ چشم طول عمرہا۔ ترکستان ہم کو لکھتا ہے، نور دیدہ مدعمرہا۔ نور دیدۂ فارس و ترکستان نے ہندوستان کی صورت اول اول ۹۹۹ء میں دیکھی۔ دیکھی مگر نہیں دیکھی۔ آنکھیں دیکھیں۔ دل نہیں دیکھا۔ دل نہیں دیکھا تو کچھ نہیں دیکھا۔ کیوں نہیں دیکھا؟ وہی ننانوے کا پھیر۔ ۹۹۹ء!۔

یہ اُس وقت کی بات ہے جب محمود غزنوی نام کا ایک پرستار زادہ ہماری پرستاری میں تھا۔ مگر تم غریب ہمارے محمود کو کیا جانو۔ محمود شاگرد تھا برق و سیلاب کا۔ باڑھ آتی ہے آندھی کے پاؤں، بجلی دوڑتی ہے ملک الموت کے پاؤں، باڑھ آنا جانتی ہے، مُڑ کر دیکھنا نہیں جانتی۔ بجلی دوڑنا جانتی ہے، کہیں ٹھہرنا نہیں جانتی۔ برق و سیلاب کا شاگرد رشید بھی ہندوستان میں کبھی ٹھہرا نہیں۔

سپس محمدِ غوری ز فارسم آورد
بہند رخت بینداختم ز لطفِ قدیر

سنِ مسیح ہزار و صد و نود بُد و یک
ز بختِ خود متمتع شدم چو شاہ و وزیر
کشادہ اند ز من صلح و جنگ را صد راہ
کہ فتحِ بابِ سخن بودم از سرِ تسخیر
شدم بہند چو من روشناسِ شاہ و گدا
درے کشود ز من بر رخِ صغیر و کبیر

پھر ۱۱۹۱ء میں دوبارہ آنا ہوا تو ہم نے ہندوستان کی صورت بھی دیکھی۔ دل بھی دیکھا۔ اور دل دیکھا تو سب کچھ دیکھا۔ یہ اُس وقت کی بات ہے جب ہمارے غلاموں میں ایک زریں کمر غلام، محمد غوری نام، ہمارے لیے ہندوستان کا دروازہ کھول چکا تھا۔

ہنوز ساکنِ ہندوستاں بُدم ناگاہ
رسید موکبِ تیمور با شکوہِ کثیر
رواج یافت ہمہ حکم از ذریعۂ من
شد از وسیلۂ من دفترِ شہی تحریر
زبس رسیدۂ ہندوستاں بدم چوں شاہ
گلِ شباب بہندم شگفت بے تاخیر
بوصفِ حسنِ صفاتی کہ داشتم از بخت
سرود زمزمہ منقارِ بلبلِ تصویر!
بہ قصرشہ کہ محلِّ حجاب و صد ادب است
بر آستانِ وزیر و بخانہ ہاے امیر
بجاے گاہ رئیس و شریف و اہلِ ہنر
بہ مامنِ غربا و بہ آشیانِ فقیر
باہلِ سیف، باہلِ قلم، باہلِ صلاح
بہ ہر مکاں کہ رسی بشنوی زمن تقریر

درونِ متقیان جاے گاہِ الفتِ من
برونِ اہلِ علوم از من انتظام پذیر
تمام خلق بدنبالِ من روان و دواں
مگر مرا ہوسِ اہلِ طبع دامن گیر
مدام مسکن و ماواے من دلِ شعرا
کہ بود تربیتم حقِّ این گروہِ کبیر

پھر تو یہ حال ہوا کہ ہندوستان ہمارا کلمہ پڑھنے لگا۔ عاشقانِ با صفا کی صفیں آراستہ تھیں۔ ان صفوں میں شاہ و گدا، اہلِ سیف و اہلِ قلم، اہل صلاح و اہل ہنر سبھی استادہ تھے۔ ہر فدائی اپنا دل ہتھیلی پر لیے منتظر کھڑا تھا۔ مگر نظرِ انتخاب ہماری صرف ایک دل پر پڑی۔ یعنی حضورِ محل کے لیے ہم نے شاعر کا دل چن لیا کیوں کہ یہی وہ بیت الشرف ہے جہاں وحدت میں کثرت اور خلوت میں جلوت کی بہار ہے۔

یہ اُس وقت کی بات ہے جب ہمارے گھر کا ایک پاسبان، صاحب قران امیر تیمور گورگان، شرفِ حضوری کے لیے ہمارے پاس دلّی میں حاضر ہوا تھا۔ امیر تیمور کا بیٹا میران شاہ مرزا، اُس کا سلطان محمد مرزا، اُس کا سلطان ابو سعید مرزا، اُس کا عمر شیخ مرزا، اور اُس کا ظہیر الدین محمد بابر۔

یہ سب خانہ زاد تھے۔ ہمارے قدیم نمک خوار تھے۔ مگر تیغِ ہجر کے گھائل تھے۔ آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل تھے۔ زیارت کو ترستے ہم دلی میں، یہ غریب سمرقند اور کابل میں۔ پھر زیارت ہوتی تو کیوں کر ہوتی؟ اِدھر دلّی کا یہ حال کہ یہاں بھی عرصے سے عشق کا بازار گرم، یہاں بھی شمع اپنے پروانوں کے جھرمٹ میں تھی۔ اللہ اللہ! ہندی پروانوں کا وہ عالم کہ فدائیوں کی فوجیں بہ یک وقت ناپید نہیں ہوتی تھیں۔ شام سے سحر تک۔ اور یہ عالم ایک شب نہیں، ایک ماہ نہیں، ایک سال نہیں، اِسی میں صدیاں گزر گئیں۔

تب ظہیر الدین محمد بابر کابل سے دلّی آیا۔ اور سراج الدین محمد بہادر شاہ دلّی

سے رنگون گیا۔ ہندوستان کو آلِ تیمور سے وہی نسبت ہے جو کوہ رقیم کو اصحابِ کہف سے۔ اس غار میں اصحابِ کہف کو اور دلّی میں آلِ تیمور کو نیند آ گئی۔ ایسی نیند آئی کہ مسلسل تین سو برس کے بعد آنکھ کھلی۔ جب آنکھ کھلی تو کسی نے اِن کو پہچانا نہیں! شہر افسوس[1] نے اصحاب کہف کو نہیں پہچانا۔ شہر رنگون نے آلِ تیمور کو نہیں پہچانا۔ شہر رنگون بھی آلِ تیمور کے لیے آج تک شہرِ افسوس ہے!

بابر کابل سے دلّی آیا۔ بہادر شاہ دِلّی سے رنگون گیا۔ کابل کی بہار ہنستی ہوئی دلّی آئی۔ دلّی کی بہار روتی ہوئی رنگون گئی۔ قسم ہے کابل، دلّی اور رنگون کی کہ ہندوستان میں آل تیمور کا آنا شباب کا آنا تھا اور ہندوستان سے جانا شباب کا جانا تھا۔ زلیخا کہ عہد جوانی گزشت!۔

مپرس باز چہ شد حاصلم ز کشتِ اُمید
مجوی راز درونم کہ می شوی دل گیر
ہنوز چہرۂ من رنگِ ارغوانی داشت
ہنوز بود دو گیسوے من سیاہ چو قیر
نظر زمانہ فریب و لبم رواں افزا
کماں دو ابروے پیوستہ قامتم چوں تیر
کہ ناگہاں زکمیں گاہ جست و زد ناوک
بسینہ ام قدر اندازِ لشکرِ تقدیر

افسوس کہ دیکھنے کی چیز تم نے دیکھی نہیں۔ زلیخا کا خواب یا ہمارا شباب، وہ بھی رنگین۔ جوانی میں ہمارے پاس کیا نہیں تھا؟ تم ہوتے تو دیکھتے۔ نگہِ سامری فن، سحرِ بنگالہ کا جواب، ابروے پیوستہ کمان کا جواب، قامت بالا تیر کا جواب، زلفِ مشکینِ ظلمات کا جواب، لبِ جاں بخش آبِ حیوان کا جواب، چہرۂ لالہ رنگ مے ارغوانی کا جواب، گیسوے شب رنگِ رخِ لیلیٰ کا جواب!

اِن سب کا جواب ہمارے پاس موجود تھا، لیکن مارِ آستین کا کیا جواب؟

دشمنِ دوست نما کا کیا جواب؟ اس عیاری کا کیا جواب کہ قدر انداز نے تیر چھوڑا تو چوروں کی طرح چھپ کر۔ اور پھر ایسا تیر جو وہاں کمان سے چھوٹا اور یہاں دل میں آکر ترازو ہوگیا۔ سچ پوچھو تو اِسی عیاری نے ہم کو مار ڈالا!

رسید موسم نکبت، خمید نخل قدم
دمید موے سپید و وزید بادِ صریر
نماند بخت نہ دولت نہ قدردانِ سخن
ز حادثات مرا چرخ کرد چوں خود پیر
یہ سن کے میں نے کہا اے ادا طراز یہ کیا
کہ تو نے مجھ کو مفصّل سنائی سب تقریر
مگر وہ پیچ دکھائے کہ کچھ نہ حال کُھلا
سُنے جو نام تو پائے نشان کچھ یہ حقیر
پکاری رو کے مکن جستجوے نام کہ نیست
بجز ذلیل و حقیر و ظہیر و بے توقیر
بریدہ اند چو سلمان فارسی ز وطن
چو شعر خوشترِ سلماں بہند گشتہ شہیر
عزیز اہلِ خرد، فارسی بود نامم
اگرچہ در جہلا گشتہ ام ظہیر و حقیر
پُر از علومِ درونم چو سنگ ہا ز شرار
پُر از فنوں دلِ من ہمچو ذوق در انجیر
مرا کہ فاتحۃ الباب خواندہ اند، چہ حظ
کہ بستہ اند برویم درِ ہمہ تدبیر
مرا کہ گوہرِ شہوار گفتہ اند، چہ سود
کہ ریختہ خاکِ مذلت بفرقِ من تقدیر

یہ داستانِ غم سن کر ہم نے بڑھیا سے نام پوچھا تو اُس نے کہا اِس کو سلمان سے پوچھو۔ ہم بھی فارسی، سلمان بھی فارسی۔ قسمت کی ترازو میں سلمان فارسی ہے۔ اور فارسی سلمان! ثبوت یہ کہ:

بریدہ اند چو سلمان فارسی ز وطن

کل تک ہمارا نام تھا درِشہوار۔ آج ہمارا نام ہے ذلیل و خوار۔ کل تک محبوب چمن۔ آج مردود چمن۔ کل تک عزیز وطن! کیوں؟ اس لیے کہ کارواں آگے بڑھ چکا۔ عاشقانِ با صفا سب مر مٹے۔ اب کوئی ناز بردار نہیں رہا۔ جس نے شق القمر نہ دیکھا ہو وہ ہمارا دل دیکھ لے۔ وہاں ایک چاند کے دو ٹکڑے یہاں ایک دل کے سو ٹکڑے۔

تب ہم نے فارسی سے پوچھا کہ تیرے ساتھ یہ اور کون ہے؟

وہ بولی، آہ ہمیں دختِ خواندہ ام اُردوست
چو من بعینِ جوانی شدہ ز حادثہ پیر
مدام مونسِ جانِ من است و قوتِ روح
من آفتاب منیرم چو اوست بدرِ منیر
چو من بہند رسیدم شدہ ولادتِ او
پس از حکومتِ بابر بلطف حیِّ قدیر
بہ عہد شاہ جہاں نامزد بہ اردو شد
ز ربط لشکر و آمیزشِ صغیر و کبیر
ز ہر کہ رابطۂ اولین نمود منم
اگرچہ از عربی ہم شدہ است لذت گیر

نورِ دیدۂ فارس نے جواب دیا کہ اِس نے ہمارا دودھ پیا ہے۔ یہ ہماری چہیتی ہے، راج دلاری ہے، نین سکھ ہے، گدڑی کا لعل ہے، عصائے پیری ہے، سپاہی کی بیٹی ہے، سپاہی کی جان ہے۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ میر انیس کی فیاضی نے یہی خطاب تلوار کو بخش دیا۔

سپاہی کی بیٹی اردو بازار میں پیدا ہوئی۔ اُس کی آنکھ تلواروں کی جھنکار سے کھلی۔ اُس کا عقیقہ بھی اردو بازار میں ہوا۔ نام نکالنے کے لیے کلام اللہ کھولا گیا تو اللہ کا الف نکلا۔ ایک تو اس الف کی برکت، پھر جائے ولادت کی رعایت اور پھر شجرے کی حفاظت، یہی وجہ تھی کہ سپاہی کی بیٹی کا نام اردو رکھا گیا۔ یہ اُس وقت کی بات ہے جب سدا سہاگن دِلّی بارھویں مرتبہ دلہن بنی تھی۔ اور میر یحییٰ کاشی نے اُس کے سہاگ کی تاریخ کہی تھی: ''شدشاہ جہاں آباد از شاہ جہاں آباد''۔ ۱۰۵۸ ہجری... اب جانے بھی دو اِس قصے کو۔ رات کی بات گئی رات کے ساتھ۔

سنا یہ حال جو میں نے کہا بصد حیرت
کدھر کا قصد ہے تم کس طرف کو ہو رہگیر
وہ بولی: تنگ شدہ بر من ایں فضاے جہاں
درے نماند کہ مانم ز سہم گوشہ پذیر
نہ آں زمان نہ آں مردماں نہ آں نازش
سخن شناس و نہ اہلِ سخن نہ آں تاثیر
کجا روم چہ کنم بر درِ کہ رُو آرم!
کہ نیست یار و مددگارِ ایں نزار و حقیر
گہے بشرق شدم گہ بہ غرب کردم رُو
نبود جاے و ولم کرد آخر ایں تدبیر
کہ غرق بحر شویم و چو عمر خوش گزریم
ز لطمہ ہاے بلیّات لجۂ تقدیر
یہ کہہ کے صدمہ ہوا فارسی کے دل کو کمال
جگر کو تھام کے بے ہوش ہوگئی دل گیر
کمال ضعف سے پھیلا دیے جو ہاتھ اور پاؤں
سر اُس کا گود میں اردو نے رکھا بے تاخیر

تب ہم نے خانماں برباد فارسی سے پوچھا کہ اِس وقت تو جاتی کہاں ہے۔ اس نے کہا دریا میں ڈوبنے۔ بات یہ ہے کہ یہاں سے ہمارا دانہ پانی اٹھ گیا۔ ہماری صاحب قرانی تختِ طاؤس کی طرح فسانہ ہوچکی۔ ہماری نورجہانی اور جہاں گیری اور عالم گیری پر ایمان لانے والے مرمٹے۔ اب زمین دشمن، آسمان دشمن۔ شمعِ انجمن سے نکال دی گئی۔ بھری محفل میں یہ رسوائی سچ پوچھو تو ڈوب مرنے کی بات ہے۔ ڈوب مرنے کا نسخہ ہم کو غالب کے سفینے سے ملا۔ بڑی بات اِس نسخے میں یہ ہے کہ سائیدن، کوفتن، بیختن، آمیختن یعنی جنازے اور مزار کا کھٹ راگ نہیں:

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کہیں جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

اتنا کہنے پائی تھی کہ فارسی شدت غم سے بے ہوش ہوگئی، اُردو نے اُس کا سر اپنی گود میں لے لیا، کہنے لگی کہ اللہ رے انقلابِ زمانہ! مسیحا آج خود بے ہوش ہے۔ اور ایک چلو پانی نہیں ملتا:

کل جو اُٹھتے تھے بٹھانے کے لیے
آج بیٹھے ہیں اُٹھانے کے لیے

(صفیر بلگرامی)

ہم نے اُردو سے پوچھا کہ تو یہاں کس کو جانتی ہے؟ اس نے کہا:

فصاحت اور بلاغت حقیر زادیاں ہیں
پسند آئی نہیں خدمتِ انیسؔ و دبیر
صفیرؔ ایک ہیں حضرت دبیرؔ کے شاگرد
ہر ایک اُن سے ہے واقف امیر ہو کہ فقیر
میں روشناس ہوں ان کی مجھے ہے اب تک یاد
وہ اُن کے شعر وہ لکنت بھری ہوئی تقریر
یہ کہہ کے سوچ کے بولی، ادھر تو دیکھیں آپ!
تو مسکرا کے کہا میں نے، ہاں میں ہی ہوں صفیر

یہ سن کے خوش ہوئی ایسی کہ رنج بھول گئی!
پھڑک کے کہنے لگی، اب کھلی مری تقدیر
بسانِ نقشِ قدم فارسی جو تھی سرِ خاک
پکاری دیدۂ حیرت کو کھول کر دل گیر
توئی صفیرِ سخن سنج اے خجستہ صفات؟
توئی کہ ہست کلامت ز حسن عالم گیر؟
توئی کہ داد مرا نامِ تو ز رنج نجات؟
زہے نشاط و زہے وقت و حبذا تقدیر!
بگو کہ در چہ خیالی؟ چہ شغل ہا واری؟
بگو بگو کہ پے من چہ می کنی تدبیر؟

اردو نے کہا تم لاکھ چھپاؤ۔ ہم پہچان گئے! حضرت موسیٰ کی قسم پہچان گئے! تم صفیر ہو! صفیر ہو! صفیر!

صفیرؔ کا نام سننا تھا کہ بے ہوش کو ہوش آ گیا۔ فارسی نے آنکھیں کھول دیں۔ پوچھا سچ مچ صفیرؔ تمھیں ہو؟ کلیمِ وقت تمھیں ہو؟ صفیرِ سخن آرا تمھیں ہو؟ توئی کہ ہست کلامت زحسن عالم گیر؟ نہیں۔ تم صفیر نہیں ہو سکتے! صفیر! ہم پر مرتا ہے۔ تم صفیر ہو تو وہ چاہت کہاں گئی؟

مگر ور سرت شورِ لیلےٰ نماند؟

ہم نے کہا تیرا صفیرؔ تجھ پر اب بھی مرتا ہے۔ مگر وہ کفر کی موت مرنا نہیں جانتا۔ ڈوب مرنے کا نسخہ نہیں جانتا۔ مذہب یاس اُس کا مذہب نہیں۔ رات سے دن ہوتا ہے اور اندھیرے سے اجالا۔ اچھا۔ ہم سے ایک بات سن:

زمانہ آج سرِ نو ہے محوِ آرایش
جہان آج طراوت سے ہے بہشت نظیر
ہماری قیصرِ ہند آبروے تاج و نگیں
شہِ اریکۂ انگلینڈ آفتاب سریر

پچاس سال ہوئے اُن کو تخت پر بیٹھے
ہے اِس خوشی کا زمانے میں ذکر عالم گیر
کہ فروری کے مہینے کی سولھویں تاریخ
اِس انتظام کی خاطر ہے ٹھہری بے تاخیر
ہمارے آرہ میں سامان ہے وہ کچھ موجود
کہ اور جا کی ہوس اب نہیں ہے دامن گیر
کلکٹری کا جو امنہ ہے سج کے ہے تیار
وہاں تہیۂ دربار ہے بحسنِ کثیر
اِدھر ہے کثرتِ مردم اُدھر ہے کثرتِ فکر
چلے ہی آتے ہیں مضمون تازہ جیسے بھیر
اِسی سبب سے ہوئی قافیوں میں بھی تکرار
پولس کا دستِ تحکم بھی اِس جگہ ہے قصیر
تمام فرش ہے مانندِ صفحۂ قرطاس
کہ جس پہ نظم ثریا مثال ہو تسطیر
تمام خطۂ انگلینڈ و گوشہ گوشۂ ہند
اسی نشاط پہ مامور ہے بصرفِ کثیر
نہ پوچھ حسن جو کلکتے پر ہے ان روزوں
کہ ویسرائے کا مسکن ہے اور مقامِ سریر
نہ پوچھ جشن جو لندن میں ہے مسرت زا
کہ جاے قیصرِ ہندوستاں ہے خلد نظیر
بٹیں گے خلعت و انعام بھی خطاب[☆۲] کے ساتھ
یقین ہے کہ غنی ہوں گے اب تمام فقیر
پہنچ گئے جو تم اُس جلسے میں تو دیکھیو پھر
ملا وہ کچھ کہ کہیں لوگ، واہ ری تدبیر!

یہ ۱۸۸۷ء ہے۔ فروری کی آج سولہ ہے۔ ۱۸۳۷ء میں ملکہ وکٹوریہ تخت پر بیٹھی تھی۔ تخت نشینی کو آج پچاس سال ہوئے۔ اُسی کا جشن ہے۔ اِس ملک میں بھی، سات سمندر پار بھی گھر گھر دیوالی ہے۔ گھر گھر چراغاں ہے۔ لندن میں، کلکتہ میں، آرہ میں۔ ملکہ وکٹوریہ کا دربار ہے۔ خاص نہیں، عام ہے۔ تو بھی چلی چل:

پھڑک گئی یہ سخن سنتے ہی وہ صورتِ چشم
شگون نیک دکھانے لگی اُسے تقدیر
وفورِ شوق میں اک بار کھل گئیں باچھیں
پکڑ کے ہاتھ کو بولی "بیا بہانہ مگیر"
تو شاعری و سخن من، سخن رس آں ممدوح
حبیب من شود ایں درد را بکن تدبیر
نہ مونسے نہ رفیقے نہ ہمدمے دارم
وسیلتے نہ معینے نہ دست و نے تدبیر
بدست تست ہمہ احتشام من اکنوں
ز مردمی بنما دستگیریِ منِ پیر
سیارگاہ معلائے اُو مرا برساں
بحضرتش بکن ایں عرض از زبانِ حقیر
چہ شد گناہ ز من اے پناہ اہلِ زماں
چہ شد ز دخترم اردو بحضرتت تقصیر؟
ز آستان تو مارا چرا بدر کردند؟
اگر گناہ نمودیم، عذرِ ما بپذیر
شہاں بدہر چو بر جائے خویش عید کنند
بخلق بذل کنند و رہا کنند اسیر
چناں کہ وقتِ خطابِ جنابِ قیصر ہند
رہا شدند اسیرانِ واجب التعذیر

من اسیر بلا ہاے بے پنہ را نیز
اگر ز لطف رہائی دہی، زہے تقدیر
بحال من نہ کنی رحم اگر، بر اُردو کن
کہ در شباب نمودہ است آسائش پیر
شہاں بپاس سخن ہاے خویش مشہور اند
عزیز کردۂ خود را مکن ذلیل و حقیر!

سراپا فریاد فارسی نے کہا ہم کو وکٹوریہ سے بہت کچھ کہنا ہے کہ ہمارے بچپن میں ایک بادشاہ تھا، اُس کے محل سے ایک سونے کی زنجیر لٹکتی تھی۔ ہماری جوانی میں ایک بادشاہ تھا۔ اُس کے محل سے بھی ایک سونے کی زنجیر لٹکتی تھی۔ عدلِ جہاں گیری عدلِ نوشیروانی کا جواب تھا۔ اے ملکہ! تیرے راج میں بڑا اندھیر ہو رہا ہے۔ ۱۸۳۸ء میں لارڈ ولیم بینٹنک نے فارسی کو سولی دے دی۔ ۱۸۷۱ء میں لارڈ نارتھ بروک نے اردو کو سولی دے دی۔ ہندوستان فریادی تھا۔ فریادی کی زبان تک کھینچ لی گئی۔ دہائی نوشیرواں کی، دہائی جہاں گیر کی! وہ سونے کی زنجیر کیا ہوئی؟ اے ملکہ! غضب ہے کہ:

رسائی زمانے کی ہو تیرے گھر میں
نہ پہنچے تو میری خبر تک نہ پہنچے!
(منیر شکوہ آبادی)

اے ملکہ! سن ستاون نے تجھ کو قیصر ہند کیا، اِس خوشی میں تو نے قیدیوں کو رہا کیا تھا۔ آج پھر جشنِ قیصری ہے۔ اِس قید فرنگ سے ہم کو بھی آزاد فرما۔

اے ملکہ! تیری طرح ہم بھی کبھی ملکہ تھے۔ تیرے ہاتھ میں شمشیر ہے۔ ہمارے ہاتھ میں قلم تھا... دشمن کہتا ہے کہ یہ دعویٰ باطل۔ ہم کہتے ہیں: ''ولیکن قلم در کفِ دشمن است!''۔

اے ملکہ! فارسی اگر مجرم تھی تو اردو سے کیا تقصیر ہوئی تھی؟ اے ملکہ! تو نے اردو کو پہچانا نہیں۔ اردو تیغِ ہندی ہے اردو شاہ جہانی تحفہ ہے۔ آگرے میں تاج محل اور

ہندوستان بھر میں اردو شاہ جہانی تحفہ ہے۔ اے ملکہ! افسوس کہ تو نے اِس شاہ جہانی تحفے کی بھی قدر نہ کی!

اے ملکہ! تیرا فرمان تھا کہ سپاہی کی بیٹی کے واسطے فورٹ ولیم خالی کر دو۔ پھر فرمان ہوا کہ سپاہی کی بیٹی فورٹ ولیم خالی کر دے:

در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا
جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا

(غالب)

اے ملکہ! الف اپنے ملک کا بادشاہ ہے۔ کیوں بادشاہ ہے؟ بادشاہوں کی زبان ایک ہوتی ہے۔ الف کی زبان ایک ہے۔ اسی حق سے الف حروف تہجی کا بادشاہ ہُوا۔ اے ملکہ! تیری زبان بھی الف کی زبان کیوں نہ ہوئی؟ اردو کو نظروں سے گرانا تھا تو آنکھوں پر بٹھایا کیوں تھا؟

حضرت بلقیس زمانی کو سلیمانی مبارک! مگر فارسی کا آفتاب غروب ہو چکا۔ پھر کون کہتا ہے کہ تیری سلطنت میں آفتاب غروب نہیں ہوتا؟ حضرت مریم زمانی کو اردو دانی☆[۳] مبارک! مگر اردو کو سولی دے دی گئی۔ پھر کون کہتا ہے کہ تیرے راج میں خون ناحق نہیں ہوتا؟

فارسی کی یہ فریاد سن کر ہم نے ملکہ وکٹوریہ سے فریاد کی۔ اے ملکہ! سوہن و گنگ و جمن کی طرح ہندوستان میں تیرا فیض بھی عام ہے:

مگر عجب ہے تو اِس کا کہ اے سپہر نشاں!
زبانِ ہند میں کس واسطے ہوئی تغئیر
یہ فارسی ہے، یہ اردو ہے تجھ سے داد طلب
کہ تیرے وقت میں کیوں گھٹ گئی مری توقیر
نہیں ہے فارسی اِس وقت تجھ سے یہ خواہاں
کہ ہو مرے لیے اجرا و نشر کی تدبیر

مگر یہ اردوے پُرمغز جس میں غیب سے ہے
ہر اک زبان کے انداز و طرز کی تخمیر
ہوئی ہے کس لیے دور آستانِ رحمت سے
کہ خاص تو نے ہی اِس کی بڑھائی تھی توقیر
رموزِ مصلحتِ خویش خسرواں دانند
میں تیرے رمز کی کس طرح سے کروں تحقیر
مگر عجب مجھے آتا ہے اس سے اے سلطاں
جسے عزیز کرے تو، وہ یوں ہو زار و حقیر
کسی زبان میں ہندوستاں کی یہ وسعت
نہیں ہے اور نہیں ہے کہ سب ہیں اِس سے خبیر
امیدوار ہوں میں بھی کہ جشنِ جوبلی میں
جہاں بڑھائے تو اہلِ حقوق کی توقیر
ذلیل کردہ تری چاہتی ہے اردو بھی
عزیز کر اِسے اے مالکِ نگین و سریر
رواں رہیں ترے احکام ہند میں دائم
زبان اردوے پُر مغز میں بفضلِ قدیر
پچاس سال مبارک سریر آرائی
صدی کی سال گرہ بھی ہو یوں ہی جشن پذیر
جو کچھ دے بذل ہے، پر میں ہوں طالب اُردو
صلہ قصیدے کا اپنے یہ چاہتا ہے صفیر

صفیر بلگرامی نے جس وقت یہ قصیدہ کہا تھا، اُس وقت آرہ میں خانہ جنگی تھی، اِس بات پر کہ ملکہ وکٹوریہ کا نمائندہ اِس ضلعے میں کون ہے۔ جج کہتا تھا ہمارے ہوتے کلکٹر کوئی چیز نہیں... کلکٹر کہتا تھا۔ ''ناؤ! ناؤ! کتنے بال؟ ججمان جی! اتنا گھبراتے کیوں

ہو؟ مونڈے مانڈے آگے آئیں گے!'' یعنی ذرا اور بار ہونے دو، اُس وقت دیکھ لینا کہ ملکہ کا نمایندہ کون ہے!

بات زیادہ بڑھی تو گورنمنٹ نے فیصلہ کیا کہ ضلعے کا مکھیا کلکٹر ہے۔ جج مکھیا نہیں ہوسکتا۔ آرہ میں اُس وقت اے بی پاور کلکٹر تھے۔ ایک تو ملکہ کی پنجاہ سالہ جوبلی، پھر جج کے مقابلے میں میدان مار لینے کی خوشی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شب پنج شنبہ ۱۶ فروری ۱۸۸۷ء کو آرہ میں جلوس اِس شان سے نکلا گویا خود پاور صاحب کی برات دلہن کے دروازے لگ رہی ہے! سڑکوں پر جابجا محراب، جلوس میں پیادے سوار، ہاتھیوں کی قطار، نقیب عصا بردار، نالکی پالکی، دیپک مہتابی، بینڈ شہنائی، حسینوں کے جھرمٹ میں ایک تختِ رواں۔ تختِ رواں گویا موجِ رواں۔ اِس تختِ رواں پر ایک طرف سیّدنصیرالدین، دوسری طرف لطیف عالم اور بیچ میں نوشاہ یعنی خود پاور صاحب کلکٹر!

(۱) سیّد نصیر الدین خلف مولوی سیّد فرزند علی رئیس نیورہ ضلع عظیم آباد۔ سیّدنصیر الدین کے دو بھائی اور دو بہنیں۔ بڑے بھائی سیّد فخر الدین، چھوٹے بھائی آنریبل جسٹس سیّد شرف الدین کلکتہ ہائی کورٹ۔ ایک ہمشیر کی شادی نواب بہادر سیّد امداد امام اثرعظیم آبادی سے ہوئی اور دوسری ہمشیر کی شادی خان بہادر سیّد ظہیر الدین سے ہوئی۔ جشنِ جوبلی ۱۸۸۷ء کے بعد ہی مولوی سیّد نصیر الدین ڈپٹی کلکٹر ہوئے۔

سیّدنصیر الدین جہان آباد ضلع گیا میں سب ڈویژنل افسر تھے کہ بھوپال میں بھونچال آیا اور وزیر بھوپال نواب عبدالجبار اپنے پرائیوٹ سیکریٹری ابوالقاسم کے ساتھ وہاں سے دامن جھاڑ کر کلکتہ چلے آئے۔ نواب سلطان جہاں بیگم نے گورنمنٹ بنگال کو خط لکھا کہ ہم کو نواب عبدالجبار کی دیانت وسطوت کا آدمی درکار ہے۔ بنگال گورنمنٹ نے تین نام پیش کیے:

۱۔ نواب سیّد محمد آزاد۔☆۴ ساکن ڈھاکا بنگال۔
۲۔ مولوی سراج الحق ڈپٹی کلکٹر۔☆۵ ساکن استھاواں ضلع عظیم آباد۔
۳۔ مولوی سیّدنصیر الدین ڈپٹی کلکٹر۔ ساکن نیورہ ضلع عظیم آباد۔

تب بیگم بھوپال نے اپنے معتمد مولوی غلام قادر کو ہارون الرشید کے بھیس میں بھوپال سے روانہ کیا کہ چپکے سے اِن تینوں کو دیکھ آؤ کہ کون کیسا ہے۔ اتفاق یہ کہ مولوی غلام قادر ساکن ہوگلی بنگالہ عرصے تک بہار شریف ہائی اسکول میں مدرس رہ چکے تھے، اس لیے بھوپال سے تیر کی طرح یہ بہار شریف پہنچے اور خلوت میں احباب خاص سے اپنے آنے کی حقیقت ظاہر کردی۔ بہار شریف نے کچھ سمجھ بوجھ کر اپنا ووٹ نیورہ کو دیا۔

اس کے بعد مولوی غلام قادر نے ہارون الرشیدی دورہ شروع کیا اور تینوں قلندروں کی زیارت کی۔ دیکھا کہ نواب سیّد محمد میں قصائدِ عرفی کی تمکنت، اور مولوی سراج الحق میں مسدس حالی کی سادگی، اور مولوی سیّد نصیر الدین میں دیوان حافظ کی بہار ہے۔ چنانچہ یہ بہار جہان آباد سے بھوپال پہنچی۔ سیّد نصیر الدین☆[۲] بھوپال پہنچتے ہی نصیرالمہام ہوئے۔ کچھ دنوں کے بعد بورڈ آف ریونیو بنگال کے جونیئر سیکریٹری ہوکر کلکتے چلے آئے۔ پھر کلکتے سے دوبارہ بھوپال گئے۔ اور ۱۹۱۱ء میں وہیں پیوندِ خاک ہوئے۔

(۲) محمد لطیف عالم خلف قاضی محمد ظہور عالم رئیس آرہ۔ کلکٹر شاہ آباد کی کوٹھی دراصل قاضی محمد ظہور عالم کی کوٹھی ہے۔ گورنمنٹ نے یہ کوٹھی قاضی صاحب سے ۳۵ ہزار میں خریدی تھی۔ قاضی ظہور عالم کا ایک دوسرا مکان تری محلّہ میں آرہ ٹاؤن اسکول کی پشت پر تھا۔ اُس زمین پر سیّد شاہ محمد مسعود ڈپٹی کلکٹر نے مدرسۂ وحیدیہ کی عمارت اُٹھائی۔

جشن جوبلی ۱۸۸۷ء کے بعد ہی قاضی لطیف عالم ڈپٹی کلکٹر ہوئے۔ ۱۹۰۸ء میں قبل از وقت پنشن لی۔ لیکن پنشن کا ایک پیسا زندگی بھر برآمد نہیں کیا۔ اور اِس طرح ۳۲ ہزار روپے چھوڑ دیے۔ خیال یہ تھا کہ پنشن کا روپیہ لینے والا (سرکار کے اقبال سے) بہت جلد مر جاتا ہے۔ مگر بقول صبا لکھنوی:

موت کس پردہ میں آئے دیکھیے!

قاضی لطیف عالم کو اپنے لڑکے نظیر عالم سے عشقِ یعقوبی تھا۔ نظیر عالم کی

شادی سکینہ خاتون سے بہار شریف میں ہوئی تھی۔ شادی کے چند ماہ بعد دو شنبہ ۱۱رفروری ۱۹۲۹ء کو لطیف عالم اور نظیر عالم ایک تار پاکر بانکی پور سے بہار شریف پہنچے۔ اُسی شام کو رمضان کا چاند ہوا۔ چاند دیکھ کر یہ دونوں اپنے موٹر پر بانکی پور کے لیے روانہ ہوئے۔ راستے میں ملک الموت نے ابراہیم ڈرائیور کو دھکا دے کر نیچے گرا دیا اور موٹر اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ موٹر میں اب تین شخص تھے۔ عاشق و معشوق اور ملک الموت!... ملک الموت نے موٹر کو درخت سے ٹکرا دیا۔ لطیف عالم کو کسی کی نظر کھا گئی۔ نظیر عالم کو اُس کی جوانی کھا گئی۔ عاشق و معشوق کی جان ایک ساتھ نکلی، کیوں ساتھ نکلی؟

اے بولائے تو تولاے من — از خود و از غیر تبراے من
عشق تو سرمایۂ سوداے من — گر بشگافند سراپاے من
جز تو نیابند در اعضاے من

(محمد باقر صحبتؔ شیرازی)

رہے نام اللہ کا! آج سیّد نصیر الدین نہیں۔ قاضی لطیف عالم نہیں۔ اے بی پاور نہیں۔ جشن جوبلی ۱۸۸۷ء میں یہ تینوں رات کے وقت آرہ میں تختِ رواں پر نکلے تھے۔ آج وہ تخت رواں بھی نہیں۔ موجِ فنا اِن تینوں کو تختِ رواں کی طرح خدا جانے کہاں بہا لے گئی۔ رہے نام اللہ کا!

طالب و مطلوب میں بھی فراق ہو چکا۔ مطلوب کون؟ اردو! طالب کون؟ صفیر بلگرامی:

جہاں تک ہند میں ہے وصفِ میرؔ و مدحتِ مرزاؔ
جہاں تک آتشؔ و ناسخؔ کا ہے آفاق میں چرچا
جہاں تک ذوقؔ و غالبؔ کا سخن ہے انجمن آرا
جہاں تک لطفِ اردو کو ہے موقع اور بڑھنے کا
مبارک جشن جوبلی قیصرِ ہندوستاں کو ہو
خوشی اِس کی صفیرِ طالبِ اردو زباں کو ہو

طالب صادق کی پہچان یہی ہے، وہ اپنی نمود نہیں چاہتا۔ وہ چاندی سونا نہیں مانگتا، موتی مونگا نہیں مانگتا، فنا فی المطلوب صرف اپنے مطلوب کو مانگتا ہے۔ صفیر بلگرامی بھی اپنی لیلیٰ کا مجنوں تھا۔

مجنوں مر گیا۔ لیلیٰ جیتی ہے۔ لیلیٰ جیتی ہے تو مجنوں بھی جیتا ہے۔ مجنوں مر نہیں سکتا۔ مجنوں زندۂ جاوید ہے۔ ایک مجنوں مرتا ہے، دوسرا سامنے آتا ہے۔ ایک مجنوں کی خاک سے ایک ہزار مجنوں اٹھتے ہیں۔ پھر کون کہتا ہے کہ مجنوں مر گیا؟ مجنوں مرنا چاہے بھی تو ملک الموت آ کر پلٹ جائے گا۔ لیلیٰ باؤلی نہیں۔ بڑی سیانی ہے۔ جانتی ہے کہ لیلیٰ کی لالی مجنوں تک! مجنوں نہیں تو لیلیٰ کہاں؟ مجنوں را ''بچشم لیلیٰ'' بایددید! لیلیٰ اپنے مجنوں کو کبھی مرنے نہیں دیتی۔ قم باذنی کہہ کر جھٹ پٹ جلا لیتی ہے۔ لیلیٰ مجنوں رہتی دنیا تک!

لیلیٰ دیوانی نہیں۔ بڑی ہوشیار ہے۔ آنکھ والی ہے۔ داناؤں کی دانا ہے۔ وہ خوب پہچانتی ہے اپنے دشمن کو۔ دشمن کے دوستوں کو۔ آشکارا نہیں خفیہ دوستوں کو۔ دشمن سے رشوت لینے والوں کو۔ دشمن سے سازش کرنے والوں کو۔ دشمن کی چوکھٹ پر سجدہ کرنے والوں کو۔ وہ خوب پہچانتی ہے ابن الوقت کو۔ مار آستین کو۔ مکاروں کو۔ عیاروں کو۔ غداروں کو۔ عیسیٰ روح اللہ تک کو تیس روپے پر بیچ دینے والوں کو۔ چودھویں صدی کے جعفرانِ بنگالہ اور صادقانِ دکن کو...

جعفر از بنگال و صادق از دکن
ننگِ آدم ننگِ دیں، ننگِ وطن
ناقبول و نامید و نامراد
ملتے از کارِ شاں اندر فساد
دینِ او آئینِ او سوداگری است
عنتری اندر لباسِ حیدری است
ظاہرِ اُو از غمِ دیں دردمند
باطنش چوں دیریاں زنار بند

از نفاقش وحدتِ قومی دو نیم
ملّتِ او از وجودِ او لئیم

ملّتے را ہر کجا غارت گرے است
اصلِ اُو از صادقے یا جعفرے است

الاماں از روحِ جعفر الاماں
الاماں از جعفرانِ ایں زماں

(اقبال)

لیلیٰ اِس وقت کہاں ہے؟ جہاں اُس کا تخت ہے! تخت اُس کا کہاں ہے؟ مجنوں کے دل میں! لیلیٰ کون؟ اردو! مجنوں اِس وقت کہاں ہے؟ جہاں اُس کا دل ہے! دل اُس کا کہاں ہے؟ لیلیٰ کی زلفوں میں! مجنوں کون عبدالحق!

لیلیٰ اردو، مجنوں عبدالحق۔ مبارک ہو مجنوں اورنگ آباد سے دلّی آ گیا۔ کیوں آ گیا؟ زلفِ لیلیٰ کا سودا عبدالحق کے سر میں، زلفِ لیلیٰ کی زنجیر عبدالحق کے پاؤں میں۔ زنجیر ہو تو ایسی ہو۔ اور سودا ہو تو ایسا ہو۔ عبدالحق کہتا ہے: انا لیلیٰ... لیلیٰ کہتی ہے: اناالحق۔

حواشی:

۱۔ شہر افسوس (Ephesus) ارضِ روم میں بحرِ ایجین (Aegean) کے کنارے واقع تھا۔ دقیانوس فرعونِ وقت تھا۔ اُسی کے ظلم سے بچنے کے لیے سات آدمیوں نے شہر افسوس چھوڑا تھا۔ اور دو فرسخ کے فاصلے پر ایک پہاڑ کے غار (یعنی کہف) میں پناہ لی تھی۔ اسی نسبت سے لوگ اصحابِ کہف مشہور ہوئے۔ اُن کے ساتھ قطمیر نامی ایک کتا بھی تھا۔ بعد میں اصحابِ کہف کے نام اِس جگہ کندہ کر دیے گئے، اِس لیے اِس کا نام کوہِ رقیم ہوا۔ اصحابِ کہف کے نام تاریخ کی کتابوں میں پائے جاتے ہیں لیکن ناموں میں کچھ اختلاف ہے۔

۲۔ خطاب۔ جوبلی ۱۸۸۷ء میں گورنمنٹ نے مفتی میر محمد عباس، علی اللہ مقامہ اور چند دیگر حضرات کو شمس العلما کا خطاب دیا۔ مفتی صاحب نے اِس کی منطقی گرفت کی یعنی آفتاب ایک ہوتا ہے۔ ایک سے زیادہ نہیں ہوتا۔ پھر بیک وقت اتنے آفتاب کس طرح پیدا ہوگئے۔ شمس العلما کسی ایک کو ہونا چاہیے تھا۔ ایک ہی وقت میں ایک سے زیادہ شمس العلما نہیں ہوسکتے:

گردش چرخ ببیں ، لاٹ وزیر ملکہ
کرد نام دل تن سوختہ شمس العلما

بندہ را نیست سروکار و تعارف با او
نہ منِ غم زدہ را قوتِ تحریک سما
شہرہ چوں یافت نوشتند بمن تہنیتے
کیس شکوہ و عظمت باد مبارک بہ شما
ہم بایں نام ملقب شدہ اشخاصے چند
گرچہ شمس است یکے نے متعدد چوں ما
سلطنت رفت ز اسلام بناوانی ہا
مرز بوم است ہمایون و چو عنقاست ہما

۳۔ اردو دانی ..... حافظ عبدالکریم ساکن آگرہ ملکہ وکٹوریا کو اردو پڑھاتے تھے۔

۴۔ نواب سید محمد آزاد۔۔ انسپکٹر جنرل رجسٹریشن صوبہ بنگال ممبر کونسل بنگال۔ ان کے ظریفانہ مضامین اودھ پنچ، اودھ اخبار اور آگرہ اخبار میں نکلتے تھے۔ دیکھو تاریخ ادب اردو مولفہ رام بابو سکسینہ۔ حصہ نثر۔ ص۱۰۶۔

۵۔ مولوی سراج الحق استھانوی کے بیٹے مسٹر ملک محمود بیرسٹر کلکتہ و پٹنہ۔ ان کے تین لڑکے، انوارالحق، اسرارالحق اور ابرار الحق۔ مولوی انوار الحق مدرس ہائی اسکول بہار شریف۔ مولوی اسرار الحق وکیل بہارشریف۔

۶۔ نصیر المہام سید نصیر الدین۔ ان کے دو صاحب زادے، سید عزیز الدین سپرنٹنڈنٹ پوسٹ آفس، سال رحلت ۱۹۳۸ء اور سید رضی الدین منصف، سال رحلت ۱۹۳۰ء۔

[رسالہ ''ندیم'' پٹنہ۔ بہار نمبر۔۱۹۴۰ء]

گلِ داؤدی

ارضِ فلسطین میں بحرلوط سے پچھم افراتہ☆[1] اور پورب موآب۔ ایک سال افراتہ میں افراتفری تھی۔ لوگ دانے دانے کو محتاج تھے۔ چنانچہ اِسی افراتفری میں کال کا مارا اَلی ملک اپنی بی بی نعومی اور دو بیٹوں محلون و کلیون کے ساتھ افراتہ سے موآب چلا گیا۔ اور ایسا گیا کہ وہیں کا ہو رہا۔ پورب دیس نے اَلی ملک کو پہلے روٹی دی پھر دو گز زمین دی۔

اَلی ملک☆[2] مر گیا تو محلون☆[3] و کلیون☆[4] نے روت☆[5] و عرفہ☆[6] دوشیزگان موآب سے اپنا گھر آباد کیا۔ روت زوجۂ محلون۔ عرفہ زوجۂ کلیون۔ اِنھی چاروں کو دیکھ کر نعومی جیتی تھی۔ اللہ کا دیا کھاتی تھی۔ سکھ کی نیند سوتی تھی۔ مگر بھول گئی تھی کہ بازیِ روزگار بھی کوئی چیز ہے۔ آخر ایک دن آیا کہ بنا بنایا کھیل بگڑ گیا۔

نعومی کو افراتہ چھوڑے ہوئے دسواں سال تھا کہ اَلی ملک کی طرح محلون و کلیون کو بھی موآب کی زمین کھا گئی۔ اور شامِ غربت نے بوڑھی نعومی کی تنہائی، اور نوعروس روت و عرفہ کی بے نوائی، کا ماتم کیا۔ اب گھر میں سناٹا تھا۔ مرد کی صورت نہیں۔ گود میں بچہ نہیں۔ چولھے میں آگ نہیں۔ روٹی کے لیے آٹا نہیں۔ صرف تین عورتیں۔ روت، عرفہ، نعومی، دو کم سن، ایک سن رسیدہ۔ تینوں شمع کشتہ، تینوں ناشاد، نامراد، برباد۔

اب نعومی کو اپنا افراتہ یاد آیا۔ افراتہ کو چھوڑنا ہم کو راس نہیں آیا۔ اس موآب میں رکھا کیا ہے؟ یہاں ہم کیوں رہیں کس کے لیے رہیں؟ کس امید پر رہیں؟ اس بے بسی اور تنہائی سے ہمارا افراتہ اچھا۔ اور کچھ نہیں تو وہاں اپنے لوگ ہوں گے۔ جانی پہچانی صورتیں ہوں گی۔ کوئی صورت نکل ہی آئے گی۔

آخر نعومی نے تن تنہا موآب چھوڑا۔ اور افراتہ کی راہ لی۔ گھر سے کچھ دور گئی تھی کہ دیکھا روت و عرفہ بھی پیچھے پیچھے چلی آ رہی ہیں۔ پوچھا کیوں آتی ہو؟ جواب ملا کہ آپ کے ساتھ جانے کو۔ نعومی نے کہا تم دونوں ہم سے محبت کرتی ہو۔ یہی محبت تو ہمارا دامن چھوڑنے نہیں دیتی، اگرچہ دامن ہمارا تار تار ہے۔ تم ہمارے ساتھ افراتہ جانا چاہتی ہو۔ یہ تمھارا احسان ہے زندہ نعومی پر اور مردہ محلون و کلیون پر۔ مگر دانائی کہتی ہے کہ ہمارے ساتھ مت جاؤ۔ تم اِسی ملک کی رہنے والی ہو۔ موآب میں سبھی تمھارے ہیں۔ افراتہ میں تمھارا کوئی نہیں۔ اِس لیے تم کو جانا چاہیے اُسی گود میں جس گود سے آئی ہو۔ ماں کی گود سے بہتر کوئی گود نہیں۔ یہی گود ہے جس میں نیند آجاتی ہے۔ ماں وہ ہے جو تمھارا دکھ بٹائے گی۔ آنسو پونچھے گی۔ خود بھوکی رہے گی، تم کو کھلائے گی۔

اور سچ پوچھو تو رونا دھونا ہو چکا۔ آگ نے ایک چھپر جلا دیا تو دوسرا چھپر چھانا، اور ہوا نے ایک چراغ بجھادیا تو دوسرا چراغ جلانا کوئی گناہ نہیں۔ تم دونوں ابھی کم سن ہو، یہ سن سوگ لے کر بیٹھنے کا نہیں۔ ہماری بات مانو۔ اپنی ماں کے گھر جاؤ۔ اور بھائی بندوں میں اپنا بیاہ کرو۔ باغ میں پھر بہار آئے گی اور ضرور آئے گی۔ بہار پھولوں سے گود بھر دے گی اور ضرور بھر دے گی۔ اُس وقت اپنی نعومی کو یاد کرنا۔

پھر نعومی نے دونوں کو اپنے گلے سے لپٹا لیا۔ تینوں رونے لگیں۔ خوب روئیں۔ جب نعومی نے دونوں کو الگ کرنا چاہا، روت و عرفہ نے کہا یہ نہیں ہوسکتا۔ سایہ بدن کے ساتھ رہتا ہے۔ ہم لوگ آپ کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتے۔

نعومی گفت: اے دخترانم!

برگردید۔ چرا ہمراہ من بیائید؟ آیا در رحمِ من ہنوز پسران ہستند کہ

برائے شما شوہر باشند؟ اے دخترانم! برگشتہ راہِ خود پیش گیرید۔
زیرا کہ برائے شوہر گرفتن زیادہ پیر ہستم۔ و اگر گویم کہ امیدوارم
وامشب نیز بہ شوہر دادہ شوم و پسران ہم بزایم...... آیا تا بالغ
شدنِ ایشان صبر خواہید کرد؟ و بہ خاطر ایشان خود را از شوہر گرفتن
محروم خواہید داشت؟ نے اے دخترانم! زیرا کہ جانم برائے شما
بسیار تلخ شدہ است۔ چوں کہ دست خداوند بر من دراز شدہ است۔

توارت۔ کتاب روت۔۱ (۱۱۔۱۳)

تب نعومی نے چشم یاس سے آسمان کو دیکھا۔ اِن دونوں کو دیکھا اور کہا:

تم دونوں دیوانی ہو! ہم خود بیوہ۔ اور پاس کوئی لڑکا نہیں۔
اور لڑکا ہونے کا اب سن نہیں۔ اگر سن ہو بھی، اور آج ہی ہماری
شادی ہوجائے، اور آج ہی حمل قرار پا جائے اور وقت آنے پر
دو لڑکے بھی ہوجائیں تو اے دیوانیو! اٹھارہ بیس برس تک، اِن
لڑکوں کے بالغ ہونے تک، تم دونوں آس لگائے یوں ہی بیٹھی
رہو گی؟ ہر صبح اور ہر شام تمھارے دل سے دھواں نہیں اٹھے گا؟

دیوانیو! ہوش کی باتیں کرو! ہم نے دنیا دیکھی ہے۔ تم نے
ابھی کچھ نہیں دیکھا۔ تم دونوں الھڑ ہو۔ زلیخا بسترِ شوہر پر بھی
بے شوہر تھی۔ اِس آغاز کا انجام دنیا جانتی ہے۔

خدا شاہد ہے تم دونوں کے لیے ہمارا دل روتا ہے۔ محلون و
کلیون چل بسے۔ اور اب کوئی امید نہیں۔

نعومی کی بات عرفہ کے دل میں اتر گئی۔ عرفہ نے خیال کیا نعومی سچ کہتی
ہے۔ آگ نے ایک چھپر جلا دیا تو دوسرا چھپر ہم کیوں نہ چھائیں؟ اور ہوا نے ایک
چراغ بجھا دیا تو دوسرا چراغ ہم کیوں نہ جلائیں؟ مگر یہ چھپر چھانا اور چراغ جلانا جب

ہی ہوسکتا ہے کہ ہم اپنی ماں کے گھر چلے جائیں۔ نعومی جو کچھ کہتی ہے ہماری بھلائی کے لیے کہتی ہے۔ اور سچ کہتی ہے۔ ہم کو واقعی اپنی ماں کے پاس چلا جانا چاہیے۔

نعومی کی بات روت کے دل میں نہیں اتری۔ روت نے خیال کیا کہ نعومی کی باتوں میں جھول ہے، کیوں کہ اِس سود میں زیاں ہے۔ اچھائی میں برائی ہے۔ بناؤ میں بگاڑ ہے۔ اور دانائی میں نادانی ہے۔ نعومی کی سادگی دیکھو ہم سے کہتی ہے اپنی ماں کے گھر جاؤ۔ اور چھپر چھاؤ۔ اور چراغ جلاؤ۔ اور بہار کو نیوتہ بھیجو۔ اور باغ میں جھولا ڈالو۔ اور پھولوں سے اپنی گود بھرو۔ اِسی کا نام ہے سبز باغ! ہم ہرگز اپنی ماں کے گھر نہیں جائیں گے۔

چنانچہ نعومی نے روت و عرفہ کو پھر رخصت کرنا چاہا تو بے اختیار تینوں رونے لگیں۔ پھر ایک کہرام مچ گیا۔ آخر عرفہ نے نعومی کو رخصت کا سلام کیا۔ اور اپنی ماں کے گھر کا راستہ لیا۔

عرفہ چلی گئی مگر روت اپنی جگہ سے نہیں ٹلی۔ جانے کے بدلے نعومی سے اور بھی لپٹ گئی... ''عرفہ مادرِ شوہرِ خود را بوسید۔ امّا روت بہ وے چسپید''۔ تورات۔ کتاب روت۔۱ (۱۴)

آخر کیا بات تھی کہ روت نے اپنی ماں کو چھوڑا۔ اپنا خاندان چھوڑا۔ ملک چھوڑا۔ سب کچھ چھوڑا۔ لیکن نادار و فاقہ کش نعومی کا دامن نہیں چھوڑا؟

''امّا روت بہ وے چسپید''۔ آخر کیوں؟ بات یہ تھی کہ:

چوں شہباز☆ محبت از آشیان عزت بر پرید۔ برعرش رسید۔
رفعت دید۔ و درگزشت۔ برکرسی رسید۔ عظمت دید۔ درگزشت۔
بر آسمان رسید۔ وسعت دید۔ درگزشت۔ بر زمین رسید۔ لعنت
دید۔ و فرود آمد۔ وگفت:
من محبت ام۔ و ایں محنت۔
فرق میان من و ایں بہ نقطۂ واقع است در ظاہر۔
و بہ معنی دانند آنہا کہ دانند!

شہباز محبت اپنے آشیانہ عزت سے محبوب کی تلاش میں نکلا تو چکر کاٹتا ہوا عرش، کرسی، آسمان سے گزرتا گیا۔ رفعت، عظمت، وسعت کو دیکھتا گیا۔ کہیں بھی ہم جنس کی صورت نہیں ملی لیکن زمین کی زیارت کی تو ٹھیر گیا:

ملی جنس کی اپنی جو اس کو بُو
لگا تکنے حیرت سے ہر ایک سُو

(میر حسن)

چشم حیرت نے دیکھا کہ:
یہاں محنت ہے۔
اور محنت مجسم لعنت ہے۔
جو محنت ہے وہی محبّت ہے۔
محنت میں جو نقطہ اوپر ہے محبت میں وہی نقطہ نیچے ہے۔
ظاہر میں نقطے کا فرق ہے۔ مگر حقیقت میں محبت سرتاپا محنت ہے اور اِس لیے لعنت۔ یعنی:

در رہ منزلِ لیلیٰ کہ خطر ہاست بجان
شرطِ اوّل قدم آنست کہ مجنوں باشی!

شرط اول قدم با نصیب روت پوری کرچکی تھی۔ دیکھنے میں نعومی سے لپٹی ہوئی تھی۔ مگر قدم اس کے وادیِ ایمن میں تھے۔ اور آنکھیں اُس کی تجلی سے چکاچوند تھیں۔ وادیِ ایمن وادیِ ایمان۔ اور تجلی جلوہ ایمان۔

نعومی اس سے بے خبر تھی۔ اس لیے اس نے روت سے کہا:
داد گفت:
اینک زن برادرِ شوہرت (یعنی عرفہ زن کلیون برادر محلون) نزدِ قومِ خود و خدایان خود برگشتہ است۔ تو نیز در عقب زن شوہر برادرت (؟) برگرد۔

تورات ۔کتاب روت۔ ا(۱۵)

عرفہ اپنے لوگوں اور اپنے خداؤں کے پاس چلی گئی۔ تو بھی اُسی کے ساتھ کیوں نہیں چلی جاتی؟

روت نے کہا: ''برمن اصرار مکن کہ ترا ترک کنم و از نزدِ تو برگردم۔''

آپ کہتی ہیں ہمارا دامن چھوڑ۔ یہ کیوں کر ممکن ہے۔ جب آپ کی روت دین مادر چھوڑ کر دینِ موسیٰ میں آنا چاہتی ہے۔ روت آپ کو ہرگز نہیں چھوڑ سکتی۔ اصرار فضول ہے۔

نعومی نے کہا: دینِ موسیٰ کھیل تماشا نہیں ہے۔ یہ دین کج دار و مریز ہے۔ طرح طرح کی پابندیاں ہیں۔ قدم قدم پر روک ٹوک ہے۔ برکت والے دنوں کا احترام۔ پھر یوم سبت کے خاص احکام۔ ایک شام سے دوسری شام تک یہ کرو۔ وہ نہ کرو۔ مثلاً سفر کرنا ہے تو دو ہزار ہاتھ سے زیادہ مت جاؤ۔

روت نے کہا: قبول! ''ہرجائے کہ می روی می آیم۔'' جہاں آپ جائیں گے وہیں روت بھی جائے گی۔

نعومی نے کہا: اور کافروں کے گھر ٹھیرنا ممنوع ہے۔

روت نے کہا: قبول! ''ہرجائے کہ منزل کنی منزل کنم۔'' جہاں آپ ٹھیریں گی وہیں روت ٹھیرے گی۔

نعومی نے کہا: اور ایک سو تیرہ واجبات ہیں۔ ایک سر اور ۱۱۳ پتھروں کا بوجھ۔

روت نے کہا: قبول! ''قومِ تو قومِ من۔'' جب روت قومِ موسیٰ کی ایک فرد ہوگئی تو قوم موسیٰ میں فنا ہوگئی:

می خروشد بحر و می گوید بہ آوازِ بلند!
ہر کہ در ما غرقہ گردد عاقبت ہم ما شود!
(کمال الدین خجندی)

نعومی نے کہا: اور خدائے یکتا کے سوا کسی کو سجدہ جائز نہیں۔ قومِ موآب کا کموش پتھر ہے۔ خدا نہیں۔

روت نے کہا: قبول! ''خدائے تو خدائے من خواہد بود''۔

روت سلطنتِ کموشؔ سے باہر آتی ہے۔ اور سلطنتِ یہوؔوہ میں داخل ہوتی ہے۔ آج سے خدائے موسیٰ خدائے روت ہوگا۔

نعومی نے کہا: اور گناہ کبیرہ کا مجرم قتل ہوتا ہے۔ یا جلایا جاتا ہے۔ یا سنگسار ہوتا ہے۔ یا پھانسی پاتا ہے۔

روت نے کہا: قبول!۔ ''جاے کہ بمیری می میرم''۔ جو آپ چاہیں گی وہ روت چاہے گی۔ حرام موت نہ آپ چاہیں گی نہ روت چاہے گی۔

نعومی نے کہا: اور مردہ دفن ہوتا ہے۔ زمین کو دیا جاتا ہے۔ آگ پانی ہوا کو نہیں دیا جاتا۔ آدمؑ نے اپنی مٹی زمین سے پائی۔ آگ پانی ہوا سے نہیں پائی۔ اِس لیے دین موسیٰ میں مٹی مٹی کو دی جاتی ہے۔ غیروں کو نہیں دی جاتی۔

روت نے کہا: قبول! ''دران جا دفن خواہم شد''۔ انصاف بھی یہی ہے کہ چیز جس سے لی جائے اُسی کو واپس کی جائے۔ ورنہ قرض ادا نہیں ہوگا۔

روت کو سب قبول! مگر جیتے جی آپ کا دامن چھوڑنا نہیں قبول۔ اور اب موت کے سوا کوئی شے روت کو آپ سے جدا نہیں کرسکتی۔ اگر کردے تو روت سے خدا سمجھے۔ ''خداوند بہ من چنین بلکہ زیادہ بر ایں کند۔ اگر چیزے غیر از موت مرا ز تو جدا نماید''۔☆۸

بات یہ ہے کہ روت کا دل اُس سے چھن چکا تھا۔ عشقِ الٰہی مالِ غنیمت سمجھ کر اُس کو لے چکا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ عرفہ جس کا دل ناچیز سمجھ کر چھوڑ دیا گیا، اپنی ماں کے گھر جاسکی۔ اور دل ربودہ روت اپنی ماں کے گھر نہیں جاسکی:

آں را کہ بدانیم کہ او قابلِ عشق است

رمزش بنمائیم و دلش را بربائیم!

پس چون دید کہ او برائے رفتن ہمراہش مصمم شدہ است، از سخن

گفتن باوے باز ایستاد۔ و ایشان ہر دو روانہ شدند تا بیت اللحم
رسیدند۔
توراۃ۔ کتاب روت۔ ا (۱۸۔ ۱۹)

نعومی نے جب دیکھ لیا کہ روت اپنی جگہ سے ہلنے والی نہیں تو
چپ ہوگئی۔ اور اُس کو اپنے ساتھ لے لیا۔
اب دونوں موآب سے افراتہ چلیں۔ افراتہ عرف بیت اللحم۔
نعومی آج دس برس کے بعد بیت اللحم جا رہی ہے۔
نعومی با چشمِ گریان و سینۂ بریاں بیت اللحم پہنچی تو سارا شہر ٹوٹ پڑا۔ شور ہوگیا کہ نعومی آئی! نعومی آئی! نعومی نے کہا خبردار جو ہم کو کسی نے نعومی کہا۔ ہمارا نام اب نعومی نہیں۔ مُرّہ ہے۔ شیریں نہیں۔ تلخ ہے۔ پہلے دامن بھرا تھا۔ اب خالی ہے۔ اَلی ملک نہیں۔ محلون نہیں۔ کلیون نہیں۔ تینوں کو رو پیٹ کر ہم یہاں آرہے ہیں۔ اب عزت کہاں؟ ذلت ہے۔ خدا نے سب کچھ دیا تھا۔ سب چھین لیا۔
لوگوں نے پوچھا، یہ ساتھ کون ہے؟ نعومی نے کہا یہ روت ہے۔ محلون کی سوگوار۔ ہماری مصیبت کی شریک۔ گدڑی کا لعل۔ سراپا سعادت۔ جانِ شرافت۔ خدائے موآب کی دشمن۔ خدائے موسیٰ کی چہیتی!۔
یہ دونوں جس دن بیت اللحم پہنچی ہیں، اُس دن عید فصح منائی جارہی تھی۔ یہ عید ہر سال ماہِ نیسان کی پندرہ کو ہوتی تھی۔ نیسان مطابق تقریباً مارچ، پھاگن۔ نیسان کی پندرھویں رات وہ تھی جب حضرت موسیٰ نے مصر کو چھوڑا۔ اور فرعون سے نجات پائی۔ اِسی نجات کی یادگار عید فصح تھی۔ عید کے دوسرے دن، نیسان کی سولہ سے گیہوں، جو وغیرہ فصل ربیع کی کٹنی شروع ہوتی تھی۔ اُس دن بستی کے محتاج لوگ کھیتوں پر جاتے تھے۔ اور گرا پڑا اناج جھولیوں میں بھر کر لاتے تھے۔
شریعت موسیٰ کا حکم تھا: ''و چون حاصلِ زمینِ خود را دِرَو کنید گوشہ ہاے

مزرعۂ خود را تمام نہ کنید۔ و محصول خود را خوشہ چینی مکنید''۔ تورات۔ کتاب لاویان۔۱۹۔ (۹) یعنی فصل کاٹتے وقت جو کچھ زمین پر گر جائے وہ محتاجوں کا حق ہے۔ اور اِسی طرح کھیت کے حاشیوں پر کچھ فصل محتاجوں کے واسطے چھوڑ دی جائے۔ یہی حکمِ قرآن مجید کا ہے۔ مثلاً والمسکین۔ ۴ سورۂ النسا (۸) اور للسائل والمحروم۔۲۹ معارج (۲۵) اور فطاف علیھا طائف۔ ۲۹۔ سورۂ قلم۔ (۱۹) پس ایک بلا چکر لگا گئی۔

عید کی صبح کو روت نے نعومی سے کہا آج کھیتوں میں کٹنی شروع ہوگی۔ گھر میں کچھ نہیں ہے۔ اجازت ہو تو ہم باہر نکلیں۔ اور کھیتوں سے گرا پڑا اناج جو کچھ بھی مل جائے گھر لائیں۔ نعومی نے کہا اچھی بات ہے۔

بیت اللحم پہاڑی پر تھا۔ دامن میں کھیت تھے۔ روت پہاڑی سے اتری۔ کھیتوں کی طرف بڑھی۔ دیکھا کہ ایک کھیت میں مرد بھی ہیں عورتیں بھی ہیں۔ جَو کی فصل کاٹی جارہی ہے۔ روت اُس کھیت میں گئی اور اجازت چاہی۔ اجازت مل گئی۔ کاٹنے والے کاٹ کر آگے بڑھتے گئے۔ روت پیچھے پیچھے گرے ہوئے دانے چنتی گئی۔

چند گھنٹوں کے بعد کھیت کا مالک آیا۔ یہ مالک ہزاروں کا مالک تھا۔ بیت اللحم کا بہت بڑا زمیں دار و کاشت کار۔ مالک نے اپنے کھیت میں ایک نئی صورت دیکھی تو گماشتے سے پوچھا یہ لڑکی کون ہے؟ گماشتے نے جواب دیا:۔

''این است دخترِ موآبیہ کہ با نعومی از بلاد موآب برگشتہ است۔ و بمن گفت کہ تمنا اینکہ خوشہ چینی نمایم و در عقب دِرَوندگان درمیان بافہ ہا جمع کنم۔ پس آمدہ از صبح تا بحال ماندہ است۔''

(کتاب روت ۲۔ (۶۔۷)

یہ لڑکی موآب سے نعومی کے ساتھ آئی ہے۔ اس نے ہم سے خوشہ چینی کی اجازت چاہی، ہم نے دے دی۔ چنانچہ صبح سے اب تک یہ اِسی میں لگی ہوئی ہے۔

یہ سن کر مالک نے روت سے کہا، اِن کھیتوں کو چھوڑ کر اب کہیں اور مت جانا۔ ہماری کنیزیں جو کھیتوں میں کام کر رہی ہیں، اُنھی کے ساتھ رہنا۔ اور جو کچھ لینا ہو انھی کھیتوں سے لینا۔ اگر پیاس لگے تو پانی بھی یہاں موجود ہے۔ باقی رہے نوجوان مرد جو یہاں کام کر رہے ہیں، کوئی تجھ کو چھو نہیں سکتا۔ ''آیا جوانان را حکم نہ کردم کہ ترا لمس نہ کنند''؟ کتاب روت۔ ۲ (۹)۔ غرض یہ کہ یہاں سے کہیں اور مت جانا۔

یہ سننا تھا کہ روت دھڑ سے زمین پر گر پڑی اور بولی: ''اِس پردیسن بھکارن پر آپ کی یہ خاص نظر کیوں ہے؟۔ ''برائے چہ در نظر تو التفات یافتم کہ بمن توجہ نمودی۔ و حالاں کہ غریب ہستم''۔ روت۔۲ (۱۰)

مالک نے جواب دیا:

> ''از ہر چہ بعد از مردنِ شوہرت بہ مادرِ شوہرِ خود کردی اطلاع تمام بمن رسیدہ است۔ وچگونہ پدر و مادر و زمینِ ولادتِ خود را ترک کردہ نزدِ قومے کہ پیشتر نہ دانستہ بودی آمدی، خداوند عملِ ترا جزا دہد۔ و از جانب یھوہ خدائے اسرائیل کہ در زیر بالہایش پناہ بردی اجرِ کامل بتو دہد۔'' روت۔۲ (۱۱۔۱۲)

> اب ہم پہچان گئے کہ تو کون ہے۔ تو وہی ہے کہ بیوہ ہونے کے بعد بھی ماں باپ کو چھوڑ دیا مگر اپنے شوہر کی ماں کو نہیں چھوڑا۔ اور جس نے ایک اجنبی ملک اجنبی قوم کے لیے خود اپنا ملک اور اپنا خاندان چھوڑ دیا، اِس کا پھل تجھ کو وہ دے گا جو اسرائیل کا خدا ہے اور جس کی پناہ میں تو آئی ہے۔

اِس کے بعد مالک نے حکم دے دیا کہ روت کی ہر طرح سے دل جوئی کی جائے۔ چنانچہ روت تمام دن وہیں ٹھیری۔ کھانا بھی وہیں کھایا اور شام کو اپنے گھر آئی تو بارہ سیر جَو کی گٹھری باندھتی لائی۔ اور نعومی سے سب حال بیان کیا۔ اور کہا کہ مالک کا

نام بوعزؔ ہے۔ نعومی بہت خوش ہوئی۔ اِسی طرح جَو اور گیہوں کی کٹنی جب تک ہوتی رہی روت ہر صبح جاتی رہی۔ اور ہر شام آتی رہی۔

ایک رات کا واقعہ ہے کہ آسمان پر فرشتگانِ الٰہی دم بخود تھے۔ اور زمین پر شیطانِ رجیم تاک لگائے بیٹھا تھا۔ اور بیت اللحم کے ایک کھلیان میں مالک اُس کا بے خبر سو رہا تھا کہ آدھی رات کو مالک یکا یک چونک پڑا۔ اب کروٹ جو لیتا ہے تو پاؤں اس کا کسی جسم سے مس ہوا۔ پوچھا کون؟ آواز آئی کہ: روت! آپ کی کنیز!۔

"من کنیز تو روت ہستم۔ پس دامنِ خود را بر کنیزِ خویش بگستران۔
زیرا کہ تو ولی ہستی"۔روت۔۳ (۹)

آپ بوعزؔ۔ ہم روت۔ آپ مالک۔ ہم کنیز۔ دامن مالک کا کنیز
تک آتا کیوں نہیں؟ کنیز کو پوچھتا کیوں نہیں؟

بوعزؔ نے پوچھا تو کب آئی؟ کس طرح آئی؟ کیوں آئی؟۔ روت نے کہا: کب کا جواب یہ ہے کہ جب آپ سو گئے۔ کس طرح کا جواب یہ ہے کہ دبے پاؤں۔ اور کیوں کا جواب یہ ہے کہ خود نہیں بلکہ نعومی کے حکم سے۔ بات یہ ہے کہ پہلے دن جب ہم آپ کے کھیت سے گھر واپس ہوئے تھے تو نعومی سے ہم نے سب حال بیان کیا تھا۔ اور یہ بھی کہا تھا کہ مالک کا نام بوعزؔ ہے۔ یہ نام سنتے ہی نعومی باغ باغ ہوگئی تھی اور ہم سے بولی تھی کہ:

"او از جانبِ خداوند مبارک باد۔ زیرا کہ احسان را بر زندگان و
مُردگان ترک نہ نمودہ است...
ایں شخص خویشِ ما۔ و از ولی ہاے ماست۔

روت۲ (۲۰)

بوعزؔ سے ہمارا رشتہ بہت ہی قریب ہے۔ اور اِسی قرابت کی وجہ

سے اُس نے تجھ کو اپنا سمجھا اور اس قدر دل جوئی کی۔
یہ بوعزؒ کا احسان ہے مُردہ اَلی ملک و محلون پر۔ اور زندہ نعومی و
روت پر۔ خدا بوعزؒ کو اس احسان کا اچھا بدلہ دے۔
پھر آج دن کو نعومی نے ہم سے کہا:
(۱) ''اے دخترِ من! آیا برائے تو راحت نجویم تا برایت نیکو باشد؟
(۲) والآن آیا بوعزؒ کہ تو با کنیزانش بودی خویشِ مانیست؟
واینک او امشب در خرمنِ خود جَو پاک می کند۔
(۳) پس خویشتن رانسل کردہ تدہین کُن۔ و رختِ خود را پوشیدہ،
بہ خرمن برو۔
اما خود را بآن مرد نشناسان تا از خوردن و نوشیدن فارغ شود۔
(۴) و چون او بخوابد جائے خوابیدنش را نشان کن۔ و رفتہ پایے
ہائے او را بکشا۔ و بخواب۔
و او ترا خواہد گفت کہ چہ باید کنی''۔

(روت ۳ (۱-۴))

بیٹی! تمنا ہے کہ تجھ کو سکھ نصیب ہو۔ اور تیری خانہ آبادی ہوجائے۔
بوعزؒ ہمارا عزیز قریب ہے۔ اورآج کی رات وہ جَو کے کھلیان میں سوئے گا۔
آج تو نہا دھولے۔ اور بدن میں تیل مل لے۔ پھر کپڑے بدل
کر بوعزؒ کے کھلیان میں چلی جا۔ مگر جب تک بوعزؒ کھانے پینے
سے فارغ نہ ہوجائے، اُس کا سامنا ہرگز مت کرنا۔
اور جب وہ سونے جائے تو اچھی طرح دیکھ لینا کہ کہاں سوتا
ہے۔ اور جب وہ سوجائے تو اُسی جگہ تو بھی چلی جانا۔ اور اُسی
کے پاس سو رہنا۔

بوعزؔ تجھ کو خود بتادے گا کہ کیا کرنا چاہیے۔

بوعزؔ نے کہا کہ نعومی جو کچھ کہتی ہے سچ کہتی ہے۔ مگر وہ یہ کہنا بھول گئی کہ روت نے آج تک اپنی نظر میلی نہیں کی۔ اور اپنی کم سنی اور پاک دامانی بوعزؔ کے لیے خاص کردی۔ یہ احسانِ عظیم ہے روت کا بوعزؔ پر۔ اور بوعزؔ احسان فراموش نہیں۔ ''ہر انچہ بمن گفتی برایت خواہم کرد''۔ تو جو کچھ چاہتی ہے ہم بھی وہی چاہتے ہیں۔ لیکن ایک اور آدمی ہے جو رشتے میں تجھ سے قریب تر ہے۔

(۱۲) والآن راست است کہ من ولی ہستم لیکن ولی نزدیک تر از من ہست۔

(۱۳) امشب دریں جان، وبا مدادان اگر او حقِ ولی را برائے تو ادا نماید خوب ادا نماید۔ و اگر نخواہد کہ برائے تو حقِ ولی را ادا نماید، پس قسم بہ حیات خداوند کہ من آن را برائے تو ادا خواہم نمود۔ الآن تا صبح بخواب۔

(۱۴) پس نزد پایلش تا صبح خوابیدہ پیش ازاں کہ کسے ہمسایہ اش را تشخیص دہد برخاست۔ وبوعزؔ گفت زنہار کسے نہ فہمد کہ این زن بہ خرمن آمدہ است۔

(۱۵) وگفت چادرے کہ بر تو است بیاور و بگیر۔ پس آن را بگرفت۔ و اوشش کیل جو پیمودہ بردے گزارد۔ و بہ شہر رفت۔

روت۔۳ (۱۲۔۱۵)

ہمارے سوا ایک ولی تیرا اور ہے۔ پہلا حق اُسی کا ہے اور شرعاً تو اُسی کی ہے۔ وہ حق دار اپنا حق چھوڑ دے تب البتہ تو ہماری ہوسکتی ہے۔

ذرا صبح ہولے تو ہم اُس سے پوچھیں۔ اگر اُس نے تجھ کو قبول کرلیا تو مجبوری ہے۔ اور اگر چھوڑ دیا تو ہماری عید ہے۔

ابھی رات پڑی ہے۔ تو یہیں سو رہ۔ صبح کو چلی جانا۔
تب روت پائینتی سو رہی۔ پھر تڑکے اُٹھ بیٹھی۔ بوعزؑ نے کہا:
خبردار کسی کو خبر نہ ہو کہ تو یہاں آئی تھی۔

روت چلنے لگی تو بوعزؑ نے کہا، اپنی چادر میں کچھ جَو لیتی جا۔
خالی ہاتھ جانا ٹھیک نہیں۔
تب روت شہر کی طرف روانہ ہوگئی۔

(۱) آسمان پر فرشتگانِ الٰہی جو اب تک مقامِ حیرت میں تھے فوراً سجدے میں گر گئے۔ اور اقرار کیا کہ اے پاک و پاکیزہ! جتنا تو نے بتایا ہے اُس کے سوا ہم کچھ نہیں جانتے۔ سُبْحٰنَکَ لاَ عِلْمَ لَنَا اِلاَّ مَا عَلَّمْتَنَا.

(۲) زمین پر شیطانِ رجیم جو الوپ انجن لگائے ہوئے سب دیکھ رہا تھا، سب سن رہا تھا، چیختا ہوا بھاگا کہ روت ہرگز حوا کی بیٹی نہیں ہوسکتی۔ اور بوعزؑ ہرگز آدمؑ کا بیٹا نہیں ہوسکتا۔ یہ کوئی اور خلقت ہے جو آدمؑ و حوا کے بھیس میں فرشتہ ہے۔ جس کی رگوں میں خون نہیں برف ہے۔

(۳) بیت اللحم کے ایک گوشے میں نعومی رات بھر دعائیں مانگتی رہی۔

(۴) بوعزؑ کی خلوت سے روت باہر آئی تو دل سے پوچھا کہ خدائے موسیٰ نے یوسفؑ کی ترازو میں ہم کو اور بوعزؑ کو کیوں تولا؟ دل نے کہا: تو نے نعومی سے کیوں کہا تھا کہ خدائے تو خدائے من؟ تیرا خدا ہمارا خدا۔ جو دعویٰ کرے گا اُس کا امتحان ضرور لیا جائے گا۔

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَ ھُمْ لَایُفْتَنُوْنَ۔۲۰ عنکبوت (۲)

[کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ چھوڑ دیے جائیں گے اتنا کہہ دینے سے کہ ہم ایمان لائے؟ اور اُن کا امتحان نہیں لیا جائے گا؟]

بہرکیف جَو کی گٹھری لیے ہوئے روت اپنے گھر پہنچی تو دیکھتے ہی نعومی نے

پوچھا: ''اے دخترِ من! بر تو چہ گزشت''؟ آخر تجھ پر کیا گزری؟

روت نے شبِ امتحان کی تصویر کھینچی۔ یہ ہوا، یہ ہوا، یہ ہوا۔

نعومی نے کہا: ''اے دخترم! آرام بنشین تا بدانی کہ این امر چگونہ خواہد شد۔ زیرا کہ آن مرد تا این کار را امروز تمام نکند آرام نخواہد گرفت''۔ روت ۳ (۱۸)۔

اے بیٹی! اب بوعز دم نہیں لے گا۔ آج ہی جو ہونا ہے ہوجائے گا۔ تو اب نچنت ہوجا۔

صبح ہوئی تو بوعز اپنے دروازے پر آکر بیٹھا۔ اتنے میں قضا و قدر نے وہاں اُسی آدمی کو بھیج دیا جس کی ہاں نہیں پر روت کا فیصلہ تھا۔ بوعز نے آواز دی۔ وہ آدمی آکر بیٹھ گیا۔ بوعز نے تب شہر سے دس آدمیوں کو بلوایا۔ ''دہ نفر از مشائخ شہر را برداشتہ''۔ جب سب آگئے تو بوعز نے اُس آدمی سے کہا کہ الی ملک تمھارا ہمارا بھائی تھا۔ اُس مرحوم کی بیوہ نعومی ملک موآب سے آئی ہے اور مرحوم کی ایک زمین بیچتی ہے۔ تم اول حق دار ہو۔ اگر تم کو وہ زمین خریدنا منظور ہو تو اِن بزرگوں کے سامنے جو یہاں موجود ہیں خرید لو۔ اگر خریدنا منظور نہ ہو تو صاف کہہ دو۔ کیوں کہ تمھارے بعد ہمارا حق ہے۔ اُس آدمی نے کہا ہم کو خریداری منظور ہے۔

> بوعز گفت درروزے کہ زمین را از دست نعومی می خری، از روت موآبیہ زنِ متوفی نیز باید خرید۔ تا نام متوفی را بر میراثش برانگیزانی۔'' روت ۴ (۵)۔

تب بوعز نے کہا کہ زمین کے ساتھ روت بھی ہے۔ جو روت کا گاہک ہوگا وہی زمین کا گاہک ہوسکتا ہے۔ کیوں کہ روت کا شوہر محلون لاولد مرا ہے۔ روت کے ذریعے محلون کا نام زندہ رکھنا اور لڑکا پیدا کرنا خریدار کا فرض ہے۔ کیوں کہ شریعت کا حکم یوں ہے۔

(۵) اگر برادران باہم ساکن باشند و یکے از آں ہا بے اولاد بمیرد، پس زنِ

آن متوفی خارج بہ شخصِ بیگانہ دادہ نشود۔ بلکہ برادر شوہرش بہ او در آمدہ او را برائے خود بہ زنے بگیرد۔ وحق برادر شوہری را با او بجا آورد۔

(٦) ''ونخست زادہٴ کہ بزاید بہ اسم برادر متوفائے او وارث گردد۔ تا اسمش از اسرائیل محو نہ شود''۔ تورات۔ کتاب تثنیہ۔ ٢٥ (٥۔٦)

اُس آدمی نے بوعزؔ سے کہا کہ یہ شرط ہم کو منظور نہیں۔ زمین تم خود خرید لو۔ ہم اپنے حق سے باز آئے۔ ''مبادا میراثِ خود فاسد کنم۔'' تب بوعزؔ نے کہا:

''و بوعزؔ بہ مشائخ و بہ تمامی قوم گفت۔ شما امروز شاہد باشید کہ تمامی مایملک الی ملک و تمامیِ مایملک کلیون و محلون را از دستِ نعومی خریدم۔ وہم روت موآبیہ زنِ محلون را بہ زنے خود خریدم۔ شما امروز شاہد باشید۔''

روت۔ ٤ (٩۔١٠)

تب مشائخِ بیت اللحم اور حاضرین جلسہ نے بوعزؔ سے کہا:

''خداوند این زن را کہ بخانۂ تو درآمد مثل راحیل ولیہ گرداند کہ خانۂ اسرائیل را بنا کردند۔ و تو در افراتہ کامیاب شو۔ و در بیت اللحم نامور باش......'' روت ۔ (١١)

اے بوعزؔ! تیری روت تجھ کو مبارک! اور بیت اللحم افراتہ کو بھی مبارک! اور روت کو راحیل ولیہ کی برکت وعظمت مبارک!

راحیل نے یوسفؑ و بن یامین سے، اور لیہ نے روبین و شمعون ولاوی و یہودا و یشجر و زبولون سے، حضرت یعقوبؑ کا گھر آباد کیا۔ تیری روت بھی تیرا گھر اِسی طرح آباد کرے گی!

''این دعا از من و از روح آمین امین باد''۔

روح الامینؑ نے آمین کہا۔ اِس آمین پر شیطانِ رجیم بھڑ گیا۔ ہم باز آئے

اُس بیت اللحم سے جہاں شجرِ ممنوعہ کو زمین تک نہیں ملتی۔ ہم نے بوعزؒ کی زمین میں روت کے ہاتھوں یہ درخت لگانا چاہا تھا مگر بوعزؒ نے زمین نہیں دی۔ اور روت نے ہاتھ کھینچ لیا۔ ہماری ہار روح الامینؑ کی جیت ہے۔ اُسی وقت سے خانۂ روت و بوعزؒ میں روح الامین کاراج ہے۔ اب ہم یہاں نہیں ٹھہر سکتے۔ ''دو پادشاہ در اقلیمے نہ گنجند۔''

روح الامینؑ کے سائے میں روت اپنے بوعزؒ کے گھر آئی۔ آئی تو امتحان دیتی آئی۔ جنت کی کنجی مٹھی میں لائی۔ رات کو دن بناتی گوشے گوشے کو روشن کرتی آئی۔ مہرو ماہ کی صورت آئی۔ سدا بہار کو نیوتہ دیتی آئی۔

سدا بہار نے ویرانے کو گلشن بنا دیا۔ اور گلشن نے سدا بہار کو جانے نہیں دیا۔ اس کے تین گواہ۔ ایک شجرہ۔ ایک آیت۔ ایک شعر۔

(۱) شجرہ: داؤدؑ بن یسی بن عوبید بن روت و بوعزؒ ...

اور بوعزؒ بن سلمون بن نحشون بن عمیناداب بن آرام بن حصرون بن فارص بن یہود بن یعقوبؑ ولیہ۔

سالِ امتحان روت و بوعزؒ .... ۱۱۴۰ ق م

سالِ ولادت عوبید بن روت و بوعزؒ .... ۱۱۴۰ ق م

سالِ ولادت یسیٰ بن عوبید......................... ۱۱۰۰ ق م

سالِ ولادت داؤدؑ بن یسیٰ.......................... ۱۰۵۰ ق م

امتحانِ روت و بوعزؒ سے ۵۱۶ برس بعد ۶۲۴ ق م میں گوتم بدھ ہندوستان صوبہ بہار میں پیدا ہوا۔ اور ۸۱۴ برس بعد ۳۲۶ ق م میں سکندرِ اعظم ماہ فروری میں دریائے سندھ سے گزرا۔

(۲) ۶۔ سورۃ النسا (۱۶۳):

واتینا داؤد زبورا............ اور ہم نے داؤدؑ کو زبور عطا کی:

حضرت داؤدؑ نے چالیس برس سلطنت کی۔ ۷ برس شہر حبرون میں اور ۳۳ برس یروشلم میں۔ رحلت ۹۷۳ ق م۔

(۳) مرزا محمد جعفر اوج لکھنوی خلف مرزا دبیر مرحوم:

ابنِ داوٗدؑ کو یہ ثروت دی!
کہ سلیمانؑ کردیا تو نے!

سلیمانی چالیس برس۔ از ۹۷۳ تا ۹۳۳ ق م۔

اِس طرح روت و بوعزؔ کے گلشن میں گلِ داوٗدی کی بہار گویا جنت کی بہار تھی۔ رہے نام اللہ کا۔

حواشی:

۱۔ افراتہ سے مراد وہ خطہ جو افراتہ زوجۂ کالیب سے منسوب تھا۔ اسی زمین افراتہ کا دوسرا نام بیت اللحم ہوا۔ یروشلم یعنی بیت المقدس سے بیت اللحم ڈھائی کوس دکھن ہے۔ وہاں ایک زمانے میں لحمو نام بت کی پرستش ہوتی تھی۔ بیت اللحم مثل بیت المقدس۔
توراۃ۔ کتاب میکاہ نبی۔ ۵ (۲): ''وتو اے بیت اللحم افراتہ اگرچہ در ہزار ہائے یہودا کوچک ہستی.....''
یہاں یہودا سے مراد یہود ابن حضرت یعقوبؑ۔ یہودا کا پوتا۔ حصرون بن فارص، حصرون کا بیٹا کالیب جس کی بی بی افراتہ۔ ''وعزوبہ مُرد۔ و کالیب افرات را بہ زنے گرفت۔ و اوحور را برائے وے زائید۔''
توراۃ۔ اوّل تواریخ ایام۔۲(۱۹)

۲۔ الی ملک۔ بمعنی خدائے من پادشاہ (است)۔

۳۔ محلون بمعنی نغمہ۔

۴۔ کلیون بمعنی کامل و بے نقص۔

۵۔ روت بمعنی آسودہ۔ بھری پری۔

۶۔ نعومی بمعنی شیرین و قبول صورت۔

۷۔ از مکتوبات شیخ شرف الدین احمدؒ یحییٰ منیری بہاری۔ عمر ۱۲۱ سال۔
آمدن: شرف آگین ۶۶۱ ہجری۔
رفتن: پُرشرف ۷۸۲ ہجری۔
آنا ہو تو ایسا ہو۔ جانا ہو تو ایسا ہو۔ سبحان اللہ! کیا آمدورفت تھی۔ شرف آگین و پُرشرف! آغاز شرف۔ انجام شرف۔

۸۔ توراۃ۔ کتاب روت۔ ۱ (۱۷)
''جائے کہ بمیری می میرم۔ و در انجا دفن خواہم شد۔ خداوند بہ من چنین بلکہ زیادہ بر این کند اگر چیزے غیر از موت مرا از تو جدا نماید۔''
روت کا یہ جواب پیمان وفا باندھنے والوں، اور توراۃ سے فال دیکھنے والوں میں بہت محبوب و مشہور ہے۔

[رسالہ ''تذکرہ'' کراچی۔ مارچ ۱۹۵۶ء]

الف

(۱)

اللہ اللہ! وہ بھی کیا وقت تھا جب حضرت رب العزت نے اِس بے وجود کو باوجود کیا، نابود کو بود کیا، موہوم کو نقطہ کیا، نقطے کو خط کیا، خط کو مستقیم کیا، بے نشان کو بانشان کیا، گمنام کو نام دار کیا، اپنی قربت کا حوصلہ دیا، وصلت کا مژدہ سنایا، بزمِ اقدس میں یاد فرمایا۔ عزت سے داہنی طرف بٹھایا، یمین الدولہ خطاب فرمایا، اولیت کا تاج بخشا، یگانہ کیا، یکتا کیا، ذات خاص سے وابستہ کیا، اسمِ اعظم کا تاج دار بنایا، اسمِ ذات☆[۱] کا آئینہ دار بنایا:

اے ز تُو عالم پُر از غوغا شدہ
جانِ پاکاں در رہت یغما شدہ
اے ز وصلت عاشقاں دل سوختہ
جامۂ وصلِ تو ہر دم دوختہ
اے ز وصلت ہر زماں حیراں شدم
در تحیّر سربسر گرداں شدم
اے ز وصلت غرقِ توحید آمدم
لاجرم در عینِ تجرید آمدم
من تو ام، تومن، نہ من، جملہ توئی
محو کردم در تو مائی و توئی

(عطّار)

حضرت احدیت نے مے وحدت ہم کو کب پلائی، کہاں پلائی، اور کتنی پلائی۔ یہ صبحِ ازل تک کو نہیں معلوم۔ صبحِ ازل نے آنکھ کھولی تو ہم کو مقامِ وحدت میں ایستادہ پایا۔

پوچھا تو کون؟... ہم نے کہا الف!

پوچھا الف کون؟... ہم نے کہا آئینۂ یکتائی!

پوچھا ثبوت؟... ہم نے کہا آئینہ کبھی جھوٹ نہیں بولتا!

پوچھا آئینہ تجھ کو بنایا کس نے؟... ہم نے کہا، اُس نے جو یکتا و بے ہمتا ہے!

پوچھا کیوں بنایا؟... ہم نے کہا یہ مت پوچھو:

بہارست و دل مست و من در خمار
خوشا جام مے، خاصہ از دستِ یار
کہ بہر پرستیدنِ آں صنم
بہ ملکِ وجود آمدم از عدم

(ملا مرشد)

ملک عدم سے ملکِ وجود میں ہمارا آنا لوح و قلم کا افسانہ ہے۔ ہم نہیں تو ازل نہیں، ابد نہیں، انتہا نہیں۔ ہم نہیں تو آب نہیں، خاک نہیں، باد نہیں، آتش نہیں۔ ہم نہیں تو آدم نہیں، حوا نہیں۔ آدم سر بریدہ۔ حوا پا بریدہ۔ ہم نہیں تو دعا نہیں، دوا نہیں، شفا نہیں۔ ہم نہیں تو جان نہیں، ایمان نہیں، قرآن نہیں!

الحمد للہ کہ کلام اللہ کی بسم اللہ بہر صورت ہم سے ہوئی۔ غارِ حرا میں۔ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِی خَلَقَ[☆۲] اور سورۂ فاتحہ میں اَلْحَمْدُلِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ!

این سعادت ز فضلِ رحمٰن است!

اَلِف ایک۔ الف ایک ہزار۔ اللہ نے ہم کو ایک سے ایک ہزار کیا۔ یعنی حروف ابجد کا انجام بھی ہمارے ہاتھوں بخیر کیا۔

(۲)

''اے تماشا گاہِ عالم روئے تو!''

روئے تو سے مراد روئے الف۔ الف ایک ہے۔ لیکن ابجد کے حساب سے ایک سو گیارہ ہے۔ ا (۱) +ل (۳۰) +ف (۸۰) =۱۱۱۔ یہاں وحدت میں کثرت ہے۔ کثرت میں وحدت ہے۔ ۱۱۱ کا ہر جزو اپنی جگہ پر کُل۔ ہر عدد اپنی جگہ پر ایک۔ ہر فرد اپنی جگہ پر الف ہے۔ آئینہ ہو تو ایسا ہو۔ آئینۂ یکتائی نے شان یکتائی یہاں بھی برقرار رکھی۔ لیکن اِسی ۱۱۱ سے تثلیث کا فتنہ بھی اُٹھا۔ ۱۱۱ کو دیکھ کر کسی نے ایک خدا کے تین ٹکڑے کر دیے اور کہہ دیا کہ ایک تین ہے اور تین ایک۔

۱۱۱ سے مراد الف۔ الف کو دیگر حروف سے وہی نسبت ہے جو آدمؑ کو بنی آدمؑ سے۔ آدمؑ نے اپنی دنیا بسائی۔ الف نے اپنی دنیا بسائی۔ آدمؑ کا چراغ اُس گھر میں جل رہا ہے۔ الف کا چراغ اِس گھر میں جل رہا ہے۔ الف نے اپنی دنیا کس طرح بسائی اور چراغاں کس طرح کیا، یہ ۱۱۱ سے پوچھنا چاہیے۔

۱۱۱ میں ایک اکائی ہے۔ ایک دہائی ہے۔ ایک سیکڑا۔ ۱+۱۰+۱۰۰۔ اِن سے تین حرف پیدا ہوئے۔ اکائی سے الف (۱)۔ دہائی سے ی (۱۰)۔ اور سیکڑے سے ق (۱۰۰)... ۱۱۱ کو دو سے نو تک جس عدد سے بھی ضرب دیا جائے، حاصل ضرب سے تین حرف پیدا ہوں گے۔ مثلاً ۱۱۱ کو چھ سے ضرب دیا جائے تو حاصل ضرب ۶۶۶ یعنی ۶+۶۰+۶۰۰ سے تین حرف پیدا ہوئے۔

اکائی سے و (۶) دہائی سے س (۶۰)۔ اور سیکڑے سے خ (۶۰۰)۔ اِس حساب سے ۱۱۱ کی مجلس یوں آراستہ ہوئی:

الف= ۱۱۱	اکائی	دہائی	سیکڑا	کیفیت
۱۱۱ =۱×۱۱۱	ا	ی	ق	۱ + ۱۰ + ۱۰۰
۲۲۲ =۲×۱۱۱	ب	ک	ر	۲ + ۲۰ + ۲۰۰
۳۳۳ =۳×۱۱۱	ج	ل	ش	۳ + ۳۰ + ۳۰۰

۴۴۴ = ۴×۱۱۱	د	م	ت	۴۰۰ + ۴۰ + ۴
۵۵۵ = ۵×۱۱۱	ہ	ن	ث	۵۰۰ + ۵۰ + ۵
۶۶۶ = ۶×۱۱۱	و	س	خ	۶۰۰ + ۶۰ + ۶
۷۷۷ = ۷×۱۱۱	ز	ع	ذ	۷۰۰ + ۷۰ + ۷
۸۸۸ = ۸×۱۱۱	ح	ف	ض	۸۰۰ + ۸۰ + ۸
۹۹۹ = ۹×۱۱۱	ط	ص	ظ	۹۰۰ + ۹۰ + ۹

کیا بات ہے کہ اس مجلس میں الف کے خاندان کا ہر فرد موجود ہے لیکن غ اور ہمزہ نہیں؟۔

[۱] بات یہ ہے کہ غ غائب حاضر ہے۔ حاضر بھی ہے اور غائب بھی۔ ہے بھی اور نہیں بھی۔

الوپ انجن لگائے بیٹھا ہے۔ موجود ہے مگر آنکھوں سے اوجھل ہے:

ہے کہو تو ہے نہیں، نہیں کہو تو ہے
ہے نہیں کے بیچ میں جو کچھ ہے سو ہے

غ دراصل الف ہے۔ الف کا وزیر ہے۔ الف کا ترجمان ہے۔ الف کا جانشین ہے۔ الف کبھی ایک ہے۔ الف کبھی ہزار ہے۔ الف جس وقت ایک ہے، اُس وقت وہ ہزار نہیں۔ الف جس وقت ہزار ہے، اُس وقت وہ ایک نہیں۔ ایک ہونا اور ہزار ہونا بیک وقت ممکن نہیں۔ اِس لیے الف جب ایک ہو چکا، تاجِ یکتائی پہن چکا، سریرآرائے وحدت ہو چکا، تو ہزار کی جگہ خالی ہوگئی۔ اِس خالی جگہ پر الف نے غ کو نصب کیا۔ غ پر جو نقطہ ہے وہ نقطہ نہیں۔ شاہی مہر ہے۔ الف بادشاہ ہے۔ بادشاہ نے مہرِ خاص سے غ کو منصب دار کیا۔ اور غ ہزاری منصب پا کر ۱۱۱ کے دربار میں شریک ہوا۔ ورنہ غ بذات خود کوئی چیز نہیں۔ الف سے بے نیاز ہو کر غ کی کوئی ہستی نہیں۔ ثبوت یہ کہ ایک سے ہزار ہوتا ہے۔ ہزار کا بذاتِ خود کوئی وجود نہیں۔ ایک نہ ہو تو ہزار نہیں۔ بیج نہ ہو تو درخت نہیں۔ درخت کی نمود بیج سے، ہزار کی نمود ایک سے۔ غ کی

نمود الف سے۔ اور الف ۱۱۱ ہے۔ اس لیے غ کی نمود ۱۱۱ سے۔

غ کی نمود بھی الف سے ثابت ہوچکی تو معلوم ہوا کہ ۱۱۱ کی مجلس میں ایک سے ہزار تک اور الف سے غ تک سب موجود ہیں:

۱۔ اکائی کی صف میں پہلے ابجد۔ پھر ہوز۔ پھر ح ط۔ اِن دونوں نے ی سے یارانہ کیا۔ اور ہاتھ بڑھا کر اُس کو دہائی کی صف سے اپنی صف میں کھینچ لیا۔ اِس طرح حطی کا نام روشن ہوا۔

۲۔ ی کی ہجرت کے بعد دہائی کی صف میں اب کلمن ہے۔ اُس کے بعد سعفص۔

۳۔ سیکڑے کی صف میں پہلے قرشت ہے۔ پھر ثخذ۔ پھر ض ظ۔ اِن دونوں کو غ سے غائبانہ عشق تھا۔ چنانچہ وہ عشق آخر رنگ لایا اور ضظغ کا ظہور ہوا۔

[۲] باقی رہا ہمزہ تو ہمزہ بھی دراصل الف ہے۔ الف کو بھیس بدلنا خوب آتا ہے۔ چنانچہ ایک جوانِ بلند بالا جب پیرِ صد سالہ کے بھیس میں سامنے آتا ہے تو دیکھنے والے کہتے ہیں کہ ہمزہ آیا۔ یعنی اِس روپ میں الف کو کسی نے پہچانا نہیں۔ تماشائیوں کو کیا خبر کہ جو الف ہے وہی ہمزہ ہے جو ہمزہ ہے وہی الف ہے۔ دونوں ہم زاد۔ دونوں ہم عدد۔ دونوں ایک۔[☆۳] یہی وجہ ہے کہ ۱۱۱ کی مجلس میں ہمزہ کی جگہ نہیں۔ اور حروفِ ابجد کی فہرست میں ہمزہ کا نام نہیں۔

ہمزہ کو اپنی گم نامی و بے نشانی پر ناز ہے۔ وہ اپنے حال میں مست ہے۔ مستی میں جھوم رہا ہے۔ کہہ رہا ہے:

مدعی را تا نباشد آگہی
بادۂ توحید پنہاں می زنم!

(محمد سعید حسرت عظیم آبادی)

یعنی بے وحدت کا نشہ ہم کو بھی ہے۔ نشے میں چور ہم بھی ہیں۔ لیکن ہم بے ہوش نہیں۔ ہوشیار ہیں۔ چھپ کر پیتے ہیں، چھپا کر پیتے ہیں تا کہ نامحرم کو خبر نہ ہو

اور توحید کا راز افشا نہ ہو۔

توحید کا امانت دار جس طرح الف ہے، اُسی طرح ہمزہ ہے۔ الف اور ہمزہ ایک جان دو قالب۔ ہم جنس۔ ہم نفس۔ ہم رنگ۔ ہم سنگ۔ پھر بھی لڑانے والوں نے الف کو ہمزہ سے لڑا ہی دیا۔

عہدِ محمد شاہی میں لالہ شیورام داس عاشقؔ دہلوی میدان جنگ کی تصویر یوں کھینچتا ہے:

آغازِ سخن بنامِ یگانہ کہ الف را سرِ مشق راست بازی دادہ۔ و ہمزہ را کج مج خرامی تعلیم فرمودہ۔ آں را راست گوئی عطا نمودہ و ایں را زبانِ پیچیدہ بخشیدہ۔ آں را لباسِ قلمی عنایت ساختہ و ایں را خلعتِ تابدار شفقت کردہ۔

اما بعد بر سخن ورانے کہ چوں ہمزہ کج[4] می نشیند و مانندِ الف راست می گویند پوشیدہ نماند کہ ہر گاہے کہ کاتبِ خط پیشانیِ لوحِ محفوظ بہ تحریرِ سرنوشتِ حروفِ تہجی پرداخت، الف برروئے ہمزہ ایستاد۔ و الف را با ہمزہ پیچش[5] واقع شد۔ آں خیالِ نیزہ بازی در سر داشت و ایں کمند حلقہ می کرد۔ آں خود را بالا کشید۔ و ایں بروتِ خود را تاب می داد۔ خلاصہ الف آستین برمالیدہ۔ و ہمزہ دامن بہ کمر پیچید۔

الف

الف گفت بعضے مرا موحد می دانند و جماعت آدم راست[6] مزہ می خوانند۔ درفنِ راست معاملگی طاق افتادہ ام۔ یکے از مقربانِ جنابِ احدیت گردیدہ ام۔ یک سروگردن از تو بلند افتادہ ام۔ از روزِ ازل کہ بر حرفِ خود استادہ ام، خطاب عماد الملک را سزاوارم۔ لفظ حکومت بے جا ندارم۔ پا بر جائے من بر ہمہ کس

روشن است۔ عزم جزم کہ شنیدۂ فی الحقیقت عزم من است۔

شاہدِ عبارت را سُگان[7] سرمہ آلودم۔ و نسخہ طلبان درد را زخم مشک سود۔ چشمِ اربابِ حسد را میلم[8] و نزدیکِ اہلِ ہندسہ شکلِ مستطیل[9]۔ در نظرِ عاشقان مدِ آہ۔ و نظرِ بازاں را تارِ نگاہ۔ جوانانِ یکہ تاز را لوا[10] و پیران فرتوت را عصا۔ سپاہی لشکرِ سخن را علم۔ و دیدۂ کور سوادان را توتیائے قلم۔ سفینۂ عالم را بادبان۔ و ستم رسیدگان را انگشتِ امان۔

مدِ احسانِ من رسا افتادہ است و ذہنِ من دادِ استقامت دادہ۔ ہمیں قصیدہ لاشریک لۂ وردِ زبان من است۔ و مدلول[11] اھدنا الصراط المستقیم خاطر نشانِ من۔ طال عمرۂ در حقِ من می نگارند و مدظلہ در بارۂ من بقلم می آرند۔ طریقۂ من راست کیشی است و با سہی قدانم برگ خویشی۔ در ثبات قدم منفرد و سرفرازم۔ و مانندِ تو ہر لحظہ گردن کج نمی سازم۔ گاہے بتکرارِ مد بہ مدعا می پردازم۔ و گاہے بحث طول می آغازم۔

تیر روئے ترکش[12] حروف منم۔ و از میان ہمہ صاحب وقوفِ من۔ وحیدِ وقتِ خویشم بلکہ یک قدم از و پیش۔ مشقِ راستی بدرجۂ کمال رسانیدہ ام۔ و بہ مضمون خذحرفاًقل الفاً[13] رسیدہ ام۔

ناراستی تو مشہوراست۔ بحثِ کج شعارِ خودنمودۂ۔ بر پایۂ راستی نیستی و الاّ ترا با من چہ مناسبت؟ بلے کجا پیرِ منحنی و کجا کشیدہ قامت... بیان کج سلسلہ گی تو امر دشوار است۔ ہماں داستانِ تو حرف ناراست۔ باوجود اینکہ کمند بگردنت انداختہ اند، از کج تلاشی انفعال نداری۔ و با وصف اینکہ کارت بزنجیر کشیدہ اند ہنوز نمی گزاری۔ چوں تو کج مج زبانے ہمدی را نہ می شاید۔ دورشو کہ از

تو بوئے ریسمان می آید۔ از صلابتِ من تنِ تو کاستہ است و دود از نہادِ تو برخاستہ!

ہمزہ

ہمزہ چون آں را شنید مانند موئے آتش پیچیدہ گفت۔ اے جنگلی[☆۱۴] یک پا، اے مفلس یک قبا! با من ایں قدر دراز مشو و ایں ہمہ بالا مرو کہ کل طویل احمق در شانِ تو راست می آید۔ ہمہ وقت پیشِ خود بر پائی۔ و از کلہ درازی باز نمی آئی۔

گروہے ترا سرور ہوا می[☆۱۵] خواند و فرقہ سیہ زبان[☆۱۶] می داند۔ بہ طولِ امل اوقات بسر کردہٗ۔ از پشیمانی شاخ بر آوردہٗ۔ آتش مزاجی تو روشن است۔ و زبان درازی تو مبرہن۔[☆۱۷]

اگر سقمے در تو مشخص نمی گردید ترا داخلِ حروف علت[☆۱۸] نمی داشتند۔ اگر اعتبارے از تو بر می داشتند، ترا یکہٗ باطل نمی گزاشتند۔ از ہیبتِ من یکہ خوردہ در پیشِ من انگشت زنہار بلند کردہٗ۔ از کاہلی یک جا پائی پست کردہٗ۔ و مضمون فی الحرکتہ برکتہ نہ فہمیدہٗ۔

منم کہ گاہے سورۂ انا فتحنا در شانِ من نزول می فرمایند۔ و گاہے افسرِ گراں بہائے ضمہ سرمایۂ افتخار می گردد۔ و دعویٔ سروریم بہ ایں وسیلہ پیش می رود۔

ادراکِ معنیٔ پیچیدہ حقِ من است۔ و باریک بینیٔ من بر موشگافان روشن۔ کج کلاہیٔ من عیان است۔ وخم و پیچے کہ دارم مستغنی از بیان۔ گاہے سخن در پردۂ استفہام شروع می نمایم و گاہے درمقام مسلسل گوئی می آیم۔

آئینۂ حروف را جوہرم۔ و شاہدِ الفاظ را زلفِ معنبر... گنج باد[☆۱۹] آوردِ سخن را مارم و سررشتۂ معانی را ماہرِ کار۔

موجۂ بحرِ زخار باریک خیالم، و کمند کنگرۂ افکارِ عالی، درویشان را کمندِ وحدت، مظلومان را زنجیرِ عدالت!

ملخّصِ کلام ایں کہ چوں سخن بہ ایں جا کشید از آں جا کہ راستی را زوال نیست، ہمزہ پیشِ الف گردن خم کرد۔ و گفت کہ من بعد چہ حد دارم کہ نگاہِ کج بہ سوئے تو کنم۔

بندۂ عاشقؔ کہ ہنوز الف را از ہمزہ ندانستہ، الف آسا یک جلوطے زمینِ سخن کردہ، و ہمزہ مثال راہِ مار پیچ فکر طے نمودہ۔ بتوفیقِ یگانۂ بے عیب مناظرۂ الف و ہمزہ را بہ فحوائے جو وتہ الکلام فی الاختصار در قالب ایجاز گنجایش دارد۔ ترصد از اربابِ کمال برین نحو است کہ اگر سہوے و خطائے رفتہ باشد مانند الف انگشتِ اعتراض نگذارند۔ و ہمزہ صفت برآں نہ پیچند۔ مصرع:

عیب پوشی بہ از نمد پوشی است!

لالہ شیو رام داس عاشق دہلوی نے جو کچھ کہا، اُس کو غالب دہلوی اپنی زبان میں اِس طرح کہتا ہے:

چوں الف بیگ در کہن سالی
پسرے یافت سربسر غمزہ!
نامِ او ہمزہ بیگ کرد، بلے
الفِ منحنی بود ہمزہ!

(۳)

گفتی کہ نہانم از دو عالم!
پیدا شدہ در یگاں یگاں کیست؟

گفتی کہ ہمیشہ من خموشم!
گویا شدہ پس بہ ہر زباں کیست؟

تُو کہتا ہے کہ ہم بولتے نہیں۔ سامنے آتے نہیں۔ آواز سناتے نہیں۔ صورت دکھاتے نہیں۔ در پردہ تو کہنا چاہتا ہے کہ تیری آواز کو کوئی سنتا نہیں۔ تیری بولی کوئی سمجھتا نہیں۔ تیری صورت کوئی پہچانتا نہیں۔ اگر تو بولتا نہیں تو الف کے پردے میں کون بول رہا ہے؟ اگر تو سامنے آتا نہیں تو الف کے آئینے میں کون آنکھیں لڑا رہا ہے؟... الف کی زبان تیری زبان۔ الف کی آواز تیری آواز۔ الف کی صورت تیری صورت! الف کہتا ہے اور بجا کہتا ہے:

ما پرتوِ نورِ بادشاہِ ازل ایم
فرزند نہ ایم آدم و حوّا را

ایک الف سے کل حروف پیدا ہوئے۔ الف کی مٹھی میں حروف کی دنیا ہے۔ گویا قطرے کی مٹھی میں سمندر ہے۔ حروف کی دنیا علوم کی دنیا ہے۔ الف اُس کا بھی خالق، اِس کا بھی خالق۔ علوم کا وجود حروف سے اور حروف کا وجود الف سے۔ گویا دونوں عالم ایک الف کے نام سے جیتے ہیں۔ اِسی کا نام ہے آئینۂ یکتائی!

الف کی کیا بات ہے۔ الف جنت نظیر ہے۔ جنت کا نمونہ ہے...

وہاں خلد یہاں ابجد
وہاں دارالسلام یہاں ہوز
وہاں دارالقرار یہاں حطی
وہاں جنت عدن یہاں کلمن
وہاں جنت الماویٰ یہاں سعفص
وہاں جنت النعیم یہاں قرشت
وہاں علیّین یہاں ثخذ
وہاں فردوس یہاں ضظغ

آٹھ وہ بھی۔ آٹھ یہ بھی۔ الف کا خاندان جنت نشان ہے۔ جنت کی طرح سرسبز ہے۔ سدا بہار ہے۔ جنت کی طرح اِس خاندان کا ہر فرد بھی اپنے مالک کی تسبیح پھیر رہا ہے:

بہ زبانِ الف ہمی گویند
اِنّہ لا الہ الا اللّٰہ!

حواشی:

۱۔ اسم ذات سے مراد اللہ، چنانچہ ایک عارف باللہ نے واقعۂ کربلا کی تاریخ اِس طرح نکالی:

من چہ گویم کربلا را واقعات
آہ بیروں آمدہ از اسمِ ذات

اسم ذات = اللہ = ٦٦
آہ (بیرون آمدہ) = ٦
٦٠ ہجری

اِس تاریخ میں اللہ کی جگہ اسم ذات قابلِ غور ہے۔ مصرعِ ثانی میں اللہ ہوتا تو شعر کا مطلب یہ ہوجاتا کہ کربلا میں آلِ رسول کی تباہی کا حال تم ہم سے کیا پوچھتے ہو جب خود اللہ کے منہ سے آہ نکل گئی۔ مگر اسلام کی سرحد سے نکل کر کفر کی سرحد میں جس کو داخل ہونا ہو وہی یہ کہہ سکتا ہے کہ اللہ کے منہ سے آہ نکلی۔ اِس لیے عارف باللہ نے اللہ کی جگہ اسمِ ذات لکھا۔ اس عارف باللہ کا نام خواجہ معین الدین اجمیری۔ بڑوں کی بڑی بات!

۲۔ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ......

خان بہادر سیّد احمد علی خاں رئیس مغل پورہ اعظم آباد نے نزولِ کلام مجید اور بعثت حضرت ختم المرسلین کی تاریخ اِسی آیت سے نکالی۔ اور کیا خوب نکالی:

چوں بماہِ رجب شدی مبعوث
اے رسولؐ، از عنایتِ معبود
پیش تو از زبانِ خود، جبریلؑ
امر، اِقرا باسمِ رب فرمود

اقرا باسم رب = ٦٠٧
زبان جبریل (ج) = ٣
٦١٠ عیسوی

۳۔ دونوں ایک:

سال جلوس فرخ سیر بادشاہ: جمعہ ۲۳ / ذی الحجہ ۱۱۲۴ ہجری۔ علامہ سیّد عبدالجلیل بلگرامی نے اِس کی تاریخ کہی:

یورثھا من یشاء... ۹۔ سورۂ اعراف (۱۲۸)
۱۱۲۴ ہجری۔

یعنی ''جس کو چاہتا ہے اُس کو وارث بنا دیتا ہے۔'' اس آیت میں ہمزہ کا عدد ایک لیا گیا تب تاریخ ہوئی۔ اس لیے ہمزہ اور الف دونوں ایک۔

۴۔ کج می نشیند:

افسانہ گو کہتے ہیں کہ ہمزہ کے دل میں چور تھا۔ چوروں کی طرح دیوار پھاند کر اُس نے خانۂ ابجد میں آنا چاہا۔ پھاندنے میں اس زور سے گرا کہ ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ جو چور کی سزا وہ ہمزہ کی سزا۔ بصد رسوائی خانۂ ابجد سے نکالا گیا۔ جیسی کرنی ویسی بھرنی۔ اب وہ نہ کھڑا ہوسکتا ہے۔ نہ بیٹھ سکتا ہے۔ نہ لیٹ سکتا ہے۔ یعنی ہمزہ کج می نشیند۔

۵۔ پیچش بمعنی پیچ تاب۔

۶۔ راست مزہ۔ شیریں۔

۷۔ سُکان ــــ باشندگان۔ دنبالۂ کشتی

۸۔ میل۔ سلائی۔

۹۔ مستطیل۔ الف کا طول زیادہ، عرض کم ہے، اس لیے اس کی شکل مستطیل ہے۔

۱۰۔ لوا ــــ نشان لشکر۔ علم فوج۔

۱۱۔ مدلول۔ معنی مدعا۔

۱۲۔ ترکش حروف ــــ حروف ابجد کی ترکش میں صرف ایک تیر ہے۔ اس تیر کا نام الف۔

۱۳۔ خذحرفاً قل الفاً۔ یعنی لو ایک حرف کہو ہزار۔ الف ایک بھی ہے اور الف ہزار بھی۔

۱۴۔ جنگلی یک پا۔ حیوان بصورت انسان جو ایک ہی پاؤں رکھتا ہے۔

۱۵۔ سر در ہوا۔ پریشان و آوارہ۔

۱۶۔ سیہ زبان ــــ یعنی کل جبھا۔ کالی جیبھ والا۔ وہ جس کی بددعا جلد اثر کرتی ہے۔

۱۷۔ مبرہن۔ آشکار۔ ظاہر۔

۱۸۔ حروف علت ــــ یعنی الف بے عیب ہے تو اُس کا شمار حروف علّت میں کیوں ہوا؟

۱۹۔ گنج باد آورد ــــ یعنی مالِ مفت۔

خسرو پرویز کے خوف سے قیصر روم نے اپنا خزانہ کسی جزیرے میں پوشیدہ کرنے کے لیے بھیجا۔ لیکن بادِ مخالف خسرو پرویز سے مل گئی اور جہازوں کو تباہ کر کے کل خزانہ اُسی کو دے دیا۔ اس طرح خسرو پرویز نے یہ خزانہ بادِ مخالف سے پایا۔ اور اس خزانے کا نام گنج باد آورد ہوا۔

[رسالہ ''سہیل'' گیا۔ خاص نمبر ۱۹۴۱ء]

س ۔ ش ۔ ص

تمہید

آبِ سوہن کی بھی کیا بات ہے۔ یہ بات قند میں نہیں۔ مصری میں نہیں۔ پھر نیل و جیحون و فرات کو کون پوچھے؟ ہندوستان سچ پوچھو تو کجلی بن ہے۔ ظلمات ہے۔ اس ظلمات میں آبِ حیات کرن کہ آبِ سوہن:

خوشتر بود آب سوہن از قند و نبات
با وے چہ سخن ز نیل وجیحون و فرات
ایں پارۂ عالمے کہ ہندش نامند
گوئی ظلمات و سوہن است آبِ حیات

(غالبؔ)

سکندر کی نادانی دیکھو کہ اس آب حیات کے لیے وہ کہاں کہاں کی خاک چھانتا رہا۔ اُس بیوقوف کو چاہیے تھا کہ آنکھ بند کیے ہوئے آرہ شاہ آباد چلا آتا۔ یہاں سوہن کا پانی اُس کو سرتاپا روح کردیتا۔ یعنی زندۂ جاوید:

چو اسکندر ز نادانی ہلاکِ آبِ حیوانی
خوشا سوہن کہ ہر کس غوطہ زد در وے تنش جاں شد

(غالبؔ)

ایک دن کا ذکر ہے کہ غالب کے ہاتھ میں پیالہ تھا اور ساقی کون کہ خود

حضرت جبریلؑ۔ ساقی نے پیالے میں شراب ڈالی۔ شراب رگوں میں دوڑنے لگی۔ بادہ نوش بہکنے لگا۔ نشے میں ہاتھ بڑھا کر بے محابا جبرئیلؑ کا دامن پکڑ لیا۔ کہا کہ "ارے یار غمگسار! ذرا یہ تو بتلاتا جا کہ:

۱۔ نہیں اپنے کو ہاں کہتا ہے۔ یہ دعویٰ درست ہے یا نہیں؟ . گفت کفرست در طریقتِ من

۲۔ تو پھر زمین و آسمان کی نمود کیسی؟ .... گفت، ہے ہے نمی تواں گفتن

۳۔ دشمن جاں کا گاہک ہے۔ ہم کریں تو کیا کریں؟ ...... گفت طرحِ بنائے صلحِ فگن

۴۔ جاہ و منصب کے پیچھے دنیا اس قدر کیوں مٹی ہوئی ہے؟.. گفت دامِ فریبِ اہرمن

۵۔ دہلی سے کلکتہ ہم کو کھینچ کر کون لایا؟.............. گفت، جور و جفائے اہلِ وطن

۶۔ حضرت دہلی آخر ہیں کیا؟ .... گفت جان ست وایں جہانش تن

۷۔ اور راج کماری بنارس؟ .... شاہدے مست، محوِ گل چیدن

دہلی اور بنارس کے بعد عظیم آباد اور آرہ کی باری آئی:

گفتمش چوں بود عظیم آباد؟
گفت رنگیں تر از فضائے چمن
گفتمش سلسبیل خوش باشد؟
گفت، خوشتر نباشد از سوہن

(غالبؔ)

غالب نے پوچھا: عظیم آباد؟ جبریلؑ نے کہا: بھلا چمن میں یہ رنگینی کہاں؟ پوچھا: سلسبیل؟ جبریلؑ نے کہا: دور کا ڈھول سہاونا! آزمانا ہو تو آرہ چلے جاؤ۔ دریائے سوہن کا ایک چلو پانی پی لو۔ پھر سلسبیل کا کبھی نام بھی نہ لو۔

دریائے سوہن کے ساتھ ساتھ آرہ میں دریائے سخن بھی موج زن ہے اور موجوں سے آواز آرہی ہے کہ:

اے اہلِ نظر عجیب جا ہے آرہ
گلزار ہے باغ پُر فضا ہے آرہ

اِس باغ کو انقلاب کا خوف نہیں
اُلٹیں جو اِسے تو بھی ہرا ہے آرہ

(صفیر بلگرامی)

آرہ جن لوگوں کی وجہ سے جہاں آرا ہوا، اُن میں موہان ضلع اناؤ کے سادات زیدی کا وہ خاندان بھی تھا جس کے چشم و چراغ سید وارث علی، سید طالب علی اور سیّد امیر علی مرحومین تھے۔ رائٹ آنریبل سیّد امیر علی کی شادی لندن میں مس اسپلی بنت مسٹر کوہنتاج سے ہوئی۔ یہ وہی مس اسپلی ہیں جن کے صدقے میں دنیا کو ''اسپرٹ آف اسلام'' کے ایسی نادر تصنیف نصیب ہوئی۔ نوشاہ عروس کو لے کر لندن سے کلکتہ آیا تو ریپن پریس کلکتہ نے ایک قطعۂ تہنیت پیش کیا جس کے چند اشعار یہ ہیں:

میرے اشعار ہیں شایانِ مبارک بادی
ہیں یہ رنگیں گلِ بستانِ مبارک بادی
فال کھولی تو پڑی حالِ زلیخا پہ نظر
مل گیا مطلعِ دیوانِ مبارک بادی
رسم شادی کا ہوا تیرے لیے لندن میں
اب یہاں بھی تو ہے شایانِ مبارک بادی
عقد سے تیرے شگفتہ ہوئی مس اسپلی
خوب پھولا تھا گلستانِ مبارک بادی
مولوی بھی تو ہے، سید بھی ہے مشہورِ جہاں
پھر امیر اور علی جانِ مبارک بادی
حقِ ممدوح میں ہر وقت دعا ہے یہ وزیر
ہو عیاں مہرِ درخشانِ مبارک بادی

پانچویں شعر میں حالِ زلیخا سے مراد یہ ہے کہ مس اسپلی نے اپنے کنبے سے

لڑ جھگڑ کر یہ عقد کیا تھا۔ وہ خود بڑی عالمہ و فاضلہ تھیں اور اُن کا گھرانا دولتِ علم و وجاہت سے مالا مال تھا۔

رائٹ آنریبل سید امیر علی کے بڑے بھائی ڈپٹی سید وارث علی خاں، اُن کی شادی نواب بہادر سید ولایت علی خاں بہادر رئیسِ عظیم آباد کی خالہ زاد بہن شاہ بیگم سے ہوئی۔ شاہ بیگم اپنے میکے میں آج تک آرہ والی بیگم مشہور ہیں۔ کیوں کہ اُن سے پہلے یا بعد خاندان گذری عظیم آباد سے، یا یوں کہیے کہ صاحبِ سیرالمتاخرین، میر غلام حسین خاں کے خاندان سے کوئی لڑکی آرہ نہیں گئی۔

تقریباً اسّی برس ہوئے کہ ڈپٹی وارث علی خاں نے عظیم آباد میں اپنی صاحب زادی کی چھٹی کی۔ رقعۂ نوید نواب بہادر سید ولایت علی خاں کی طرف سے تقسیم ہوا۔ نواب بہادر ہی کے دولت خانے میں جلسہ تھا۔ صحن میں محفل نشاط۔ صحن کے بعد پھاٹک اور اُس کے بعد وہ سڑک جو پچھم دروازے سے پورب دروازے کو جاتی ہے۔ اس صحن میں چند احباب جمع تھے۔ ایک نووارد اپنے اشعار سنا رہا تھا۔ پاس ہی دو لڑکے کھیل رہے تھے۔ ایک کی عمر آٹھ برس۔ دوسرے کی گیارہ برس۔ کھیل یہ تھا کہ ایک مونڈھے کو دونوں اِس طرح ٹھکراتے کہ وہ صحن سے پھاٹک تک چلا جاتا۔ پھاٹک کے بعد ہی سڑک تھی۔ اِس لیے دونوں لڑکے دوڑ کر پھاٹک سے مونڈھے کو لے آتے۔ اُسی طرح پھر ٹھکراتے۔ پھر دوڑ کر جاتے۔ پھر لے آتے۔ اور جب دوڑتے دوڑتے تھک جاتے تو وہی مونڈھا بچھا کر خود اُس پر بیٹھ جاتے!

لڑکوں کی یہ ادا نووارد کو بھا گئی۔ نووارد اِن دو میں سے ایک کو پہچانتا تھا۔ جس کو نہیں جانتا تھا، اُس کی عمر اس وقت گیارہ برس کی تھی۔ پوچھا۔ نام کیا ہے؟ لڑکے نے نووارد کو اپنا نام بتلا دیا۔

کیسی شاہ بیگم؟ کہاں کا جلسہ؟ کیسی شعر خوانی؟ کہاں کا مونڈھا؟...... بات صرف اتنی تھی کہ قضا و قدر کو ایک دن یوں منظور ہوا کہ آرہ اور عظیم آباد کی طنابیں کھنچ جائیں اور وہ نووارد اِن دونوں لڑکوں کے ساتھ ایک ہی جال میں اِس طرح آجائے کہ

مرنے کے بعد بھی چھٹکارا نہ ہو۔ قضا و قدر کے جال میں اِن تینوں کا بہ یک وقت آجانا ایسا ہی تھا جیسا حروف تہجی کی محفل میں س، ش، ص کا ایک ساتھ جگہ پانا اور اِسی واقعے سے اُن کہانیوں کا آغاز ہوتا ہے جن کے لیے ایک ہزار ایک راتیں بھی کم ہیں:

تمھارا ہم سے ملنا یادگار اے جانِ عالم ہے
جو گزرا آج آنکھوں سے وہ کل افسانہ ہوتا ہے
(صفیر بلگرامی)

دونوں لڑکے کون تھے؟ نووارد کون تھا؟...... جواب یہ ہے کہ س، ش، ص۔

باب اول

دربیانِ — س

نواب بہادر کے ہاں جو تقریب تھی، اُس کے چند سال بعد عظیم آباد میں ایک اور تقریب ہوئی۔ اس تقریب میں لکھنؤ سے حیدر جان آئی۔ تھی تو لکھنوی مگر مکھڑا دیکھو تو ملیح آبادی۔ اور آنکھیں دیکھو تو جامی۔ اور نیچی نگاہیں دیکھو تو بلند شہری۔ اور سرے کی تحریر دیکھو تو اصفہانی۔ اور زلفیں دیکھو تو شامی۔ اور صباحت دیکھو تو بنارسی۔ اور شان دیکھو تو شکوہ آبادی۔ اور جذبۂ دل دیکھو تو نجدی۔ اور کافر ماجرائی دیکھو تو الٰہ آبادی۔ اور بے نیازی دیکھو تو فتح پوری!...... الغرض حیدر جان عظیم آباد آئی تو کسی نے کہا کہ خانۂ انوری کو ڈھونڈنے والی بلا آئی۔ کسی نے کہا کہ کرشن جی کی بانسری آئی۔ کسی نے کہا کہ نواب مرزا کی مثنوی زہر عشق آئی۔ مگر خانقاہوں سے صدا آئی کہ خبردار! ہوشیار! نادر کی تلوار آئی!!

اِدھر حیدر جان محفل میں آئی اُدھر ''زلفِ شب تابہ کمر'' آئی مگر دیکھنے والوں کی آنکھیں بھی عجیب آنکھیں تھیں۔ جس سے پوچھو یہی کہتا ہے کہ آفتاب سوا نیزے پر آ گیا۔ اِس سحر کو باطل کس نے کیا کہ خود حیدر جان کی ٹھمری نے:

توری سانوری صورت مورا من بھائے
مدھ بھری انکھیاں، کجرا سہائے

حضرت سید فرزند احمد صفیر بلگرامی

نواب سید تجمل حسین خان
عرف سید سلطان مرزا
سلطان عظیم آبادی

خان بہادر میر علی محمد شاد عظیم آبادی
سید علی خان مرحوم خلف جناب شاد

چال البیلی، نپٹ نویلی
دیکھو حیدر! مورا جیرا تڑپائے

محفل آئینۂ حیرت تھی۔ اُس محفل میں ایک رئیس زادہ بھی تھا۔ قضا کار اُس رئیس زادے پر حیدر جان کی نظر پڑی تو ایسی پڑی کہ دفعتاً شمعِ محفل خود پروانہ ہوگئی۔ نادر کی تلوار جھن سے دو ٹکڑے ہوگئی۔ مثنوی زہرِ عشق میں آگ لگ گئی۔ کرشن جی کی بانسری کھوگئی۔ اور خانۂ انوری کو ڈھونڈنے والی بلاخود بلاؤں میں گرفتار ہوگئی۔ اب اُس رئیس زادے کا حال پوچھو تو حال یہ ہے کہ:...... ''الفت کی آنکھ بیچ میں دلاّل ہوگئی''۔

تقریب ختم ہوئی اور قافلۂ دزدانِ لکھنؤ نے لکھنؤ کا قصد کیا تو عشق نے حیدر جان کو راہیں بتلا دیں۔ اُس نے اپنی ماں سے صاف کہہ دیا کہ عظیم آباد دامن نہیں چھوڑتا۔ ماں مجبوراً ٹھہر گئی۔ جب سال بھر ہوگیا اور پھر بھی حیدر جان نے جانے کا نام نہ لیا تو آخر اُس کی ماں بیماری کا بہانہ کر کے خود لکھنؤ چلی گئی اور وہاں سے اپنی بہن کو بھیجا کہ جس طرح بنے اِس دیوانی کو عشق کے پھندے سے چھڑا کر لے آ۔ اُس علاّمہ نے یہاں پہنچ کر آسمان زمیں ایک کردیا اور غریب حیدر جان کو عظیم آباد آخر چھوڑنا ہی پڑا۔ رئیس زادہ عشق کا مارا اپنی روئداد یوں بیان کرتا ہے:

کیا کہوں اُس فراق کا احوال — وہ مرا رنگ ، وہ مرا احوال
نہ اُسے اختیار رہنے کا — نہ مجھے وقت بات کہنے کا
شاق تھی اُس نگار کی دوری — تا بہ آرہ گیا بہ مجبوری
ریل جس وقت آرہ میں ٹھہری — جمع تھے سب دیہاتی اور شہری
اُس گھڑی میں اُٹھا جو پہلو سے — بھرے آنکھوں کو اپنے آنسو سے
اور بولا کہ لو خدا حافظ! — مجھ کو اب جانے دو خدا حافظ!
گو کہ دل کو ذرا قرار نہیں — آگے جانے کا اختیار نہیں
سننا تھا یہ کہ وہ بجوشِ فغاں — بولی، ہیں ہیں! کہاں کہاں یہ کہاں؟

میں نہ مانوں گی۔ میں نہ مانوں گی!
اترو گے تم تو جان دے دوں گی!

کہہ کے یہ، میرا تھام کر دامن چاہا بٹھلا لے ریل میں فوراً
میں نے ہٹ کی، بہ التجا ہٹ کر دامن اتنے میں رہ گیا پھٹ کر!
کھول کر کھڑکی اور دے کے دعا ریل کے نیچے میں اتر ہی پڑا
اور کھڑکی کو تھام کر اک بار بولا، چلنے میں مجھ کو کیا انکار
پر مناسب نہیں مرا جانا تمھیں سمجھو کہ ایسا کیا جانا
عزتِ خانداں کا بھی ڈر ہے دم بہ دم باپ ماں کا بھی ڈر ہے
کہتے تو یہ کہا، مگر کہوں کیا دل پہ صدمہ جو کچھ گزرتا تھا
ریل کی سیٹی اُس طرف کو بجی اور دونوں کا سنسنا گیا جی
اِس طرف آہ تھی اُدھر نالے آنکھوں سے آنسوؤں کے پرنالے
دونوں حیرت سے تکتے تھے باہم ہائے کچھ کہہ نہ سکتے تھے باہم

رئیس زادہ، محبت کا مارا، چھاتی پر پتھر رکھ کر حیدر جان سے رخصت ہوا۔ وہ لکھنؤ گئی۔ یہ آرے سے عظیم آباد واپس آیا۔ مگر کس حال میں؟

میری حالت وہ تھی معاذ اللہ کہ نہ دکھلائے وہ گھڑی اللہ
آرے سے آیا تو میں گھر کو مگر لانے والوں کو ہے کچھ اِس کی خبر
آہ ایسا ہوا جو میں دل گیر دل نے کی جان لینے کی تدبیر
کھانے پینے کو بھی جواب دیا بلکہ جینے کو بھی جواب دیا
سارے دروازے بند اندر سے لوگ چلّائے آ کے باہر سے
بند آنکھیں، زمین پر تھا پڑا نقشِ پا تھا امید رفتہ کا!

ماں کو خبر ہوئی تو صاحب زادے کے پاس تشریف لائیں۔ دیکھ کر بہت روئیں۔ پوچھا کھانا کیوں چھوڑ دیا ہے؟ بیٹے نے لحاظ سے کچھ جواب نہ دیا۔ مگر اور لوگ پوچھنے آئے تو شرط پیش کی کہ کھلانا ہو تو حیدر جان کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا لاؤ۔ یہ راز کھلا تو اُسی وقت ایک آدمی لکھنؤ بھیجا گیا۔ اِس کی خبر رئیس زادے کے باپ کو ہوئی تو حکم آیا کہ ہم آج کلکتہ جا رہے ہیں۔ تم بھی تیار رہو۔ رئیس زادہ اِسی فاقے کی

حالت میں اٹھ کھڑا ہوا اور باپ کے ساتھ کلکتہ پہنچا۔ ادھر یہ کلکتہ پہنچا اور ادھر لکھنؤ سے حیدر جان کے تحائف عظیم آباد پہنچے۔ رائے ہوئی کہ اِن چیزوں کو اسی طرح کلکتہ پہنچ جانا چاہیے۔ چیزیں کلکتہ پہنچیں تو خدا خدا کر کے پورے سات دن کے بعد رئیس زادے نے فاقہ شکنی کی:

بسکہ دلبر کے ہاتھ کا تھا طعام — ہوئے خوشبو مرے دماغ و مشام

میری مرغوب تھیں وہ سب چیزیں — خوب سے خوب تھیں وہ سب چیزیں

لقمہ جو تھا وہ بس تھا وجہِ حیات — شکرِ رازق کہ اُس نے رکھ لی بات!

ورنہ میں اور ہفتہ بھر یہ ضبط؟ — اور قائم رہے حواس کا ربط؟

عقل کہتی ہے زور اُمید کا تھا — کہ ہے قائم اُمید پر دنیا

آس ملنے کی گو تھی ٹوٹی ہوئی — اور عنانِ شکیب چھوٹی ہوئی

پر وہ الفت کہ جس نے دونوں پر — سحر کی طرح سے کیا تھا اثر

جانتے کب تھے اِس کو ظاہر بیں — ایک واقف تھے اِس کشش سے ہمیں

اِس کی حالت کو بس وہی جانے — جو کہ نبضِ وفا کو پہچانے

الغرض جب کہ کھایا وہ کھانا — من و سلویٰ جسے کہ تھا جانا

اور اُمّید کو ہوئی قوت — اب تو بڑھنے لگی مری طاقت

رات دن یہ، خیال گھر جائیں — جلد اس مہ لقا کو بلوائیں

رہنا کلکتے کا ہوا دوبھر

سر پہ منزل سوار آٹھ پہر

رئیس زادہ الفت کا مارا کلکتہ سے عظیم آباد آیا تو ایک قاصد کو نامۂ شوق[۱۱☆] دے کر حیدر جان کے پاس لکھنؤ بھیجا:

اے تمنائے عاشقِ ناکام — دل ربائے زمانہ، دلبر نام

تو سلامت رہے بصد خوبی — روز افزوں ہو تیری محبوبی

تو مسلمان ہے جو اے کافر — یاد کر اپنے قول کو آخر

تجھ کو سوگندِ شاہِ خیبر ہے بالیقیں تو کنیزِ حیدر ہے
کیا میں دوں اس سے بڑھ کر اور قسم کیا یہ کہنا کہ اے نجستہ صنم
تجھ کو اپنی اداؤں کی سوگند! تجھ کو میری وفاؤں کی سوگند!
اپنے حیرانِ نیم جاں پہ نظر! جلد لے جلد آ کے میری خبر!
ختم اب داستانِ حیراں ہے خطِ سلطانِ عشق بازاں ہے

حیدر جان نے یہ خط پایا تو تڑپ گئی۔ ماں سے کہا کہ اب لکھنؤ کو سلام ہے۔ ماں نے کہا کہ دیوانی! لکھنؤ چھوڑنے کی چیز ہے؟

گل سے رنگیں تر ہیں خارِ لکھنؤ نشہ سے بہتر خمارِ لکھنؤ

تب الفت کی ماری نے جواب دیا:

سب سمجھتی ہوں میں پہ زور نہیں دل چھڑاتا ہے لکھنؤ کی زمیں
گو ہو غربت میں ہر طرح ایذا ہو گوارا جو دل کو، کیا پردا

ماں نے جب دیکھا کہ عظیم آباد جانے پر یہ تلی ہوئی ہے تو اُس نے روسائے لکھنؤ کو ابھارا کہ:

یہ حسیں جانے کی سناتی ہے آبرو لکھنؤ کی جاتی ہے
اب رئیسوں کو یاں کے لازم ہے کہ وہ دلبر ہزار عازم ہے
روک لیں اس کو جس طرح بن آئے کوئی فقرا دے، کوئی بات بنائے
پھر تو کیا تھا، تمام اہلِ دول ہوگئے سن کے یہ خبر، بے کل
کوئی آیا کسی نے بلوایا خوب سمجھایا، خوب سمجھایا
پر سمجھتے کہیں ہیں دل دادہ؟ کہیں گرتا ہے کار افتادہ؟
سب کی جانب خطاب ایک ہی تھا سب کو اُس کا جواب ایک ہی تھا
بس نہ اِس امر میں کلام کریں میرا جینا نہ اب حرام کریں
میری حالت پہ چھوڑ دیں مجھ کو قصدِ غربت ہے چھوڑ دیں مجھ کو
کیا ہوا، گو کہ دور جاؤں گی جاؤں گی میں، ضرور جاؤں گی

میرا دلِ اِس جگہ نہیں لگتا
دلِ وحشی بھی ہے کہیں لگتا!

جب یہ تیر بھی خطا ہوا تو حیدر جان دھوکے سے ایک مکان میں بند کر دی گئی۔ باہر سے قفل لگا دیا گیا۔ اس طرح کہ:

التفاتِ جہاں سے نا اُمید مثلِ یوسف ہوئی زلیخا قید
سر پہ چھت، زیرِ پا زمیں خالی گرد دیواریں روکنے والی!
تھے طبیعت کی طرح بند کواڑ اور چاکِ دل و جگر تھے دڑاڑ
نا امیدی جو ہوش کھو دیتی پھر تو مایوس ہو کے رو دیتی
باتیں اور ہم زباں نہیں کوئی! راز اور رازداں نہیں کوئی!
سوچ ہی سوچ کر وہ چپ رہنا اپنے ہی دل سے کہنا جو کہنا
الغرض اُس پہ بندشیں لاکھوں اُس کے رہنے کی سازشیں لاکھوں
پر محبت میں جو کہ کامل ہو کب وہ اِن بندشوں سے بے دل ہو
اِنھیں باتوں میں اُس نے خاطر خواہ سوچتے سوچتے نکالی راہ
واہ رے زورِ جذب کامل کا! ٹوٹتا کب ہے سلسلہ دل کا؟
کششِ جذبۂ محبت ہے! تار برقی کی کیا حقیقت ہے؟

نتیجہ یہ ہوا کہ:

سلسلہ وعظ و پند کا ٹوٹا! قفل سب قید و بند کا ٹوٹا
کھلے بندوں، وہ پائے بندِ وفا لکھنؤ سے چلی بصدق و صفا
کون[☆۲] کہتا ہے عشق کو مذموم! حال اِس کا اُسے نہیں معلوم
کون کہتا ہے، یہ ہے بے تاثیر! اِس کی ظاہر نہیں اُسے تاثیر
کون کہتا ہے عاشقِ ناکام مفت ہوتا ہے عشق میں بدنام
دلبروں کو اثر نہیں ہوتا؟ کوئی اُن میں خبر نہیں ہوتا؟
بے خبر خود ہے جو یہ کہتا ہے یاں تو مجھ پر یہ حال گزرا ہے

اپنی گزری کو جھوٹ کیوں جانوں باتیں نا واقفوں کی کیا مانوں؟

عشق کی مہم سر کرتی ہوئی حیدر جان پھر عظیم آباد پہنچی۔ نادر کی تلوار پھر مسلّط ہوگئی۔ حیدر جان کے ہاتھوں عظیم آباد نو برس تک دارالحرب بنا رہا۔ نادر کی تلوار نو برس تک عظیم آباد میں قتل عام کرتی رہی۔ اِس قتل عام کی وجہ حیدر جان کی صورت نہیں بلکہ سیرت۔ اُس کا بانکپن نہیں بلکہ کمال فن تھا۔ حاضر جواب تھی، موسیقی میں انتخاب تھی، سنجیدہ تھی، مہذب تھی، شاعرہ تھی، باوفا تھی، پاک باز تھی۔ واضح رہے کہ بقول عبید زاکانی پاک باز اُس کو کہتے ہیں جو ایک ہی عاشق پر اکتفا کرے۔

حیدر جان کی پاک بازی اُس کے سر پر قیامت لائی۔ یعنی جب لوگوں نے دیکھا کہ نو برس کے بعد بھی وفا کی مہندی حیدر جان کی ہتھیلیوں کو اور لال کرتی جا رہی ہے تو سازش کر کے لکھنؤ سے امراؤ کو بلوایا۔ اِس سازش میں خود حیدر جان کی ماں شریک تھی۔ حیدر جان محرم میں ہر سال لکھنؤ جایا کرتی اور صفر میں واپس آجاتی۔ یہ سلسلہ نو برس تک رہا۔ دسویں برس کیا ہوا، اِس کا حال رئیس زادہ یوں بیان کرتا ہے:

سنو یہ طرفہ داستان سنو نئی تجویز کا بیان سنو!
دلبر اک سال لکھنؤ جو گئی گزرے اُس کو وہاں مہینے کئی
اُس کی ماں نے کنیز اک پالی نام امراؤ، رنگ میں کالی
بد شمائل کریہہ صورت تھی طبع کو جس سے خود کراہت تھی
دلبر آنے لگی جو پٹنے کو دم دیا، میرا دم اُلٹنے کو
یعنی امراؤ کو بھی ساتھ کیا اور سمجھا کے اُس کو کہہ بھی دیا
دل کو نواب کے لبھا لینا سختیاں جو پڑیں اُٹھا لینا
فتنہ تھی وہ بلائے مبرم تھی شعبدہ بازوں کی وہ محرم تھی
یاں جو آئی تو کچھ زیادہ بڑھی ناگہاں ایک روز سر پہ چڑھی

امراؤ کس ضرورت سے بلائی گئی ہے۔ کس ضرورت سے بھیجی گئی ہے۔ نہ رئیس زادے کو معلوم۔ نہ حیدر جان کو معلوم۔ ان غریبوں کو یہ بھی خبر نہیں کہ سازش میں

کون کون لوگ ہیں اور کیا کیا جال بچھائے جارہے ہیں۔ بہرکیف امراؤ کی شعبدہ بازیوں نے رئیس زادے اور حیدر جان کے بیچ میں ایک دیوار کھڑی کر دی۔ اور حیدر جان اب اپنا سر پھوڑنے لگی:

واہ نواب صاحبِ ذی جاہ   آپ کی آنکھ سے خدا کی پناہ
سچ ہے، جی بھر گیا حضور کا بھی   اور پلّہ ہے مجھ کو دور کا بھی!
لیجیے لکھنؤ میں جاتی ہوں!   پردۂ درمیاں اُٹھاتی ہوں
خیر یہ بھی مقدر اپنا ہے!   کیوں میں سمجھی تھی یہ گھر اپنا ہے؟
گزرے کیا جانیں نو برس کیوں کر   پورے اب مجھ سے ہوں گے دس کیوں کر؟

نتیجہ یہ ہوا کہ:

روٹھ کر میرے پاس سے اُٹھی   دیکھ کر چشم یاس سے اُٹھی
گر پڑی جاتے ہی پلنگڑی پر   اور رونے لگی مری دلبر
لاگ دل کی یہی بجھاتی ہے   یوں ہی الفت میں آفت آتی ہے

اس افتادِ ناگہانی نے رئیس زادے کو مجنوں اور حیدر جان کو نیم جاں کر دیا۔ عالمِ یاس میں وہ لکھنؤ جانے لگی تو عظیم آباد نے پھر دامن پکڑا۔ کہا کہ جاتی ہے تو پہلے دل اپنا یہیں چھوڑے جا۔ باوفا نے جواب دیا کہ دل! دل! دل ہے کہاں؟ وہ تو کب کا مر چکا۔ نماز میت بھی ہو چکی ہے۔ قبر بھی کھد چکی!...لے اب ہم کو لکھنؤ جانے دے:

نہ دوری دلیل صبوری بود
کہ بسیار دوری ضروری بود

لکھنؤ جا کر حیدر جان پھر عظیم آباد آئی۔ پھر گئی۔ پھر آئی۔ عشق اپنی نیرنگیاں دکھلاتا رہا۔ ساقی نے غالب سے سچ کہا تھا کہ عظیم آباد کی رنگینی چمن کو بھی نصیب نہیں۔

عہد محمد شاہ میں محمد حسن اور شام سندر کا واقعہ عظیم آباد سے دلی تک آگ لگا چکا تھا۔ وہی شام سندر جس کا واقعہ خدائے سخن میر تقی علیہ الرحمہ نے اپنی مثنوی ''شعلۂ عشق'' میں اِس سرخی کے ساتھ قلم بند کیا ہے:

''آغاز قصۂ جاں کاہ کہ در عہد محمد شاہ در عظیم آباد روبروے وضیع و شریف

بظہور پیوستہ''۔

جناب شوق نیموی مرحوم ''یادگار وطن'' میں لکھتے ہیں کہ محمد حسن عظیم آبادی کا مکان چھوٹی پٹن دیبی محلّے میں تھا۔ اور شام سندر عظیم آبادی کے نام پر سندر باڑا محلّہ عظیم آباد چوک کے قریب باڑے کی گلی اور کچوری گلی کے درمیان واقع ہے۔ شام سندر ایک مہاجن کی لڑکی تھی۔

بہرکیف واقعۂ شام سندر سے تقریباً ڈیڑھ سو برس بعد اُسی عظیم آباد میں تیغِ محبت نے حیدر جان کو گھائل کیا تو جناب سلطان عظیم آبادی نے مثنوی ''درد دل'' لکھی۔ شام سندر کے عاشق نے ایک وصیت نامہ چھوڑا تھا جس کی اصل اب ناپید ہے۔ مگر نقل خواجہ عبداللہ تائید عظیم آبادی نے شاہ زادہ جہاں دار کو بھیجی تھی۔ یہ نقل شوق نیموی کی ''یادگار وطن'' میں موجود ہے۔ حیدر جان کے عاشق نے بھی ایک خط لکھا تھا۔ وہ اصل خط راقم الحروف کے پاس محفوظ ہے۔

انتخاب از نقل وصیت نامہ محمد حسن عظیم آبادی:

''اے یاران وفاکیش... شما از حالِ منِ آوارۂ کوچۂ محن... محمد حسن آگاہی ندارید؟ و نائرہ شعلہ عشق انگیز کہ... کاشانۂ دلم را خاک سیاہ نمودہ، ازاں بے خبر ہستید؟ شمع رخے کہ دلم را پروانہ وار کردہ، وآخر در سوگِ من جاں دادہ، درحقیقت دخترِ مہاجنے بود (اس سے مراد شام سندر ہے) کہ... روزے بلبِ دریا با اُو دو چار شدم... از احباے من میر محمد رضا کہ فی الحال بدہلی ہستند مفصلاً آگاہی دارند۔ ازیشاں پرسیدنی است... اکنوں بہ تحقیق پیوست کہ از چند روز بعد نصف شب شعلۂ بشکل ہودج از آسماں سر می زند و بہ آں روئے دریا (اس سے مراد گنگا پار ہے یعنی خواجہ کلاں گھاٹ کے اُس پار جہاں چھتر کے میلے سے واپسی میں محمد حسن کی کشتی تباہ ہوئی تھی) فرود می آید... و بصدائے حسرت آمیز و لہجۂ درد انگیز مرا یاد می کند۔ نیک دانستم کی روحِ پاکِ آں غیرتِ حورِ لاثانی (یعنی شام سندر)...... بتلاشِ من زندہ درگور می آید۔ ہیہات ہیہات کہ من زندہ مانم و دعویِ عشق بر زباں رانم!......''

واضح رہے کہ اس وصیت نامے میں بار بار شعلۂ عشق کا ذکر ہے، ملک الشعرا میر تقی نے یہی نام اپنی مثنوی کے لیے چن لیا۔

انتخاب از اصل مکتوب... عظیم آبادی:

تب لوگوں نے (امراؤ سے) کہا کہ اری ظالم! تجھ کو عاشق و معشوق کے چھڑانے سے کیا مل جائے؟ (امراؤ نے) کہا تم نہیں جانتے؟... (بہرکیف) یہاں ایک مہینے تک اِس قیامت کا صدمہ اور رنج تھا کہ بیان سے باہر ہے اور اُنھوں نے (حیدر جان نے) ایسا رنج کیا کہ علیل ہوگئیں۔ کبھی تو اُن کو اُس کے (امراؤ کے) بیان کا یقین ہوتا تھا، کبھی لوگوں کی گواہی اور میری قسموں پر اعتبار آتا تھا۔ اور میں نے اِس کا ایسا صدمہ اٹھایا کہ تین مہینے تک تپ آیا کی... اب ہم کو اکثر صدمہ ہوتا ہے اور اگلی باتیں یاد کر کے رنج ہوتا ہے کہ یااللہ یہ کیا ہوگیا... کیوں کہ پندرہ برس کی محبت ہے۔ آج تک پندرہ برس ملاقات کو ہوگئے''۔

واضح رہے کہ اِس تحریر میں بار بار ''دردِ دل'' کا بیان ہے۔ جناب سلطان عظیم آبادی نے یہی نام اپنی مثنوی کے لیے چن لیا۔

مثنوی ''دردِ دل'' کے علاوہ حیدر جان نے اپنا نقش عظیم آباد کی شاعری پر کہاں کہاں چھوڑا ہے، اِس پر ایک کتاب لکھی جاسکتی ہے۔ یہاں چند شعر ایک یادگار مشاعرے کے لکھے جاتے ہیں۔ یہ اشعار طرحی غزل کے ہیں۔ ظاہرا اِن کو حیدر جان سے کوئی واسطہ نہیں۔ مگر غور سے دیکھیے تو بہت کچھ واسطہ ہے۔

سلطان عظیم آبادی:

باغ میں میلہ، میلے میں جلسہ، جلسے میں شیشہ، شیشے میں بادہ
لالہ رُخوں کی مست ادائیں، اُف ری جوانی، ہائے زمانے!
موسمِ گل میں دیکھ گلوں کو جوشِ طرب نے مست کیا ہے
پھٹ گئیں کیا کیا چست قبائیں، اُف ری جوانی، ہائے زمانے

آنے کی اُن کے دھوم ہے سلطاں، پر ہے قیامت آنا کیا ہے
راہ میں کب تک آنکھیں بچھائیں، اف ری جوانی، ہائے زمانے

جنابِ سلطاؔن کے پہلے شعر میں لالہ رخوں سے مراد عظیم آباد کی ''لولیانِ شوخ و شیریں کار'' ہیں جو ہر سال برسات میں حیدر جان کے ہاں جھولا جھولنے آتی تھیں اور دھانی جوڑے پاتی تھیں۔ جنابِ شاد کا پہلا شعر دیکھیے اور اِن دھانی دوپٹوں کا ہوا میں اڑنا دیکھیے۔

جنابِ سلطان نے دوسرے شعر میں موسمِ گل کی جو تصویر کھینچی ہے، اُس میں کسی کو شک ہو تو عبدالرحیم خانخاناں کا ایک دوہا ملاحظہ ہو:

بار بار درجن گھر جھگڑت ٹھاڑ
جوئی جوئی انگیا سیوت، سوئی سوئی کاڑھ

یعنی یہ جھگڑا کچھ آج کا نیا جھگڑا نہیں ہے۔ اُس کو جب دیکھو یہی دیکھو کہ درزن کے گھر کھڑی ہوئی جھگڑ رہی ہے۔ کہہ رہی ہے کہ انگیا ہم نے تجھ کو دی تھی درست کرنے کے لیے یا اور تنگ کر دینے کے لیے، تو یقینی چور ہے!

جوئی جوئی انگیا سیوت... یعنی جیسے جیسے تو انگیا سیتی ہے۔

سوئی سوئی کاڑھ... یعنی ویسے ویسے تو کپڑا اور کاڑھ (نکال) لیتی ہے۔

کہیں جواب ہے اس الھڑپن کا؟ جرم موسمِ گل کا اور چور بنائی جارہی ہے درزن!

جنابِ سلطان کا مقطع بول رہا ہے کہ حیدر جان اُس وقت لکھنؤ میں ہے۔ نامہ شوق جاچکا ہے۔ قاصد کا ہر روز انتظار ہے۔ حیدر جان کسی طرح آ نہیں چکتی۔ اور عظیم آباد میں یہ کسی کو ابھی تک خبر ہی نہیں کہ:

''مثلِ یوسفؑ ہوئی زلیخا قید!''

شاد عظیم آبادی:

کالی گھٹائیں، باغ میں میلے، دھانی دوپٹے، لٹ چھٹکائے
مجھ پہ یہ قدغن، آپ نہ آئیں، اُف ری جوانی، ہائے زمانے

اپنی ادا سے آپ جھجکنا، اپنی ہوا سے آپ کھٹکنا
چال میں لغزش، منھ پہ حیائیں، اُف ری جوانی، ہائے زمانے
شاؔد نہ وہ دیدار پرستی، اور نہ وہ بے نشہ کی مستی
تجھ کو کہاں سے ڈھونڈ کے لائیں، اُف ری جوانی ہائے زمانے

جناب شاد کے پہلے شعر میں کالی گھٹائیں ہیں۔ اِس کا واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ پری جمالوں کا جمگھٹ تھا، اُس جگہ جہاں آج پٹنہ محمڈن اسکول ہے۔ ہوا بند تھی۔ گرمی سخت تھی۔ آسمان پر بادل کا نام نہیں۔ مہمانوں نے میزبان سے، یعنی حیدر جان سے کہا کہ تمھارے ہوتے آسمان کا یہ رنگ؟ حیدر جان نے کہا۔ میں کچھ خدا تو ہوں نہیں۔ تم لوگ کفر بکتی ہو۔

اِس کے بعد حیدر جان کا جھولے کی طرف بڑھنا، جھولے کا پینگ میں آنا، حیدر جان کا کجری گانا، ہوا کا چلنا، زلفوں کا ہوا میں لہرانا، آسمان کا گھٹا ٹوپ ہونا، صاحبِ کن فیکون کا اپنی ایک کنیز کی ہٹ رکھ لینا، سقائے ابر کا اپنی مشک کی گرہ کھول دینا اور مہمانوں کا انگشت بدنداں ہونا، یہ سماں وہ تھا جو عظیم آباد دیکھ چکا ہے!

جناب شاد کا دوسرا شعر ہے۔ اپنی ادا سے آپ جھجکنا، اپنی ہوا سے آپ کھٹکنا، چال میں لغزش، منھ پہ حیائیں۔ یہ تصویر یادش بخیر خود حیدر جان کے ہاتھوں کی کھینچی ہوئی تصویر ہے:

چال البیلی، نپٹ نویلی!

جناب شاد کے مشہور مستزاد کا ایک شعر ہے:

رس بھری ہائے وہ آنکھیں تری کالی کالی، بے پیے متوالی
سانولا رنگ، نمک ریزِ جراحاتِ جفا، اُف کہاں دھیان گیا؟

یہ تصویر بھی پہچانی ہوئی ہے:

توری سانوری صورت مورا من بھائے
مدھ بھری انکھیاں کجرا سہائے

اب معلوم ہوا کہ شاعر کا دھیان کہاں گیا تھا!

اب سوال یہ ہے کہ سلطان عظیم آبادی کون تھے؟ اس کا جواب شاد عظیم آبادی کے قلم سے سنیے:

(۱) عنوان نامۂ شاد بنام سلطان:

شفیق حالِ دلِ مبتلائے کاکلِ یار
انیس خلوتِ راز و جلیس عاشقِ زار
کرم نما و خطا پوش و خسروِ ذیشاں
تمام ہندِ مروّت کے سرور و سلطاں
خدا جہاں میں سلامت رکھے قیامت تک
قریب آ نہ سکے تیرے کوئی آفت تک
بصد نیاز و بصد امتیاز و رسمِ قدیم
قبول خدمتِ عالی میں ہو مری تسلیم

(۲) حیات فریاد مؤلفہ شاد عظیم آبادی ص ۱۹۰:

''نواب سید تجمل حسین خاں عرف سید سلطان مرزا صاحب، تخلص سلطان۔ خلف نواب بہادر نواب سید ولایت علی خاں مرحوم۔ سلطان میرزا صاحب مرحوم نہایت شہ زور، خوش رو، خوش گفتار، خلق مجسم، رئیس ابن رئیس تھے۔ بہت کم عمری میں انتقال کیا۔ گو اُن کے انتقال کو ۲۵۔ ۲۶ سال ہوئے لیکن اہلِ عظیم آباد کے دلوں سے اُن کی یاد بھولی نہیں ہے۔ اُن کی ہمشیر کے پوتے نواب سید اسماعیل خاں بہادر عرف جگن نواب صاحب اُن کی یادگار ہیں۔ سلطان صاحب مرحوم کو شاعری میں تلمذ میر فرزند احمد صفیر بلگرامی سے تھا''۔

غالب کی ایک مشہور غزل کے دو شعر ہیں:

دیا ہے خلق کو بھی تا اُسے نظر نہ لگے
بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لیے

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے

اگرچہ یہ جامہ کسی اور کے لیے قطع ہوا تھا، مگر نواب سید تجمل حسین خاں عظیم آبادی کے جسم پر بھی ٹھیک ہو رہا ہے، ذرا جھول نہیں ہے۔

جناب سلطان عظیم آبادی اپنے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

''......میری کیا لیاقت تھی کہ شاعروں کے زمرے میں فروغ پاؤں۔ مگر یہ سب فیض استاد کامل الفن، سخن آموز سخن حضرت صفیر بلگرامی کا ہے کہ آج ۱۴ برس سے سوائے اُن کے کسی سے فیض نہیں پایا اور اُنھوں نے شفقت سے بہت کچھ بتایا۔ ۱۲۸۰ھ میں بدولت خانۂ سید علی محمد صاحب شاد شاگردی کا اتفاق ہوا۔ اِس چودہ برس کے زمانے میں دو دیوان عاصی کے مرتب ہیں، ایک دیوان بحر خفیف کا، دوسرا مختلف اور بحروں میں۔ اور دو مثنویاں تیار ہیں...''

ان دو مثنویوں میں ایک مثنوی ''دردِ دل'' ہے جس کا انتخاب گزر چکا ہے۔ اب ایک رباعی ملاحظہ ہو:

شہرہ جو یہ میری خوش کلامی کا ہے
یہ شور جو میری نیک نامی کا ہے
واللہ ہزار میں کہوں گا سلطاں
سب فیض صفیر بلگرامی کا ہے

مثنوی ''دردِ دل'' کے بارے میں جناب سلطان کا ایک خط حضرت صفیر بلگرامی کو گیا تھا۔ وہ یہ ہے:

''حضرت استاد صاحب قبلہ و کعبہ دام ظلہٗ۔ تسلیم۔ حضور نے بندے سے فرمایا تھا کہ جب میں آرہ اپنے مکان پر جاؤں گا تمھارا آدمی اپنے ہمراہ لیتا جاؤں گا... بلکہ میں نے میر پناہ علی کے بیٹے جو حضور کے حکم سے میرے پاس واسطے لینے کتاب ''ید بیضا'' کے آئے تھے، اُن سے میں نے کہا تھا کہ جناب استاد صاحب کی خدمت میں

عرض کرنا کہ حضور کب تشریف لے جائیں گے؟ آدمی میرا آپ کے ساتھ جائے گا... اور میری غزلوں کی کتاب حضور کے پاس ہے اور مثنوی بھی حقیر کی آپ کے پاس ہے۔ امیدوار ہوں کہ از راہِ شاگرد نوازی مثنوی اصلاح دے کر اور تمام فرما کر عنایت ہو کہ... یہ ہماری یادگار رہ جائے گی... میں وہی سلطان ہوں جو تھا اور وہی شاگرد ہوں جو تھا۔ آج یہ عریضہ نہایت رنج و غم میں تحریر ہوا۔ از خورداں خطا و از بزرگاں عطا... پس امیدوار ہوں کہ کتاب غزلوں کی مثنوی اصلاح فرما کر یا خود حضور کے ہمراہ آئے یا آدمی روانہ کروں، اُس کو عنایت ہو۔

نامہ سیاہ سید تجمل حسین خاں''۔

یہ سب کچھ ہوا مگر سلطان و شاد وصفیر کو اب تک کسی نے پہچانا نہیں۔ یہ وہی س۔ ش۔ ص ہیں جن کے لیے ایک دن عظیم آباد اور آرہ کی طنابیں کھنچ گئی تھیں اور جن کے لیے قضا و قدر نے نواب بہادر کے صحن میں اپنا جال بچھایا تھا۔ اُس صحن میں آٹھ اور گیارہ برس کی عمر کے دو لڑکے ایک مونڈھے سے کھیل رہے تھے اور ایک پردیسی اپنے اشعار سنا رہا تھا۔

آٹھ برس کا لڑکا سلطان عظیم آبادی۔ گیارہ برس کا لڑکا شاد عظیم آبادی اور پردیسی صفیر بلگرامی۔ وہ پردیسی نواب بہادر کا رقعۂ نوید پا کر شرکتِ تقریب کے لیے آرہ سے عظیم آباد آیا تھا۔

باب دوم

در بیان — ش

میرزا اہلی شیرازی کی ایک غزل کا مطلع ہے:

جانم بروزِ واقعہ پہلوئے او کنید
او قبلۂ من است، رُخم سوئے او کنید

''او قبلۂ من است'' اور ''رُخم سوئے او کنید'' کا معما اُس وقت حل ہوا جب میرزا اہلی شیرازی کو خواجہ حافظ شیرازی کے پہلو میں جگہ ملی۔ اور سنگِ مزار پر یہی غزل کندہ ہوئی۔ رحلت حافظ کی تاریخ ''خاکِ مصلیٰ'' (۷۹۲) اور رحلت اہلی کی تاریخ ''بادشاہِ شعرا بود اہلی'' (۹۴۲)۔ اِس کا مطلب یہ ہوا کہ ایران میں ڈیڑھ سو برس تک ایک شخص بھی اِس اہلیت کا نہ مل سکا کہ حافظ کے پہلو میں جگہ پاتا۔ اِس کا اہل صرف اہلی شیرازی تھا جو عالم غیب میں آج تک حضرت لسان الغیب سے غیب کی باتیں کر رہا ہے۔

میرزا اہلی شیرازی کا برادر عینی میرزا محمد ہاشم شیرازی۔ ہاشم کا چراغ ملا محمد رفیع شیرازی۔ رفیع کا پارۂ دل ملا غلام محمد شیرازی۔ ملا غلام محمد کا ماہ دو ہفتہ میرزا غلام حسین۔ یہ چاند اکبر آباد میں دیکھا گیا۔ یعنی حضرت جلال الدین شاہ عالم بادشاہ غازی نے سنہ ۱۸ جلوس میں اِس بچے کی پیدائش کی خبر سنی تو پرورش کے لیے خزانۂ عامرہ سے ایک سو روپیہ ماہانہ وظیفہ عطا فرمایا۔☆[۳] فرمانِ شاہی مؤرخہ رمضان المبارک ۱۱۹۰ ہجری کے الفاظ یہ ہیں۔

''دریں وقت میمنت اقتران از وقایع مولود فرزند ملا غلام محمد نوادہ

ملا ہاشم شیرازی و نام نہاد بہ مسمّٰی غلام حسین بہ سمع ہمایوں رسیدہ۔
حکم جہاں مطاع عالم مطیع بنام خازنِ خزانۂ عامرہ سلطانی بارشادِ
ماموری یک صد روپیہ سکہ کہن ماہانہ مصارف مرضعہ وغیرہم شرف
صدور فرمودہ...''

میرزا غلام حسین کا لختِ جگر میرزا سلامت علی، وہ سلامت علی جس کے گھر دولت سیادت بھی ہاتھ باندھے آئی۔ یعنی سیدہ بی بی بلبلِ ہزار داستان میر انشا اللہ خاں کی حقیقی نواسی۔ سیدہ بی بی بنت میر معصوم علی۔ اور میر معصوم علی؟

بود او زوجِ دخترِ انشا
سید و شاعرِ فصیح زباں!

میرزا سلامت علی کون؟ تخلص دبیر۔ شاگرد میر مظفر حسین ضمیر۔ استاد ضمیر اپنے شاگرد دبیر کو دیکھ کر باغ باغ ہوا جاتا ہے۔ پھولا نہیں سماتا۔ خط میں لکھتا ہے: ''برہانِ من، اسنادِ من، اعتضادِ من، اعتمادِ من سلمہ اللہ تعالیٰ''۔

میرزا سلامت علی دبیر وہ ہیں جن کے غلاموں کی فہرست میں خود سلطان ابن سلطان خاقان ابن خاقان حضرت جانِ عالم محمد واجد علی شاہ نے اپنا نام لکھوایا تھا۔ ثبوت؟ ثبوت یہ کہ:

''...... روزے در مجلس بالائے منبر بحضور اعلیٰ حضرت بخواندن مرثیہ
اتفاق افتاد۔ ناگاہ شامیانہ کہ بالائے منبر ہم چو ابرِ رحمت سایہ گستر
بود از ہوا پراگندہ گشتہ یکسو شد۔ وعکس آفتاب بر روئے آں جناب
افتاد۔ فی الفور ظل اللہ چتر خود طلبیدہ، وچوبش بدست خود گرفتہ
قریب منبر استادہ، تا اختتام مرثیہ سایہ افگن ماند......''
شمس الضحیٰ مصنفہ مولوی صفدر حسین، ص ۱۶۶۔

لکھنؤ کا واقعہ ہے کہ مجلسِ عزا میں ایک دن اعلیٰ حضرت واجد علی

شاہ بھی شریک تھے۔ منبر پر میرزا دبیر۔ بالائے سر شامیانہ۔ اتنے میں ہوا جو زور سے چلی تو شامیانہ اپنی جگہ سے ہٹ گیا۔ اعلیٰ حضرت نے دیکھا کہ میرزا دبیر کے رخ پر دھوپ ہے۔ فوراً چترِ شاہی طلب فرمایا۔ خود اٹھ کھڑے ہوئے۔ منبر کے پاس تشریف لے گئے۔ اپنے ہاتھ میں چتر لیا۔ اور میرزا دبیر کے سر پر سایہ کیا۔

جب تک تاج دارِ ملکِ سخن منبر پر جلوہ فرماتا رہا تب تک تاج دار ملک اودھ چتر برداری کی خدمت بجالاتا رہا۔

ناز برداری اِس کو کہتے ہیں۔ مجنوں بھی لیلیٰ کی کفش برداری کرتا تو اِس سے زیادہ کیا کرتا؟... اودھ کی تباہی کے بعد ۱۲۷۴ ہجری میں جب امام باندی بیگم صاحبہ نے میرزا دبیر کو عظیم آباد آنے کی تکلیف دی۔ اور میرزا دبیر منبر پر تشریف لے گئے تو یہ رباعی پڑھی:

جو پھول کبھی نہ بوستاں سے نکلے ۔۔۔ اِس دور میں جورِ آسماں سے نکلے
صد شکر کہ شہرِ لکھنؤ تھا جنّت ۔۔۔ آدم ٹھہرے جو ہم جناں سے نکلے

مطلب یہ کہ جب تک جنّت تھی تب تک عالم سرور تھا۔ بیداری کیسی؟ عالم خواب تھا! ہم کون ہیں؟ یہ جانتا کون تھا؟ جب وہ جنّت چھن گئی تب آنکھ کھلی۔ مدہوشی کیسی؟ خمار تھا! آدم کو اب معلوم ہوا کہ وہ آدم ہے۔ آدم کی پہچان یہی ہے کہ وہ جنّت سے نکالا جائے۔ جو نکالا نہیں گیا وہ آدم نہیں۔

میرزا دبیر نے ایک دوسری رباعی امام باندی بیگم کے امام باڑے میں پڑھی، اس کا چوتھا مصرع تھا:

پختہ جو ثمر ہوا چمن سے نکلا!

مطلب یہ کہ پھل جب تک لکھنؤ میں تھا خام تھا۔ خام کو پوچھتا کون ہے؟ پھل جب

پوچھنے کے قابل ہوا تو گاہک بھی دوڑ آیا۔ گاہک کون کہ عظیم آباد۔ اِس گاہک کو دیکھو کہ ڈالی ہاں ہاں کرتی ہی رہی اور یہ پھل توڑ ہی لایا۔ مگر اس کا رونا کیا؟ ڈالی سے جدائی تو پھل کی قسمت میں روزِ ازل سے لکھی ہوئی ہے۔

جس روز یہ رباعی گلزار باغ میں پڑھی گئی، اُسی روز سہ پہر کو بانکی پور میں چوہٹہ پر میر اسماعیل کے ہاں مجلس تھی۔ مجمع تھا مگر مجلس شروع نہیں ہوئی تھی۔ لوگ ابھی آرہے تھے۔ مجلس میں میرزا دبیر پر تبصرہ ہورہا تھا۔ میر جان علی اصدقی عظیم آبادی شاگرد نثار علی وکیل عدالت باقر گنج نے کہا کہ...... صاحبو! میرزا دبیر فرماتے ہیں:

''پختہ جو ثمر ہوا چمن سے نکلا''

سوال یہ ہے کہ چمن میں پھول ہوتا ہے یا پھل؟ سب کے کان کھڑے ہوئے۔ ہر طرف سے آواز آئی کہ...! پھول! پھول! مگر ایک اجنبی جو ابھی ابھی صحن میں داخل ہوا تھا بول اٹھا کہ... پھول بھی۔ پھل بھی! حضرت سودا فرماتے ہیں:

گل پھینکے ہے اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی

او خانہ برانداز چمن! کچھ تو اِدھر بھی

اجنبی کو مجمعے نے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ پوچھا آپ کون؟ اجنبی نے جواب دیا:

انتخابِ زمانہ ہوں میں صفیر

کہ وطن بلگرام ہے میرا

وہاں عصائے موسیٰ نے دریائے نیل کو، اور یہاں اِس واقعے نے بانکی پور کو دو حصوں میں تقسیم کردیا... اہلِ یقین اور اہلِ شک۔

اہلِ یقین صفیر بلگرامی کا کلمہ پڑھنے لگے۔ میر جان علی اصدقیؔ پہلے خود شاگرد ہوئے۔ پھر میر رفعت حسین و میر کفایت حسین اپنے بھانجوں کو استاد کی خدمت میں پیش کیا۔ بڑے بھانجے نے کبیرؔ اور چھوٹے نے صغیرؔ تخلص پایا۔ مولوی محمد بخش شائق عظیم آبادی نے اصرار کیا کہ عظیم الاخبار کا کام آپ اپنے ہاتھ میں لیں۔ نواب سیّد الطاف حسین خاں رئیس باڑھ مقیم باقر گنج نے کہا کہ ڈپٹی سیّد حسین علی کو آپ کی

میزبانی کا کوئی حق نہیں ہے۔ خاندانی مراسم کی رُو سے یہ حق ہمارا ہے۔ اِسی طرح سیکڑوں قدر داں پیدا ہوگئے۔ اور اس قدر دانی نے صفیر بلگرامی کو آرہ نہیں جانے دیا۔ اُسی زمانے میں نواب سید الطاف حسین خاں رئیس باڑھ کی فرمائش سے صفیر بلگرامی نے آٹھ سو صفحوں کی ایک کتاب فارسی زبان میں ''مرغوب القلوب'' نام، مذہب و اخلاق میں تالیف کی۔ چند سطریں ملاحظہ ہوں:

> گویند وقتے ابلیس نزدِ فرعون آمد۔ و شاخے از انگور در دست گرفتہ بود۔ یہ فرعون گفت کہ ہیچ کس می تواند کہ ایں خوشہ را مروارید کند؟ فرعون گفت نہ۔ ابلیس در حال یک دم بدمید۔ مروارید گشت۔ فرعون تعجب کرد و گفت عجب استاد مردے۔ ابلیس سیلی برگردنِ فرعون زد و گفت، مرا بایں استادی بہ بندگی قبول نہ کرد و تو بایں نادانی دعویِ خدائی چوں کنی؟

> ابلیس ہاتھ میں انگور کا خوشہ لیے ہوئے ایک مرتبہ فرعون کے پاس پہنچا۔ پوچھا، ہے کوئی یہاں ایسا جو اِن انگور کے دانوں کو موتی کردے؟ فرعون نے کہا، نہیں۔ تب ابلیس نے ایک ہی پھونک میں خوشۂ انگور کو موتیوں کا گچھا بنا دیا۔ فرعون کو بڑا اچنبھا ہوا۔ کہا کہ استادی اِس کو کہتے ہیں۔ یہ سننا تھا کہ ابلیس نے فرعون کی گردن پر ایک مکا مارا اور کہا، مردود! اِس استادی پر بھی تو بندگی ہماری اُس جناب میں قبول نہیں ہوئی۔ اور تو ابوجہل ہوکر آیا ہے خدائی کا دعویٰ کرنے؟

صفیر بلگرامی کی کتاب ''مرغوب القلوب'' ایک مرتبہ نواب سہراب جنگ بہادر نے نواب سید الطاف حسین خاں سے دیکھنے کو لی۔ اور اِس رقعے کے ساتھ واپس کی:

''الطاف گستر بے پایاں۔ سلامت!

اخلاص پرست یک رنگ، بندۂ بے ریا سہراب جنگ بدیں رنگ مدعا طراز۔ نسخہ مرغوب القلوب کہ جہت مطالعہ ازاں الطاف گستر آوردہ بودم الاولہ الی لآخرہ مطالعہ نمودہ بصحابت حامل واپس می دارم...... بمطالعہ نسخۂ مذکور خیلے محظوظ شدم۔ و مؤلف را، و آں شفیق را کہ بانیِ تالیف ہستند، بدعائے خیر یاد کردم۔ و شک نیست کہ آں الطاف گستر از تالیف کنانیدنِ نسخۂ مذکورہ خیلے ماجور و مثاب شدند۔ خدا جزائے خیر وہاد۔ بہ محمد و آلہ الا مجاد۔

زیادہ والسلام خیر الانام...... سہراب جنگ عفی عنہ۔ یوم الادینہ"۔

اس رقعے سے معلوم ہوگا کہ آج سے ستر برس پہلے بانکی پور اور عظیم آباد کی کیا فضا تھی۔ غالب فرماتے ہیں:

جاہ ز علم بے خبر، علم ز جاہ بے نیاز

مگر یہ رقعہ شاہد ہے کہ نواب سہراب جنگ بہادر کے ایسے ذی جاہ بھی علم سے باخبر تھے۔ اہلِ علم کی قدر کرتے تھے۔ عربی و فارسی تصانیف کے پڑھنے کا ذوق رکھتے تھے۔ منشیانہ فارسی قلم برداشتہ لکھتے تھے۔ اور شب و روز فضائے علم میں بسر کرتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ دلی اور لکھنؤ کی خزاں بہار پر تھی۔ اور بہار کی ملکہ پچھم سے منھ موڑ کر پورب میں یعنی عظیم آباد میں جلوہ فرما تھی:

چمن آتشِ گل سے دہکا ہوا
ہوا کے سبب باغ مہکا ہوا

جب حالت یہ تھی تو ظاہر ہے کہ کسی بیرونی شخص کا عظیم آباد میں فروغ پانا آسان نہ تھا۔

چنانچہ اہلِ شک نے کہا کہ بلگرام خطۂ یونان سہی مگر بغیر اچھی طرح سمجھے بوجھے کسی کو یوں ہی مان لینا درست نہیں۔ اِس فیصلے کی رُو سے باقر گنج دارالامتحان قرار پایا۔ اور میر حشمت علی حشمت کے ہاں مشاعرے شروع ہوئے۔ مشاعرے نہیں، معرکے

شروع ہوئے۔ یہ آگ بڑھتے بڑھتے شہر عظیم آباد پہنچی۔ وہاں ایک مرتبہ محلّہ گذری میں نواب سیّد محمد حسین خاں ہجرتی شاگرد ناظر وزیر علی عبرتی کے ہاں مشاعرہ تھا۔ یہ عظیم آباد کا پہلا مشاعرہ تھا جس میں صفیر بلگرامی کی شرکت ہوئی۔ طرح میں جو غزل اُنھوں نے پڑھی بہت دقیق تھی۔ اہلِ شک کو موقع ملا۔ مولوی یوسف علی شہید شاگرد نجم نے کہا کہ سرِ مشاعرہ امتحان ہونا چاہیے۔ صفیر بلگرامی نے کہا بسم اللہ! اُسی وقت مشاعرے میں دیوانِ ناسخ لایا گیا۔ کھولا گیا تو یہ غزل نکلی:

ہے دلا کس کو دوام اِس گردشِ افلاک میں
خاک کے پتلے ہزاروں مل گئے ہیں خاک میں (شعر:۱)

کہہ رہی ہے یہ لبِ جو پر زبانِ موجِ مے
پاک میں ہے کب وہ کیفیت جو ہے ناپاک میں (شعر:۷)

مست عالم کو کیا چشمِ سیاہِ یار نے
ساغرِ مے کا ہے عالم ساغرِ تریاک میں (شعر:۱۰)

ممتحن نے خیال کیا کہ افلاک میں، خاک میں پامال زمین ہے۔ ممکن ہے صفیر بلگرامی کی غزل اِس زمین میں پہلے سے موجود ہو۔ اور نہ بھی ہو تو وہ امتحان ہی کیا جس میں لوہے کے چنے نہ چبائے جائیں، اِس لیے حضرتِ ناسخ کے ساتویں شعر کا پہلا مصرع دیا گیا۔ یعنی: ''کہہ رہی ہے یہ لبِ جو پر زبانِ موجِ مے''۔ صفیر بلگرامی نے فی البدیہہ ۲۱ شعر کی دو غزلیں کہیں۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

مستِ استغنا نہ ہو، سن لے بیانِ موجِ مے
ہے لبِ ساغر سے کچھ کہتی زبانِ موجِ مے

عکس تیرا جب پڑا ساقی میانِ موجِ مے
سایہ افگن خم سے ہوگا سائبانِ موجِ مے

دُردِ مے اُس کی زمیں ہے تو حبابِ مے فلک
دیکھ لے ساقی زمین و آسمانِ موجِ مے

پی کے مے سیرِ جہانِ لامکاں کر شوق سے
عالمِ امکاں سے باہر ہے جہانِ موجِ مے

چشمِ مستِ ساقیِ خود بیں ہے کیا جامِ شراب
آنکھ کے ڈوروں پہ مجھ کو ہے گمانِ موجِ مے

جستجو اُس کو ہے یہ کس یوسفِ گم گشتہ کی
گردشوں میں رات دن ہے کاروانِ موجِ مے

جس سے دو باتیں ہوئیں وہ مست و بے خود ہوگیا
آپ کی موجِ تبسم میں ہے شانِ موجِ مے

عیش میں بھی بانکپن سفاک کا جاتا نہیں
وقتِ مے نوشی ہے ہاتھوں میں کمانِ موجِ مے

اے صفیر اک اور لکھیے، اب تو مستانہ غزل
یاروں کو منظور ہے یاں امتحان موجِ مے

صفیر بلگرامی یہ غزل کہہ کر اُٹھے تو یوسف علی شہید نے انگشتِ شہادت اٹھائی اور کہا کہ ادیب قادر الکلامی اِس کو کہتے ہیں۔ مگر ایک دوسرے مشاعرے میں جوشؔ نے کہا کہ شاعر ہم اُسی کو مانیں گے جو ''خنجر تہِ خنجر'' باندھ کر دکھلا دے۔ صفیر بلگرامی نے ۱۲ شعر کی فی البدیہہ غزل کہی۔ دس شعر یہ ہیں:

تھامے ہوں تری زلفِ معنبر تہِ خنجر
ہے سلسلۂ عمرِ خضر در تہِ خنجر

خنجر کو جو دیکھا تو بندھا ابروؤں کا دھیان
پڑھنے لگا میں بچھو کا منتر تہِ خنجر

سفاک نے رگڑا جو دیا حلق پہ میرے
بل کھا گیا میں صورتِ خنجر تہِ خنجر

قاتل مری میت پہ رہے تیغ کا سایہ
جائے بھی ترا کشتۂ خنجر تہِ خنجر

سر دینا بھی مجھ عاشقِ جاں باز کو ہے کھیل
دیکھا کیا میں جوہرِ خنجر تہِ خنجر
جس طرح سے جی چاہے مجھے قتل کرو تم
تڑپوں گا نہ اے صاحب خنجر تہِ خنجر
اک خنجرِ ابرو نہیں، پلکیں بھی ہیں نیچے
رکھے ہیں وہاں سیکڑوں خنجر تہِ خنجر
کہنے لگا سرمے کی وہ تحریر دکھا کر
خنجر تہِ خنجر ہے یہ خنجر تہِ خنجر
ہے جوشؔ کو دعویٰ یہ کہ شاعر اُسے سمجھوں
باندھے جو کوئی قافیہ خنجر تہِ خنجر
شاعر مجھے کہتے ہیں صفیرِ سخن آرا
یوں باندھتے ہیں قافیہ خنجر تہِ خنجر

اِسی طرح نئی نئی اور سنگلاخ زمینوں میں سات امتحان لیے گئے۔ چنانچہ صفیر بلگرامی فرماتے ہیں:

کام رستم کا نہ تھا جو کیا فردوسی نے
نہیں ہر ایک سے کھنچتی ہے کمانِ شاعر

رستم یعنی ہفت خوانِ رستم۔ فردوسی یعنی شاہ نامہ۔ مطلب یہ کہ رستم سے اگر کہا جاتا کہ کمانِ موجِ مے سے تیر اندازی کر، اور جوہرِ خنجر تہِ خنجر دکھلا تو وہ کمان اپنے ہاتھوں سے پھینک دیتا اور خنجر اپنے سینے میں بھونک لیتا۔ امتحان کبھی نہ دیتا۔ ہفت خوانِ رستم کو اُن سات امتحانوں سے کیا نسبت جو عظیم آباد میں لیے گئے۔ رستم، فردوسی نہیں ہوسکتا۔

میدانِ جنگ میں آج سناٹا ہے۔ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ وہی عظیم آباد ہے، وہی گنذری ہے، جہاں ہجرتیؔ عظیم آبادی کے مشاعرے ہوتے تھے۔ شہیدؔ و جوشؔ مسلح ہوکر آتے تھے۔ توپیں سر ہوتی تھیں۔ چھتیں اُڑتی تھیں۔ دیواریں ناپید ہوتی تھیں۔ آج

ہر طرف سناٹا ہے۔ بقول حضرت صفیر بلگرامی:

زمینِ سخن میں پڑے سو رہے ہیں
شہیدانِ تیغِ سخن کیسے کیسے!

ان شہیدانِ تیغِ سخن میں جناب بدؔر آروی بھی ہیں جن کی مدح میں میر عنایت حسین صاحب امداد عظیم آبادی شاگرد شاد عظیم آبادی فرماتے ہیں:

مرقع محنتوں کا ہے یہ دیواں ریاضت ہائے عمرِ بے وفا ہے
یہ اب مقبولِ اربابِ سخن ہو یہی امدؔاد خستہ کی دعا ہے
نہ کیوں ہو شانِ استادی نمایاں کہ یہ تصنیفِ بدؔر بے ریا ہے
یہ وہ اہلِ ہنر ہے صاحبِ فن وطن میں اُس کا شہرہ جا بجا ہے
خلیق و خوش مزاج و بامروت شکستہ نفس و خوش خو باوفا ہے
نہ دیکھا انکسارِ نفس ایسا خودی جس میں نہ مطلق ادّعا ہے

شکستگی نفس کے ثبوت میں جناب بدؔر آروی کا ایک خط ملاحظہ ہو:

''عزیز گرامی مولوی سید وصی احمد صاحب بلگرامی۔ بخیریت رہ کر نویدِ صحتِ مزاج کا خواست گار ہوں۔ میرا دیوان ۳۸ جزوں پر چھپ کر تیار ہوگیا... یہ دیوان آپ کے جدِّ امجد (حضرت صفیر بلگرامی) بہشت مکان کی زندہ یادگار ہے۔ ناپسند ہونے پر بھی ایک جلد آپ کی الماری میں ہونا ضرور ہے۔

بذل رنداں کردم از ساقی گرفتہ جام مُل!
نذرِ سلطان ساختم از باغِ سلطاں چند گل!

حضرت استادی علیہ الرحمہ کی کفش برداری کا فیض ہے جو دیوان کی شکل میں آپ کی آنکھوں کے سامنے ہے۔ آپ کی چیز ہے۔ آپ کے گھر کی چیز ہے...

سیّد محمد امیر حسن بدؔر
آرہ۔ یکم مارچ ۱۹۲۹ء روز جمعہ''

اِس خط میں زندہ یادگار کی تشریح کے لیے ایک دفتر چاہیے۔ مختصر یہ کہ آج عظیم آباد کا میدانِ جنگ خموش ہے۔ مگر ستر پچھتر برس پہلے جو توپیں وہاں سر ہوئی تھیں، اُن کا دھواں اب تک اُڑ رہا ہے۔ اُن معرکوں کی یاد اب تک تازہ ہے، یعنی جن زمینوں میں صفیر بلگرامی کا عظیم آباد میں امتحان ہوا تھا، اُن زمینوں میں ایک مدتِ دراز کے بعد جناب بدر نے اپنے استاد کی اجازت سے غزلیں کہیں اور پتھر کو پانی کی طرح بہا دیا:

صفیر بلگرامی:

(۱) شاعر مجھے کہتے ہیں صفیرِ سخن آرا
یوں باندھتے ہیں قافیہ خنجر تہِ خنجر

(۲) اے صفیر اک اور لکھیے اب تو مستانہ غزل
یاروں کو منظور ہے یاں امتحانِ موجِ مے

بدر آروی:

(۱) اے بدر بجا حضرتِ استاد کا ہے قول
یوں باندھتے ہیں قافیہ خنجر تہ خنجر

(۲) بدر لکھتا ہوں ابھی اک اور مستانہ غزل
ہے طبیعت موج پر اپنی بسانِ موجِ مے

"زبانِ موج مے" کی زمین میں حضرت صفیر بلگرامی نے ۲۱ شعر کہے تھے۔ جناب بدر نے ۸۱ شعر کہے اور ۳۱ قوافی باندھے۔ مثلاً استخوان، بادبان، داستان، نردبان وغیرہ۔ مگر امتحان سے قصداً پرہیز کیا۔ کیوں کہ امتحان، اور وہ بھی سرِ مشاعرہ امتحان، استاد کا ہوچکا تھا۔ شاگرد کو اِس کی نوبت نہیں آئی۔ اِس لیے سعادت مند شاگرد نے اِس قافیے کو ہاتھ لگانا سوءِ ادب سمجھا۔

سہسرام کے ایک مشاعرے میں جناب بدر کو داستانِ موجِ مے سنانے کا اتفاق ہوا۔ اِس کی خبر کسی نے جناب سیّد حسن مرتضٰی شفق رضوی عماد پوری کو پہنچائی۔

ظالم آسمانِ شفق کو بدر سے کبھی ملنے نہیں دیتا مگر ایک مشاعرے[۴] میں یہ ناممکن بات بھی ممکن ہوگئی تو جناب شفق نے جناب بدر سے کہا کہ داستانِ موجِ مے سننے کے لیے کان مشتاق ہیں۔ اِس داستان کو سن کر جناب شفق کے دل پر کیا اثر ہوا، اِس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ ۱۳۴۷ ہجری میں خم خانۂ بدر طبع ہوا اور جناب شفق نے قطعۂ تاریخ کہا تو اِس قطعے میں اس داستانِ موجِ مے کا خاص طور سے ذکر کیا:

للہ الحمد آب و تابِ طبعِ رنگیں سے شفق
صورتِ صحنِ چمن ہے گلفشاں دیوانِ بدر
ہے مے جامِ کہن میں کہنہ مشقی کا اثر
مست ہوں پڑھ کر نہ کیوں پیر و جواں دیوانِ بدر
اِس کی ہر ہر بیت ہے گویا بیانِ موجِ مے
کیوں نہ ہو پھر ترجمانِ مے کشاں دیوانِ بدر
جلوۂ حسنِ معانی سے دکھاتا ہے مجھے
لمعۂ فیضِ صفیرِ نکتہ داں دیوانِ بدر

حضرت ناسخ نے ۱۲۵۴ ہجری میں رحلت کی۔ یہ ۱۳۵۴ ہجری ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ''کاروانِ موجِ مے'' اِس ایک سو برس میں کن کن منزلوں سے گزرا ہے۔

(۱) پہلی منزل لکھنؤ، محلّہ ٹکسال، جہاں کلکِ ناسخ نے ایک شعر کے مصرعِ اوّل میں اتفاقیہ ''زبان موجِ مے'' لکھ دیا۔

(۲) دوسری منزل عظیم آباد، محلّہ گذری، جہاں ہجرتی عظیم آبادی کے مشاعرے میں یوسف علی شہید نے حضرت صفیر بلگرامی کا امتحان لینا چاہا۔ اور اِس امتحان کے لیے دیوان ناسخ کھولا گیا تو عجیب اتفاق کہ وہی مصرع طرح قرار پایا۔

(۳) تیسری منزل آرہ، ملکی محلّہ۔ جہاں جناب بدر آروی نے مسلسل پانچ غزلیں کہہ کر دکھلایا کہ موجِ مے کتنی زبان دراز ہے۔

(۴) چوتھی منزل عماد پور۔ علاقہ رفیع گنج ضلع گیا۔ جہاں جناب شفق

عماد پوری نے ''خم خانۂ بدر'' کی تاریخ طبع کا قطعہ لکھا تو بیانِ موج مے آ ہی گیا۔ اور تماشے کی بات یہ ہے کہ دیکھنے میں تو کاروانِ موج مے لکھنؤ سے عظیم آباد اور آرہ ہوتا ہوا گیا پہنچا، لیکن غور کیجیے تو یہ کارواں جس نقطے سے چلا تھا ایک سو برس کے بعد پھر اُسی نقطے پر آ گیا۔ نقطۂ اوّل ناسخ کی ایک بیت کا پہلا مصرع۔ نقطۂ آخر شفق کی ایک بیت کا پہلا مصرع!

جناب شفق کے اِس قطعے کا ایک مصرع قابل توجہ ہے: ''لمعۂ فیضِ صفیرِ نکتہ داں دیوانِ بدر''۔ یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ اِس مصرعے میں ''نکتہ داں'' محض قافیہ پیمائی ہے۔ جناب شفق نے نکتہ داں اُس شخص کو لکھا ہے جس کی مدح میں مرزا محمد باقر صحبت لاری شیرازی کے قصائد موجود ہیں۔ تین شعر ایک قصیدے کے یہ ہیں:

کیست آں نجلِ نبی، شبلِ علی، میرِ صفیر کہ درونش بصفا مجمعِ اسرار آمد
در فنِ شعر یکے کہنہ ادیبے است ادیب کہ بوصفش قلم از شرح بتکرار آمد
دیدۂ وہم نیابد بہ سخن سنجی او انجم آسا اگرش خود ہمہ بصّار آمد

جناب شفق نے نکتہ داں اُس شخص کو لکھا ہے جس کو حضرت غالبؔ کے دربار سے نورِ بصر، لختِ جگر، قرۃ العینِ اسد خطاب ملا تھا۔ اور جس کو خود جناب شفق کے استاد حضرت امیر مینائی اپنے خطوں میں ''بلبلِ شیراز و طوطیِ ہند کے ہم صفیر'' لکھا کرتے تھے۔

راجا کے بھنڈار میں اللہ کا دیا سبھی[☆5] کچھ ہے۔ بھنڈار کے ایک کونے میں مصری کا پہاڑ بھی ہے۔ چیونٹی کہتی ہے کہ یہ پہاڑ اپنے سر پر کیوں کر اٹھا لائیں۔ ہاں اپنی بساط بھر ایک ریزہ منھ میں داب کر لائے ہیں کہ مہمان بھوکے نہ اٹھ جائیں۔

نمونۂ کلام حضرت صفیر بلگرامی۔

قطعہ

بڑے شوق سے بھیجتا ہوں میں قاصد
رہے گی نظر راہ پر دیکھ لینا

نہ تو خیر سے پھر کے آئے گا جب تک
نہ ٹھہرے گا دل، نے جگر دیکھ لینا
پتا کوئے قاتل کا بتلادوں تجھ کو
جو کہتا ہوں میں ڈھونڈ کر دیکھ لینا
پڑے ہر جگہ پر ہیں ٹکڑے جگر کے
تڑپتے ہیں دل خاک پر، دیکھ لینا
کہیں خاک اُڑاتے ہیں گیسو کے الجھے
کسی کا ہے دم ہونٹھوں پر دیکھ لینا
خراشوں سے سینہ گلستاں کسی کا
کوئی گل ہے داغِ جگر، دیکھ لینا
کوئی ہوگا ایڑی رگڑتا زمیں پر
کسی کا عدم کو سفر دیکھ لینا
کہیں چاک دامن کیے ہیں ہزاروں
کھڑے ہیں کہیں بخیہ گر، دیکھ لینا
کوئی شامِ غم میں گرفتارِ کلفت
کسی لب پہ آہِ سحر، دیکھ لینا
ہلادیں گے دل تیرا، نالے کسی کے
کسی کی فغاں بے اثر، دیکھ لینا
کوئی ہوگا دھونی رمائے وہاں پر
کسی کو کھڑے ننگے سر دیکھ لینا
نہ کھانے کی سدھ بدھ نہ پانی کی پروا
غذا سب کی خونِ جگر، دیکھ لینا
کہیں ہڈیاں طائرِ نامہ بر کی
کسی جا کبوتر کے پر دیکھ لینا

یہ ساماں گلی میں، وہ کوٹھے[☆٦] پہ ہوں گے
پھری ہوگی سب سے نظر دیکھ لینا

لحد ایک حسرت بھری عین در پر
لکھا شعر یہ لوح پر، دیکھ لینا

تجھے اپنی آنکھوں کی سوگند قاتل
مری قبر روز اک نظر دیکھ لینا

غزل

آنکھ میں دل میں کرم فرمائیں آپ
آئیں آپ، اے بندہ پرور آئیں آپ

حالِ دل میرا اگر سُن پائیں آپ
بے بلائے آپ دوڑے آئیں آپ

ہم کو کیا غیروں کے آگے جائیں آپ
پائے نظارہ کی ٹھوکر کھائیں آپ

یہ سکھاتی ہے اُن آنکھوں کو حیا
شرم بھی آئے تو شرما جائیں آپ

خط کے آنے پر خط آیا آپ کا
اِس کے معنی کیا، ذرا بتلائیں آپ

زندگی بھر تو جلایا ہے مجھے!
شمعِ مرقد بھی جلانے آئیں آپ

آرزو بھی اپنی نکلے دم کے ساتھ
نزع میں دم بھر اگر ہوجائیں آپ

وصل قسمت میں نہیں ہے، کیا کریں
آپ کھو جائیں، اگر مل جائیں آپ

ہو گئے یکتا لطافت کے سبب
آئنے میں عکس کیوں کر پائیں آپ
ہائے رے گردن جھکانا آپ کا
اک ذرا پھر اس طرح شرمائیں آپ
دفن میں تجھ کو تردد ہو اگر!
تیرے کشتے شرم سے گڑ جائیں آپ
وجد میں آ کر لحد ہلنے لگے
اپنے پاؤں سے اگر ٹھکرائیں آپ
بلبلیں گائیں گی یہ غزلیں صفیرؔ
شعر اچھے اچھے کہتے جائیں آپ

☆☆

جائیں آپ اب، جائیں آپ اب، جائیں آپ
چار غیروں میں نہ یوں فرمائیں آپ
گور میں رکھوا لیں تو گھر جائیں آپ
بیٹھ کے لاشہ مرا اٹھوائیں آپ
شاعروں سے لڑتی ہیں آنکھیں بہت
دیکھیے ایسا نہ ہو بندھ جائیں آپ
آنکھ سے میرا مکانِ دل ہے خوب
اب تو اس کوٹھے سے نیچے آئیں آپ
زرد ہوں لیکن گھرا ہوں عشق میں
خوب اس سونے کو میرے تائیں آپ
ڈریے جذبے سے مرے، کیا دور ہے
بے طلب گھر میرے دوڑے آئیں آپ

حضرت دل کیا مجھے بھاری ہے جان؟
خنجرِ ابرو کی چوٹیں کھائیں آپ

میں تمھیں دیکھوں وہ دیکھے غیر کو
اب تو اپنی آنکھ سے شرمائیں آپ

کب سے آنکھیں ڈھونڈتی ہیں اے حضور
پھر چکے خوب، اپنے گھر میں آئیں آپ

تم سے چھٹ کر دل بہت کرتا ہے تنگ
اس کو بھی ساتھ اپنے لیتے جائیں آپ

دیکھتا ہوں دیکھتا ہوں سامنے
اچھا اچھا کچھ چھپاتے جائیں آپ

بسمل اٹھ اٹھ کر لپٹتے ہیں حضور
عید قرباں دیکھتے تو جائیں آپ

گل تو بلبل کو ملے، قمری کو سرو
یا الٰہی مجھ کو بھی مل جائیں آپ

غیر مجھ سے لڑ رہا ہے دیر سے
اور آ کر ہاں میں ہاں ملوائیں آپ

منہ چھپایا خال کے بوسوں پہ بھی
کویلوں پر مہر اب دلوائیں آپ

آپ دیکھیں جو دکھاتے ہیں مجھے
آپ سمجھیں مجھ کو جو سمجھائیں آپ

شعر ہیں ان بحروں کے موتی صفیر
جوہری بازار میں لے جائیں آپ

☆☆

ہجر آیا وصلِ جاناں الغیاث!
تیرہ شب ہے ماہِ تاباں الغیاث!
دل لیے کب سے کھڑا ہوں ہاتھ میں
الغیاث اے تیرِ مژگاں الغیاث!
ہم سے مفلس چاہتے ہیں انقلاب
الغیاث اے چرخِ گرداں الغیاث!
رات فرقت کی نہیں کٹتی ہے آہ
الغیاث اے مہرِ رخشاں الغیاث!
اُن کے در سے اب اٹھاتے ہیں رقیب
الغیاث اے کوے جاناں الغیاث!
زلفِ شبگوں نے کیا عالم تباہ
الغیاث اے روئے تاباں الغیاث!
بھر گیا ہے دل میں جاناں کے غبار
الغیاث اے ابرِ مژگاں الغیاث!
قابلِ امداد ہے اب تو صفیر
الغیاث اے شاہِ مرداں الغیاث!

☆☆

میرے آگے غیر سے اِس طرح یارانے کی بات
واقعی ہے اے ستم گر یہ تو مر جانے کی بات
واقعی ہے اے محبت آگ ہو جانے کی بات
کیوں نکالی اُن کے گھر میں میرے ویرانے کی بات
جب کہا حیرت ہے، میں تم پر فدا، تم غیر پر
ہنس کے بولے اپنے اپنے دل کے آجانے کی بات

میرے منھ سے اور شکوہ، آپ کا، اچھی کہی
کیا خیال آیا یہ ہے صاحب کے فرمانے کی بات
ایک بھی منھ سے نہ پھوٹا، ہوگئے پتھر یہ بت
زاہدو! تم کو سناؤں کیا میں بت خانے کی بات
شب کو ایسا ارتباط اور صبح ایسی احتیاط
اے صنم سچ ہے کہ ہے یہ دل میں آجانے کی بات
اے صفیر اِس سوزِ غم سے کون عاشق بچ سکے؟
جل بجھا کل رات، دیکھی تم نے پروانے کی بات!

شمع و پروانہ کا ذکر خیر آ ہی گیا تو غازی پور اور الہ آباد کا ایک فسانہ بھی سن لیجیے۔ مولوی عبدالصمد صمؔد غازی پوری نے ۱۲۹۱ھ میں صفیر بلگرامی کو مدعو کیا۔ صفیر بلگرامی غازی پور پہنچے اور للّن نے اُن کا آنا سنا تو ملنے کے لیے آئی۔ اُن کو معلوم تھا کہ للّن ملک الموت ہے اور سید کاظم علی مضطؔر الہ آباد میں موت کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ چنانچہ للّن سامنے آئی تو دیکھتے ہی صفیر بلگرامی نے پوچھا: کیا ہوئی عاشقِ مضطر کی یاد؟ اِس کا جواب للّن کی زبان اور صفیر بلگرامی کے قلم سے سنیے:

سن کے آنکھوں کو پھرایا اُس نے — عجب انداز دکھایا اُس نے
بولے اُس بت کے لبِ شکّر خند — کیا یہ کہتے ہو، خدا کی سوگند
جلوۂ طورِ صفا کی سوگند — جذبۂ اہلِ وفا کی سوگند
اپنی شرم اور حیا کی سوگند — ان کی مہر اور وفا کی سوگند
شوخ چشموں کے غضب کی سوگند — پیار کی نظروں کے ڈھب کی سوگند
حسنِ بے پردہ کی ضو کی سوگند — شمعِ رخسار کی لو کی سوگند
بسملِ تیغ نگہ کی سوگند! — زخم کاری کی جگہ کی سوگند
غمزۂ شوخ روش کی سوگند — نظرِ نیم خلش کی سوگند
اپنے مژگاں کی خلش کی سوگند
دلِ مضطر کی تپش کی سوگند

گرم جوشوں کی محبت کی قسم　　سرد مہروں کی عداوت کی قسم
سُست عہدیِ حسیناں کی قسم　　حسرتِ گوشہ گزیناں کی قسم
شعلۂ شمعِ فروزاں کی قسم　　عشقِ پروانۂ سوزاں کی قسم
سینہ کاویِ نظارہ کی قسم　　دلِ جاں بازِ دو پارہ کی قسم
عشق کی بے خطر آہوں کی قسم　　حسن کی نیچی نگاہوں کی قسم
خونچکاں نالۂ بلبل کی قسم　　خوں فشانیِ رگِ گل کی قسم
اپنے انجان تغافل کی قسم　　اُن کے سامانِ تحمل کی قسم
اپنے گیسوئے دل آرا کی قسم　　اُسی آشفتہ و شیدا کی قسم

کہ مرے دل کا وہی عالم ہے!
جانِ بسمل کا وہی عالم ہے

رات دن آنکھوں میں ہے دھیان اُن کا　　دھیان بھولا نہ کوئی آن اُن کا
وہ نہ خط بھیجیں، نہ بھیجیں پیغام　　دور افتادوں سے بچ ہے کیا کام
زندگی اپنی کٹے تو کیوں کر؟　　عمر طے اپنی بھلا ہو کیوں کر؟
طعن و تشنیع کہاں تک سنیے؟　　کب تک اِس راہ میں تنکے چنیے؟
سامنے ہے وہ دل آرا ہر دم　　دھیان میں رہتی ہوں شاد و خرم
کہہ کے یہ بوسہ زنِ لب ہوئی آہ　　دفعتاً اِس کا ہوا حال تباہ
کھول دی اِس نے کھجوری چوٹی　　سانپ کی طرح زمیں پر لوٹی
ہاتھ مل مل کے چھڑائی منہدی　　ایڑیاں گھس کے اڑائی منہدی
دست بوسی جو گریباں نے کی　　پائے بوسی سرِ داماں نے کی
تا گریباں جو وہ داماں پہنچا　　تا بہ دل چاکِ گریباں پہنچا
مجھ کو وحشت ہوئی اس حالت پر　　ہوگیا دیکھ کے اس کو مضطر
دوستانہ اُسے سمجھانے لگا　　اتنے میں غش بھی اُسے آنے لگا
اُس کی ایسی ہوئی حالت تغیٔر　　کہ بنی صاف وہ غم کی تصویر

میں نے منگوا کے سواری اُس دم　　بھیجا گھر اُس کے بہ صد رنج و الم
ایسے بیمار سنبھلتے ہیں کہیں؟　　بے موے گھر سے نکلتے ہیں کہیں؟
میں نے مضطر کو روانہ کیا خط　　اطلاع اِس کی مناسب تھی فقط
بعد دو سال کے معلوم ہوا　　کہ وہ سامان ہی معدوم ہوا
کھا گئی اس کو تمنا دل کی　　جانِ مضطر ہوئی کشتہ دل کی
جان اُس کی ہدفِ غم جو ہوئی　　اِسی آزار میں گھل گھل کے موئی
مرغِ جاں اُس کا فلک سیر ہوا　　لیجیے خاتمہ بالخیر ہوا
مجھ پہ تھا حقِ محبت جو صفیر　　حال میں نے کیا اُس کا تحریر
یادگار اُس کے ہیں یہ چند اشعار　　بخشے اب اُس کو خدائے غفار!

غزل

اُڑ کے ڈسنا افعیِ زلفِ دو سر کا کھیل ہے
وحشیوں کو روکنا تیری نظر کا کھیل ہے
لختِ دل کا کھیل ہے اور اشکِ تر کا کھیل ہے
عشق کے بازار میں لعل و گہر کا کھیل ہے
کاسئہ سر ہاتھ میں لے کر چلا منصور کیا
یہ تو ادنیٰ عاشقِ آشفتہ سر کا کھیل ہے
طبعِ معنی یاب بھی درکار ہے اِس کو صفیرؔ
شاعری میں کیا فقط علم و ہنر کا کھیل ہے

مرزا غلام حیدر مجروح عظیم آبادی نے ایک قطعے میں شاگردانِ صفیر بلگرامی کی فہرست دی ہے۔ اس فہرست مورخہ ۱۲۹۴ھ میں انھیں شاگردوں کو جگہ ملی تھی جن پر صفیر بلگرامی نے برسوں محنت کی تھی۔ ۲۹ شعر میں ۱۶ یہ ہیں:

میر فرزند احمد آں کہ صفیر　　ہست مشہورِ عالمِ ایجاد

بلگرام اصل و آرہ مسکنِ او — سالہا منزلش عظیم آباد
طوطیِ خوش نوائے گلشنِ نظم — بلبلِ نغمہ سنجِ گلبنِ داد
ہم ز پُر مایگی خزینہ کشا — ہم ز قید غرور ہست آزاد
نامور در جہاں تلامذہ اش — بہرہ ور صاحبانِ استعداد
مایہ دار از فیوضِ او شاگرد — ہم ز تعلیم اوست شاد استاد
فیض یاب از صفیر باتمکین — سخن، احمد، امیر، سلطاں، شاد
مخلص و شورش، اکبر و اصغر — ہاشم و محسن خجستہ نہاد
صاف و عنقا، ہما، امیر، اخلاص — ہم شمیم و کلیمِ طور رشاد
حسن، اکھڑ، حقیر، درد، ظہیر — ہم گرامی، ضیائے مہر سداد
سخن، اکرام، قیصر و جادو — ہم سلیم و وزیر صاحب داد
احسن و جوش و حیرت و فیاض — ہم طبیب و متینِ نیک نہاد
آں صغیر و مطیر، تمکیں، شور — آں عنایت، کبیر ہم فرہاد
جاہ، یحییٰ، غلام، لائق، تیز — اصدق و حکیم و ہم ایجاد
قاصر و باقر و ثریا مہر — دانش و ہم ذکیِ عالی زاد

آں نہال و جمیل و محزوں نیز
باز مداح لائق ارشاد

ضلع شاہ آباد میں جو لوگ شاگرد ہوئے، اُن سے قطع نظر کر کے باقی اور شاگردوں کا مختصر حال یہ ہے:

سخن

خواجہ سید محمد فخرالدین حسین خاں، خلف خواجہ محمد جلال الدین عرف حضرت صاحب خلف خواجہ فقیر صاحب چشتی مودودی سجادہ نشیں مقام لکھنؤ۔ سالِ غدر میں یہ اپنے عمِ نامدار مرزا محمد ابراہیم کے ساتھ آرہ آئے۔ عمر تقریباً پندرہ برس۔ مرزا صاحب

موصوف نے اُن کو حضرت صفیر بلگرامی سے ملایا۔ اُسی زمانے میں اُن کو ایک فسانہ لکھنے کا شوق ہوا۔ مگر سکۂ رائج الوقت فسانۂ عجائب تھا جس کی شاعرانہ خصوصیات کا برتنا اور قیود و قوانین سے عہدہ برآ ہونا بچوں اور نو مشقوں کا کام نہیں تھا۔ اِنھیں مجبوریوں سے جناب خواجہ فخر الدین حسین خاں نے نظم و نثر میں صفیر بلگرامی کی شاگردی اختیار کی کیوں کہ اِس صوبے میں اُس وقت صفیر بلگرامی کی جگہ پرستارانِ اردو کی صفِ اول میں تھی۔ بہرکیف خواجہ صاحب نے استاد سے سخن تخلص پایا۔ معمول یہ ہوا کہ جناب سخن اپنے فسانے کا ایک یا دو ورق لکھ کر روزانہ استاد کی خدمت میں حاضر ہوتے اور جس روز خود نہ آسکتے سہدیوں پیادے کے ہاتھ اوراق بھیج دیتے۔ سال بھر کی محنت میں وہ فسانہ ختم ہوا۔ یعنی ۱۲۷۶ھ میں۔ چنانچہ تاریخی نام ''سروشِ سخن'' ہوا۔ اِس کے دو برس کے بعد خواجہ صاحب نے وکالت کا امتحان دیا۔ اور آرہ میں وکالت شروع کی۔ پھر منصف اور صدرِ اعلیٰ ہوئے۔

سروشِ سخن کا مسودہ صفیر بلگرامی نے اپنے استاد حضرت غالب دہلوی کے پاس اس عریضے کے ساتھ بھیجا تھا:

> ''......ملازمت کے وقت میں نے خواجہ فخر الدین صاحب سخن جن کا دادیہال لکھنؤ اور نانیہال دہلی میں ہے، اور غدر کے سال میں بہ عمر چاردہ یا پانزدہ سالگی آرہ میں تشریف لائے۔ اور جناب محمد ابراہیم صاحب خلف مرزا محمد صدیق صاحب کی صاحب زادی سے منسوب ہوئے۔ اور مجھ سے تلمذ کیا، اور قصہ مسمیٰ بہ سروشِ سخن جس کو اُن کی رائے سے درست کرنے کا اتفاق ہوا، سب حال آپ سے بیان کیا تھا۔ چوں کہ اِس قصے کو چھپنا چاہیے اور لکھنؤ بھیجنا منظور نہیں، اس کے سوا حضور سے بڑھ کر کون ہے، اِس لیے وہ قصہ بھیجتا ہوں۔ حضور اِس کو میری تصنیف سمجھ کر بہ نظرِ تامل بنائیں کہ بڑا مقابلہ ہے اور طبیعت اُن کی (سخن کی) اچھی

ہے۔ چنانچہ آج ہی ایک غزل میرے پاس پٹنہ میں اصلاح کو آئی ہے، اُس کا ایک شعر میرے دل میں کھب گیا، وہ یہ ہے:

سنبھالا ہوش تو مرنے لگے حسینوں پر
ہمیں تو موت ہی آئی شباب کے بدلے"

اس خط کا جواب حضرت غالب نے یہ دیا:

"مولوی سید فرزند احمد... اِس پیرِ ہفتاد سالہ کی دعا پہنچے۔ آج میں نے لیٹے لیٹے حساب کیا کہ یہ سترواں برس مجھے جاتا ہے۔ ہائے:

سنین عمر کے ستّر ہوئے شمار برس
بہت جیوں تو جیوں اور تین چار برس

نامۂ محبت افزا کو دیکھ کر آنکھوں میں نور دل میں سرور آیا۔ اور قصہ سروش سخن اس کے دوسرے دن پہنچا... قصہ دیکھا۔ آپ کی جوہرِ طبع کی لمعانی، اور نیر فکر کی درخشانی بہت جگہ پر پسند آئی۔ اگرچہ وہ قصہ تو بچوں کے سلانے کی کہانی ہے مگر محنت کی گئی ہے۔ ہاں اگر فسانۂ عجائب کا مقابلہ کیا ہے تو کیا کہوں کہ کیا کہا ہے۔ ابھی دیکھتا ہوں۔ آئندہ اس کی کیفیت سے اطلاع دی جائے گی... جابجا لاچار لکھا ہے... لا کا لگانا کاتب کی جہالت ہے... ہائے خدا کی مار کاتبان نانہجار پر۔ میرا دیوان اور پنج آہنگ اور مہر نیم روز ستیاناس کر کے چھوڑ دیا... لو بس اب میں نواب ضیاء الدین خاں سے باتیں کر رہا ہوں۔ تمھارے خط کے جواب نے اتنی دیر تک اُن کو چپکا بٹھا رکھا۔ اور وہ بھی تم کو سلام اشتیاق آمیز پہنچاتے ہیں..."

حضرت غالب کے شعر کا جواب صفیر بلگرامی نے یہ بھیجا:

سنا صفیرؔ یہ کہتے ہیں حضرت غالبؔ
بہت جیوں تو جیوں اور تین چار برس

مگر یہ پہلے سے اعدادِ غین کی ہے دعا
خدا کرے مرا غالب جیے ہزار برس

جناب غالب کے خط کا ایک جملہ تشریح طلب ہے۔ یعنی: ''اگر فسانۂ عجائب کا مقابلہ کیا ہے تو کیا کہوں کہ کیا کہا ہے''۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ مرزا رجب علی بیگ سرور لکھنوی نے فسانۂ عجائب میں اہلِ دہلی کو بہت کچھ نا سزا کہا تھا۔ سروشِ سخن میں اس کا بھی جواب دیا گیا:

فسانۂ عجائب:

''جو گفتگو لکھنؤ میں کو بکو ہے، کسی نے کبھی سنی ہو سنائے۔ لکھی دیکھی ہو دکھائے۔ عہد دولت بابر شاہی سے تا سلطنت اکبر ثانی کہ مثل مشہور ہے، نہ چولھے آگ نہ گھڑے میں پانی، دہلی کی آبادی ویرانی تھی... یہ لطافت اور فصاحت اور بلاغت کبھی نہ تھی۔ نہ اب تک وہاں ہے... عیش و نشاط کی طرف (نصیر الدین حیدر بادشاہ اودھ کی) طبیعت جو آئی تو ایک ایک کنجڑن ادنیٰ اعلیٰ ہفت ہزاری بنائی۔ محمد شاہ (بادشاہ دہلی) کی گورتھرائی...''

سروشِ سخن:

''اور جو اِس قصے کو ملاحظہ کرے، وہ یہ نہ سمجھے کہ فسانۂ عجائب کا جواب لکھا ہے... کہاں فسانۂ عجائب کہاں سروشِ سخن۔ مگس کو ہما کے ساتھ کیا ہم سری؟ ذرّے کو سُہا سے کیا برابری؟ جو لف ونشر مرتب سمجھے وہ البتہ ہمارا مطلب سمجھے... حق تو یہ ہے کہ جو اردوئے معلّٰی کی زبان نہیں جانتا، تذکیر و تانیث نہیں پہچانتا۔ جو شاہجہان آباد میں نہیں رہا ہے، جس نے دربار شاہی نہیں دیکھا ہے وہ فسانہ کیا لکھے؟ اردو جن کی زبان اُنھیں پر لعن طعن! ایسا بھی آدمی بے پیر نہ ہو۔ بقول حضرت نسیم دہلوی:

نسیمِ دہلوی ہم موجدِ بابِ فصاحت ہیں
کوئی اردو کو کیا سمجھے گا جیسا ہم سمجھتے ہیں''

نمونۂ کلام سخن دہلوی اصلاحی حضرت صفیر بلگرامی:

کوئی بلا سے چیر کے پہلو نکال لے
یارو! جو دل یہی ہے تو اک روز ہم نہیں

بہ مجبوری تمھاری ہاں میں ہاں ہم بھی ملاتے ہیں
نہیں کہنے کی جو باتیں ہیں وہ ناچار کہتے ہیں
کیا پامال ٹھوکر سے، جلایا جنبشِ لب سے
اُسے رفتار کہتے ہیں، اِسے گفتار کہتے ہیں
جنوں! یوں تو بہت تنکے پڑے رہتے ہیں صحرا میں
چبھے جو پاؤں میں کانٹا اُسی کو خار کہتے ہیں

احمد

سیّد احمد حسین رضوی، عرف کلومیاں خلف سید رضا حسین، رئیس عظیم آباد، کوچہ چوا لال۔ ۱۲۹۲ ہجری میں شاگرد ہوئے۔ نمونۂ کلام:

بغل میں بیٹھ کر ظالم وفائے غیر کی باتیں!
دبے جاتے ہیں ہم تو تیری تقریروں کے پہلو سے

سلطان

نواب سید تجمل حسین خاں، عرف سلطان میرزا، خلف نواب بہادر سید ولایت علی خاں، رئیس اعظم عظیم آباد۔ یہ صاحب دیوان ہیں۔ مثنوی ''درد دل'' بھی اِن کی یادگار ہے۔ باب اول در بیان س میں تفصیل موجود ہے۔ جناب سلطان نے ایک غزل (سکندر دیکھ کر۔ چادر دیکھ کر) صفیر بلگرامی کو اصلاح کے لیے بھیجی تھی۔ اِس غزل میں ایک مصرع لگا کر مقطع کر دیا:

خود کیا ہے ہم نے سلطاں اپنے قاتل کو پسند
جس طرح تلوار کو لیتے ہیں جوہر دیکھ کر

اس مقطعے کی داد دینے والے سب مرمٹے۔ باقیات الصالحات میں صرف تین بزرگ اس وقت عظیم آباد کی لاج رکھے ہوئے ہیں۔ سید فضل حق آزاد، میر عنایت حسین امداد اور ڈاکٹر سید مبارک حسین مبارک۔ جس کو سمجھنا ہو کہ سلطان کے مصرعِ ثانی کو صفیر بلگرامی کے مصرعِ اوّل نے کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے وہ اِن باقیات الصالحات کے پاس جائے اور سمجھے۔

امیر

سید محمد نواب، خلف نواب حاجی سیّد محمد تقی خاں رئیسِ مظفر پور۔ نمونۂ کلام:

سر مرا جب کہ کٹ چکا ہوگا
کیا ہی قاتل اچھل پڑا ہوگا!

اکرام

سید اکرام الدین، داوَد نگر ضلع گیا۔ نمونۂ کلام:

فرہاد و قیس دیکھتے دیوانگی مری
سوتے ہیں اپنے منھ کو چھپائے کفن میں آج

احسن

ناظر علی احسن، شیخ محلّہ، علی گنج سیوان، نمونۂ کلام:

کوچے میں کیوں ہجوم ہیں اربابِ دید کے
اے ماہِ نو تمھیں تو نہیں چاند عید کے

جوش

شاہ خلیل الدین احمد عرف شاہ خلیل، خلف شاہ محمد اصغر، منیر شریف ضلع پٹنہ۔ اِن کو خواجہ سخن دہلوی، بابو مہدی بخش تسلیم عظیم آبادی کا شاگرد لکھتے ہیں اور جناب نساخ ان کو اپنا شاگرد بتاتے ہیں۔ سخن کی روایت میں کلام ہے۔ نساخ کا بیان صحیح ہے

کیوں کہ نساخ کچھ دنوں کے لیے مونگیر میں تھے۔ ان کے جانے کے بعد مونگیر ہی میں جناب جوش حضرت صفیر بلگرامی کے شاگرد ہوئے اور اپنا فارسی اور اردو کلام اصلاح کے لیے پیش کیا۔ جناب جوش اپنے ایک مکتوب میں صفیر بلگرامی کو لکھتے ہیں:

"...اور ایک بات خیال میں آئی ہے، وہ یہ کہ جوشؔ تخلص بوجہ اِس کے کہ بہت لوگوں کے اور اچھے اچھے شعرائے مغربی کے ہوگئے ہیں، اب ترک کرنا مدنظر ہوگیا ہے۔ اِس لیے رمز اور عقل اولاً و ثانیاً (...؟) پسند آئے ہیں کیوں کہ آفتاب کے سامنے ذرے کی تابش کہیں ہوسکتی ہے؟ اگر یہ التماس میری حضور میں پسند آئے تو رمزؔ تخلص تحریر فرما دیں گے (یعنی اُن دیوانوں میں جو اصلاح کے لیے صفیر بلگرامی کے پاس آئے تھے) اور رسید اِس کی ارسال فرما دیں گے کہ شبہہ نہیں پہنچنے کا نہ رہے۔ زیادہ تسلیمات۔

فقیر زادہ خلیل الدین احمد منیری، خاندان برباد کردہ مخدوم شرف الدین احمد یحییٰ منیری علیہ الرحمۃ"۔

نمونۂ کلام:

اے ناخدائے کشتیِ عمر روانِ ما
خوش بستۂ ز تارِ نفس بادبانِ ما

سائے کی طرح در پہ تو رہنے دے پائمال
مانا کہ پاسباں کے برابر نہیں ہوں میں

حیرت

منشی احمد حسین عرف میاں جان، خلف منشی مرحمت حسین، ساکن حسین گنج کھجوہ۔ پہلے یہ شہرت عظیم آبادی کے شاگرد تھے۔ پھر آرہ میں صفیر بلگرامی کے شاگرد ہوئے۔ نمونۂ کلام:

اشارہ اُس کماں ابرو کا یہ ہے
ترا سینہ مرے تیروں کا گھر ہے!

تمکین

میر عبدالحکیم قنوجی، ساکن محلہ کشمیری کوٹھی، عظیم آباد۔ نمونۂ کلام:

تمھیں سبقت کرو تمکین اگر وہ آ نہیں سکتے
یہی کہتی ہے اب رہ رہ کے یادِ رفتگاں ہم سے

غلام

غلام نبی خاں، ساکن باقر گنج عظیم آباد۔ نمونۂ کلام:

ندی ہے ہر مژہ مری چشم پُر آب کی
پھبتی ہے میرے دیدوں پہ چشمِ حباب کی

خدا جانے کس عالم میں انھوں نے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ پوری ہو کر رہی۔
یعنی وہ غرقِ دریا ہوئے۔

طبیب

ڈاکٹر حبیب اللہ، تخلص طبیب۔ بعد غدر بریلی سے آرہ آئے، اور وہیں مکان
بنوایا۔ نمونۂ کلام:

مرنے کے بعد دی نہ جگہ کوئے یار میں
گردونِ دوں نے کیا مری مٹی خراب کی

فیاض

فیاض حسین، برادر خورد ڈاکٹر حبیب اللہ۔ نمونۂ کلام:

جب گیا میں تو رہا درہم و برہم نقشہ
جب وہ آیا تو بگاڑے ہوئے تیور آیا

متین

سیّد محمد باقر، خلف میر زین العابدین، ساکن چھپرہ۔

اصدقی

میر جان علی شاگرد مولوی نثار علی وکیل عدالت باقر گنج بانکی پور۔ یہ حضرت شاہ قیام الدین اصدق کے مرید تھے اور اسی رعایت سے اصدقی تخلص کیا۔ خواجہ فخرالدین سخن دہلوی بھی حضرتِ اصدق کے مرید تھے۔ چنانچہ ''سروشِ سخن'' میں ایک قصیدے کے دو شعر ہیں:

ستونِ کعبۂ اسلام، عرشِ اعظم حلم
گلِ بہشت کمالات، خضر راہ صفا
وہ کون حضرتِ شاہِ جہاں قیام اصدق
کہ جس کے زیرِ کفِ پا ہے جنت الماوا

میر جان علی اصدقی وہی ہیں جنھوں نے مرزا دبیر کی رباعی کے ایک مصرعے پر اعتراض کیا تھا اور صفیر بلگرامی نے سودا کی سند پیش کی تھی۔ اصدقی نے ہار مان لی اور کچھ عرصے کے بعد صفیر بلگرامی کے شاگرد ہوئے۔ پھر اپنے دو بھانجوں کو شاگردی کے لیے پیش کیا۔ میر رفعت حسین بڑے بھانجے نے کبیر اور میر کفایت حسین چھوٹے بھانجے نے صغیر تخلص پایا۔ نمونۂ کلام اصدقی:

ہم رکھتے ہیں دونوں عکس و آئینہ کی کیفیت
رخِ روشن وہاں اُس کا دل روشن یہاں اپنا

کبیر

میر رفعت حسین ہمشیر زادۂ جناب اصدقی۔ نمونۂ کلام:

عشق نے تیرے مجھے دیوانہ ایسا کردیا
راز دل میں جو مرے تھا سب ہویدا ہوگیا

صغیر

میر کفایت حسین ہمشیر زادۂ جناب اصدقی۔ نمونۂ کلام:

جھوٹے وعدوں پہ اُسے جانے دیا ہم نے صغیر
کیا کیا ہم نے نہ ہوں گے کہیں ناداں ہم سے

شور

داروغہ عبدالرحمٰن، ساکن باقر گنج عظیم آباد۔ یہ مونگیر میں صفیر بلگرامی کے شاگرد ہوئے۔ نمونۂ کلام:

ہوئی ہے قاصدِ جاناں سے اب تو مایوسی
سوائے پیکِ اجل کس کا انتظار کریں

حکیم

محمد اسمٰعیل خاں خلف جناب محمد بخش خاں وکیل پانکی پور و برادر خورد فخرِ ہندوستان مولوی خدا بخش خاں صاحب۔ یہ مقام ہلسہ ضلع پٹنہ میں رجسٹرار تھے۔ نمونۂ کلام:

ہم تابِ آفتاب ہے اُس یار کا مزاج
صورت تو نور کی ہے، مگر نار کا مزاج

باقر

سید باقر حسین رئیس مظفرپور، بڈہن۔ پورہ یہ ۱۲۸۷ ہجری میں بمقام مظفرپور شاگرد ہوئے۔ نمونۂ کلام:

دو آنکھوں میں عین لطفِ داور لکھا — اک بینی کو لام ہے مکرر لکھا
تا سب رہیں روشناسِ حیدر، باقر — چہروں پہ علی علی برابر لکھا

قاصر

لالہ جگت بہاری لال، دیوان سرکار میر رضا حسین، کوچہ چو الال عظیم آباد۔ نمونۂ کلام:

پوشاک سرخ پہنی ہے، منہدی لگائی ہے
قاصر کے قتل کے ہوئے ساماں نئے نئے

مخزوں

سید محمد حسین، عرف محمدو صاحب، رئیس حاجی گنج، سب رجسٹرار۔ نمونۂ کلام:

بہت نزدیک ہے ملکِ عدم، اے طالب منزل
بیک دم جا کے پہنچے ہیں جو اِس بستی میں بستے ہیں

مداح

حکیم نوازش حسین مظفر پوری۔ نمونۂ کلام:

میں لے کے داغِ غمِ ابنِ بوتراب چلا
اندھیرے گھر میں مرے ساتھ آفتاب چلا

نہال

سید شاہ نہال حسن۔ وطن مولا نگر ضلع مونگیر، مسکن بخشی محلہ عظیم آباد۔ پہلے یہ حکیم مولانا عبدالحمید صاحب پریشان عظیم آبادی کے شاگرد تھے۔ ۱۲۸۷ ہجری میں صفیر بلگرامی کے شاگرد ہوئے۔ نمونۂ کلام:

آپ تلوار تولتے ہی رہے
نگہِ ناز کام کر بھی گئی!

حکیم مولانا عبدالحمید عظیم آبادی کے نام پر قلمِ واسطی بلگرامی کو رک جانا چاہیے تھا۔ کیوں کہ ان کا اور ان کے گھرانے کا علم و فضل و تقدس داستان عظیم آباد کا ایک ضروری باب ہے۔ مختصر یہ کہ خاندانِ صادق پور کا رویّہ اسلام کے ساتھ وہی رہا ہے جو مجنون کا لیلیٰ کے ساتھ تھا۔ یعنی:

ہم تری راہ میں مٹ جائیں گے سوچا ہے یہی
دردمندانِ محبت کا طریقہ ہے یہی

چنانچہ مولانا عبدالحمید کے پدر گرامی قدر مولانا احمد اللہ صاحب نے ۱۲۸۱ہجری میں آب دریائے گنگ کے بدلے آبِ دریائے شور قبول فرمایا۔ اور دنیا نے

دیکھ لیا کہ:

شرابِ وفا ہم نے پی ہے صفیر
یہ دھبّے نہ اب عمر بھر جائیں گے

ہیرے کا ٹکڑا بھی ہیرا ہے۔ پھر یہ کیوں کر ممکن تھا کہ حکیم مولانا عبدالحمید بھی یگانۂ روزگار نہ ہوتے۔ موروثی جائدادیں ضبط ہوگئیں۔ کتب خانہ لٹ گیا۔ گھر تباہ ہوگیا۔ مگر علم و فضل کا دریا خشک نہ ہوا۔ البتہ دریا پہلے صادق پور میں بہتا تھا، اب خواجہ کلاں محلے میں بہنے لگا۔ ذرا اس تلاطم اور تباہی، اور خانہ ویرانی، اور شکستہ پائی، اور پریشانی کی حد ملاحظہ ہو کہ مولانا عبدالحمید کا تخلص تک پریشان ہوگیا:

پریشانی ہماری کاکُلِ محبوب جانے ہے
پریشاں کی پریشانی پریشاں خوب جانے ہے

چاند چودھویں کا ہو یا پہلی کا۔ یہ بھی چاند وہ بھی چاند۔ مولانا عبدالحمید مرحوم کے نواسے ڈاکٹر عظیم الدین احمد عظیم (پی ایچ ڈی) آج بھی صدر نشینِ مسند علم و فضل ہیں۔ بقول حضرت صفیر بلگرامی:

کسی صورت میں اے واعظ نہیں نقصان رندوں کا
کہ شیشہ ٹوٹ جاتا ہے تو پھر پیمانہ ہوتا ہے!

مطیر

شاہ سید حفاظت حسین خلف شاہ سید بخشش حسین، رئیس حاجی گنج، عظیم آباد۔

۱۔ شہر عظیم آباد میں یہ پہلے شخص ہیں جو آرہ جا کر صفیر بلگرامی کے شاگرد ہوئے۔

۲۔ جناب ہجرتی عظیم آبادی کے ہاں مشاعرے شروع ہوئے تو صفیر بلگرامی کو شرکت کے لیے آرہ سے یہی لائے تھے۔

۳۔ صفیر بلگرامی کا دیوان اول (صفیر بلبل) انھیں کی فرمائش سے طبع ہوا۔

۴۔ میر علی محمد شاد عظیم آبادی انھیں کے ہمراہ صفیر بلگرامی کی خدمت میں شاگردی کے لیے حاضر ہوئے تھے۔

۵۔ یہ وفاداری میں فرد تھے، بے وفائی کے دشمن تھے۔

نمونۂ کلام:

لایا ہے اِن بُتوں کے محلّے میں مجھ کو دل
مذہب میں جن کے خونِ مسلماں حلال ہے!

فرہاد

نواب سیّد قنبر علی خاں کے صاحب زادے سیّد تفضل علی خاں، ان کے دو صاحب زادے سید علی تقی خاں عرف سیّد محسن اور سیّد اظہار حسین خاں عرف سیّد عباس مرزا۔

سیّد محسن کے دو صاحب زادے، میر جعفر حسین فرہاد اور میر نوروز حسین۔ سیّد عباس مرزا کے دو صاحب زادے سیّد علی محمد شاد، سیّد امیر حسن ایجاد اور ایک صاحب زادی سیّد النسا بیگم۔

سیّد النسا بیگم کی شادی نوروز حسین سے ہوئی۔ اُن کے تین صاحب زادے نواب سیّد نصیر حسین خاں خیال، نواب سید صادق حسین خاں نہال، نواب سیّد عابد حسین خاں کمال۔

سیّد محسن اور سیّد عباس مرزا حضرت صفیر بلگرامی کے خاص قدر دانوں میں تھے۔ ۱۲۸۱ ہجری کا واقعہ ہے کہ سید محسن کے بڑے صاحب زادے میر جعفر حسین فرہاد اور سیّد عباس مرزا کے دونوں صاحب زادے سیّد علی محمد شاد اور سیّد امیر حسن ایجاد، صفیر بلگرامی کے شاگرد ہوئے۔

شاد

سیّد علی محمد شاد کی شاگردی کا واقعہ نواب سیّد تجمل حسین خاں عرف سیّد سلطان میرزا یعنی سلطان عظیم آبادی اپنی تالیف ''مرقع فیض'' میں اِس طرح بیان کرتے ہیں:

''شاد، سید علی محمد۔ خلفِ مہین جناب میر عباس صاحب مرحوم۔

رئیس حاجی گنج پٹنہ۔ یہ مؤلف تذکرہ کے بہت بڑے دوست
لڑکپن کے ہیں۔ اکثر شب و روز کی صحبت رہا کرتی تھی۔ ۱۲۸۰
ہجری میں جناب سید محمد حسین خاں عرف چھوٹے صاحب ہجرتی
نے جب مرزا علی صاحب کے امام باڑے میں مشاعرہ شروع کیا
اُس وقت میر علی محمد صاحب کو شاعری کا شوق شروع ہوا اور
جناب شاہ الفت حسین صاحب فریاد مدظلہ، کے شاگرد ہوئے۔ اور
شاد تخلص مقرر کیا۔

وہ مشاعرہ کوئی چھ سات مہینے تک رہا۔ اُس کے بعد محرم
وغیرہ کے سبب سے موقوف ہوا۔ اِسی مشاعرے میں حضرت صفیر
بلگرامی مدظلہ، بھی بہ تحریک جناب شاہ حفاظت حسین صاحب مطیر
آرہ سے تشریف لائے کہ شاہ صاحب اُنھیں دنوں آرہ میں جا کر
حضرت کے شاگرد ہوچکے تھے اور مطیر تخلص پا چکے تھے۔ المختصر
جب ۱۲۸۱ ہجری شروع ہوا تو بعد اربعین جناب سید حامد حسین
صاحب نکہت نے کشمیری کوٹھی میں مشاعرہ بخاطر حضرت صفیر مقرر
فرمایا کہ جناب ممدوح بھی اُنھیں کے مکان میں قیام پذیر ہوئے
تھے۔ اور دیوان ''صفیر بلبل'' چھپ چکا تھا۔ چنانچہ اِس میں ایک
تاریخ میر علی محمد صاحب شاد کی بہ شاگردیِ فریاد موجود ہے۔ غرض
دوسرے مشاعرے کی طرح میں میر علی محمد صاحب شاد بہ معیت
شاہ حفاظت حسین صاحب چار بجے دن کو میر حامد حسین صاحب
نکہت کے مکان میں تشریف لائے اور باستبدادِ تمام جناب صفیر
کے شاگرد ہوئے اور ۱۲۸۷ ہجری تک یک قلم برابر تعلیم پائی اور
دور و نزدیک یعنی بذریعہ خطوط و ملاقات فیض پایا کیے اور عین
مشاعرے میں اصلاح لیا کیے اور شاعر کامل ہوگئے۔

اور پہلے پہل بندۂ سلطان کو بھی اُنھوں نے آمادہ کیا۔ اور اُن کی شاگردی سے دوچار روز بعد اُنھیں کے مکان میں مجھے حضرت صفیر کی شاگردی کا اتفاق ہوا''۔

اس تحریر کو دیکھیے اور نواب بہادر سید ولایت علی خاں رئیس عظیم آباد کے ہاں کی تقریب کو یاد کیجیے۔ اُس تقریب میں دو لڑکوں کا مونڈھے سے کھیلنا یاد کیجیے۔ ایک نووارد کا احباب کو اشعار سنانا یاد کیجیے۔ اس روز س ش ص کا قضا و قدر کے جال میں آجانا یاد کیجیے۔ اور پھر نو برس کے بعد س اور ش کا ایک ہی ہفتے کے اندر ص کی خدمت میں شاگردی کے لیے حاضر ہونا دیکھیے۔ بقول حضرت امیر مینائی:

کیوں وہ صیاد کسی صید پہ توسن ڈالے
خود بخود صید چلے آتے ہیں گردن ڈالے

میر حامد حسین نکہت عظیم آبادی، عرف میرن صاحب کے ہاں مہینے میں دو بار مشاعرہ ہوتا تھا۔ غزلیں شگوفۂ نکہت میں چھپتی تھیں۔ یہ گلدستہ عظیم المطابع واقع کشمیری کوٹھی عظیم آباد سے نکلتا تھا۔ ۷۳ برس پہلے کا ایک اشتہار ملاحظہ ہو:

شہر میں پھر بہار آئی ہے	تازہ تازہ شگوفے لائی ہے
یعنی پھر یاں مشاعرہ ٹھہرا	خوش زبانی کا پھر مزا ٹھہرا
پندرہ دن پہ جلسہ ہوتا ہے	باغ و بستاں کا رنگ کھوتا ہے
بانیِ جلسہ بامروت ہیں	میر حامد حسین نکہت ہیں
مغتنم ہے بہت عظیم آباد	اس کو رکھے مرا کریم آباد
اس طرح جب مشاعرہ ٹھہرا	دوستوں کا یہ مشورہ ٹھہرا
ہے مزا جو مشاعرہ چھپ جائے	خوش زبانوں کا تذکرہ چھپ جائے
از الف تا بہ یائے تحتانی	ایک مجموعہ ہوگا لاثانی
ہوگئی جب ردیف کی ترتیب	پھر تو دیوان ہے عجیب و غریب
ڈھنگ شہرت کا یہ نرالا ہے	بے تردّد کلام چھپتا ہے
بے مشقت ہے مشق کی صورت	کھل رہا ہے شگوفۂ نکہت

اِس اشتہار میں ۳۷ شعر ہیں۔ صرف ۱۱ شعر یہاں لکھے گئے۔ یہ وہی یادگار گل دستہ ہے جس سے جناب شاد کی شاگردی کا آغاز ہوتا ہے۔ اور یہ وہی نکہت عظیم آبادی ہیں جن کے مکان میں جناب شاد اپنی غزل لے کر شاہ حفاظت حسین مطیر کے ساتھ صفیر بلگرامی کی خدمت میں اصلاح کے لیے حاضر ہوئے تھے۔ اِس یادگار مشاعرے کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

مطیر عظیم آبادی شاگرد صفیر بلگرامی:

پھیلا ہوا جو اُن کی نگاہوں کا جال ہے
اب میرے مرغ رنگ کو اُڑنا محال ہے
ہم کار زار عشق میں ثابت قدم رہے
رستم ہمارے منھ پہ چڑھے کیا مجال ہے
لایا ہے ان بتوں کے محلّے میں مجھ کو دل
مذہب میں جن کے خونِ مسلماں حلال ہے
محشر ہو اے مطیر اگر میں برس پڑوں
پھر ارض کی نشست نہ گردوں کی چال ہے

شاد عظیم آبادی شاگرد صفیر بلگرامی:

اِس شش جہت میں جو ہے اُسے انتقال ہے
حقا کہ تیری ذات صنم بے زوال ہے
جو کام اُن کی زلفِ گرہ گیر سے ہوا
صیاد تیرا جال کرے، کیا مجال ہے
اللہ رے بہار کہ پھولا ہے لالہ زار
گلشن میں جس درخت کو دیکھو نہال ہے
اے شاد کس طرح سے کروں عرضِ مدعا
نا آشنا ابھی صنمِ خورد سال ہے

اس زمین میں صفیر بلگرامی کے چند شعر یہ ہیں:

تیرا ہمارے دھیان سے جانا محال ہے
تو اے پری اسیرِ طلسمِ خیال ہے
تیری مثال نوعِ بشر میں محال ہے
آئینہ خانہ تیرا جہانِ مثال ہے
اِس سے اُلجھ گئی، کبھی اُس سے اُلجھ گئی
تیغِ نگاہِ یار کی کچھ طرفہ چال ہے
ہنسنے میں اُس کے سیکڑوں باتیں نکلتی ہیں
موج تبسم اُس کی زبانِ سوال ہے
نامہ نہیں، پیام نہیں، پوچھنا نہیں
کیوں کر کہوں کہ آپ کو میرا خیال ہے
ہوتا ہے مجھ کو رنج تو ہوتے ہیں آپ خوش
دیوارِ قہقہہ مری گردِ ملال ہے
آہو ہے تو، تو کیا ہے؟ چھلاوا ہے تو، تو کیا؟
غافل! صفیر پاس کمندِ خیال ہے

جناب شاد نے صفیر بلگرامی کی شاگردی اختیار کی تو مرثیہ کہنے کا بھی شوق ہوا۔ حضرت علی اکبرعلیہ السلام کی شان میں اکاون بند کا ایک مرثیہ کہہ کر شاد نے صفیر بلگرامی کی خدمت میں اصلاح کے لیے پیش کیا۔ مرثیہ نامربوط تھا۔ استاد نے جا بجا قطع و برید کی، رفو کیا اور اپنی طرف سے اکتالیس بند کا پیوند لگا کر مرثیے کو درست کیا۔ یہ بانوے بند کا مرثیہ شاد کا سب سے پہلا مرثیہ ہے۔ اور یہ تبرک آج ستر برس سے آرہ میں ہے۔ آرہ میں کیوں ہے اِس کی وجہ حضرت صفیر بلگرامی سے سنیے:

''...میں نے اکتالیس بند اور ملا کر، ربط دے کر، بانوے بند کا مرثیہ اپنے ہاتھ سے صاف کردیا اور اُس پر اُنھوں نے (شاد

نے) چند رباعیاں پھر اپنے ہاتھ سے لکھیں۔ اُس پر بھی میں نے
اصلاح دی۔ آخر محرم میں مع اِس مرثیے کے اُن کو (شاد کو)
جناب میرزا دبیر صاحب کے پاس لے گیا۔ جناب محسن صاحب
مرحوم (انھیں سیّد محسن کے پوتے نواب سیّد نصیر حسین خاں خیال
مرحوم ہیں) اُن کے عم نامدار بھی تھے۔ مرزا صاحب کے پاس
اُس وقت کوئی پچاس آدمی بیٹھے تھے (اِن پچاس آدمیوں میں میر
بادشاہ علی بقا لکھنوی خلف میر وزیر علی صبا لکھنوی بھی تھے) جناب
محسن صاحب نے فرمایا، یہ میرا بھتیجا ہے اور اِس نے مرثیہ کہا
ہے، حضور کے پاس اصلاح کو لایا ہے۔ مرزا صاحب نے فرمایا،
آپ کس کے شاگرد ہیں۔ جناب شاد نے کہا، میر صفیر صاحب
کے، اور میری طرف اشارہ کیا۔ مرزا صاحب نے مجھ سے پوچھا
کہ تم نے دیکھ لیا ہے؟ میں نے عرض کی، جی ہاں، اور میرا ہی
لکھا ہوا ہے۔ اُس وقت مرزا صاحب نے دو ایک بندوں پر
اصلاح دی اور پھر رکھ لیا۔ آخر وہ مرثیہ مرزا صاحب کے ساتھ
چلا گیا۔ اور دوسرے یا تیسرے برس وہ مرثیہ اصلاح دے کر مرزا
صاحب نے لا کر جناب شاد کو دیا۔ اُنھوں نے مجھے دکھایا۔ میں
نے اُن سے لے لیا اور وہ بجنسہٖ مع مسودہ جناب شاد اور اُس پر
جناب مرزا صاحب کی اصلاح میرے پاس موجود ہے۔''

یہ مسودہ آج انمول ہے۔ اس کو گل بکاؤلی بھی نہیں پاسکتا کیوں کہ وہ شنیدہ ہے اور یہ دیدہ ہے۔ شاد عظیم آبادی کی تحریر، صفیر بلگرامی کی تحریر، مرزا دبیر لکھنوی کی تحریر۔ اِن تینوں تحریروں کی زیارت نصیب ہوسکتی ہے تو اِسی مسودے میں۔ اب

نمونۂ اصلاح ملاحظہ ہو:

اصل بند شاہ عظیم آبادی	اصلاح صفیر بلگرامی
بند: ۴۵	
رخ کے قریں جو ہلتی ہے زلفِ سیاہ فام	پہلوئے رخ میں دیکھ کے زلف سیاہ فام
غل ہے کہ اک جگہ ہے بہم نورِ صبح و شام	کہتے ہیں سب کہ آج بہم دیکھے صبح و شام
یاشام میں ہے یوسفِ ذی جاہ و احترام	یا چاہ میں ہیں یوسف ذی جاہ و احترام
کعبے میں یا خلیل نے آ کر کیا مقام	یا کعبے میں خلیل خدا نے کیا مقام
بہر وغا جو عزمِ شہِ کائنات ہے	عزمِ وغا میں ابنِ شہِ کائنات ہے
مشغولِ سیر ہاں عقبِ روز، رات ہے	مشتاق سیر کی عقبِ روز، رات ہے
بند: ۴۸	
ڈوبا ہے وصفِ چاہِ ذقن میں دلِ حزیں	ڈوبا جو وصفِ چاہِ ذقن میں دلِ نزار
زمزم میں یا کہ ہے مہِ کنعانِ برتریں!	گوہر کی طرح مل گئے مضمونِ آب دار
کہتا ہے یہ تلاطمِ دریا نہیں نہیں	خالی نہیں ہے آب سے یہ چاہ زینہار
ظاہر ہے صاف درِ نجف کا ہے یہ نگیں	ہے چشمۂ دہن سے یہاں آب برقرار
چاہِ ذقن کے پاس خطِ مشک بار ہے	چاہِ ذقن کے پاس خطِ مشک بار ہے
کوثر کے گرد سبزۂ رنگیں بہار ہے	کوثر کے گرد سبزے کی دونی بہار ہے

شاگرد کس طرح ٹھوکریں کھاتا ہے اور استاد اُس کو کس طرح سنبھالتا ہے، یہ دیکھنا ہو تو پہلے بند کی ٹیپ کا پہلا مصرع اور دوسرے بند کا دوسرا مصرع دیکھیے۔ یعنی ''شہِ کائنات'' اور ''زم زم میں مہِ کنعاں''۔ شاہِ کائنات کا فرزند شاہِ کائنات نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح ماہِ کنعان کو زم زم سے کوئی واسطہ نہیں۔ جائے استاد خالی است!

اِس مرثیہ کا آخری بند یہ تھا:

اے شاد بس، کہ طول کا دینا نہیں پسند
پہنچی ہے اب کہاں سے کہاں فکرِ ارجمند

مضموں کے ساتھ ہوں گے ترے مرثیے بلند
مطبوعِ طبعِ اہلِ سخن ہوں گے سب یہ بند
شایانِ خود پسندی و اعزاز تو نہیں
یہ پٹنہ ہے، یہ پٹنہ ہے، کچھ لکھنؤ نہیں

مرزا دبیرؔ لکھنوی کی مروت اور بلند نظری نے یہ گوارا نہ کیا کہ عظیم آباد کا پلہ لکھنؤ کے مقابلے میں سبک ہو۔ اس لیے بادشاہِ ملک معانی نے اصلاح یہ فرمائی:

یارب یہ باغ نظم ترا بے خزاں رہے
اک رنگ پر بصورتِ باغ جناں رہے

اِس پہنچے ہوئے فقیر کی دعا کا اثر دیکھیے کہ آج شادؔ کی پھلواڑی میں بہارِ بے خزاں کا دور دورہ ہے!

شاگردی کے زمانے میں جناب شادؔ کو کن کن منزلوں سے گزرنا ہوا تھا، اِس کی تفصیل کے لیے دفتر چاہیے۔ اِس دفتر کا ایک پرزہ یہ ہے:

کلامِ شاد عظیم آبادی : گریباں سیکڑوں پھٹتے ہیں دیوانوں کا مدخل ہے
خدا کے فضل سے کیا ان دنوں آباد جنگل ہے

اصلاحِ صفیر بلگرامی : گریباں سیکڑوں پھٹتے ہیں دیوانوں کی پھرچل ہے
ذرا دیکھ اے جنوں، کیا اِن دنوں آباد جنگل ہے

کلامِ شاد عظیم آبادی : ہماری آنکھ سے وہ شمعِ خوبی جب سے اوجھل ہے
تو اپنے خانۂ تاریک میں آہوں کی مشعل ہے

اصلاحِ صفیر بلگرامی : عجب اندھیر ہے، وہ شمعِ خوبی جب سے اوجھل ہے
مرے تاریک گھر میں نالۂ سوزاں کی مشعل ہے

کلامِ شاد عظیم آبادی : کہیں سر وجد میں ساکن، کہیں لاشے اچھلتے ہیں
ترے آنے سے او سفاک! بزمِ حال مقتل ہے

اصلاحِ صفیر بلگرامی : کہیں سر وجد میں جنباں، کہیں لاشے اچھلتے ہیں
ترے آنے سے او سفاک! بزمِ حال مقتل ہے

کلامِ شاد عظیم آبادی : دکھاتا ہے ٹپک کر قطرۂ مے آب موتی کی
صدف مینا ہے، ساغر، ساقیا! نیساں کا بادل ہے

اصلاحِ صفیر بلگرامی : دکھاتا ہے ٹپک کر قطرۂ مے آب موتی کی
صدف ساغر ہے، مینا، ساقیا! نیساں کا بادل ہے

کلامِ شاد عظیم آبادی : نہ ہووے عاشقوں میں نام تک اُس کا کبھی روشن
بجھادی شمع تک کافر نے آکر میرے مدفن پر

اصلاحِ صفیر بلگرامی : نہ ہو تا عاشقوں میں نام تک میرا کبھی روشن
بجھادی شمع بھی کافر نے آ کر میرے مدفن پر

کلامِ شاد عظیم آبادی : نزاکت نے نہ یارا قتل کا میرے دیا اُن کو
کہ خطِ تیغ پڑ کر رہ گیا بس میری گردن پر

اصلاحِ صفیر بلگرامی : نزاکت نے نہ چاہا مجھ کو اُن کے ہاتھ کا کشتہ
کہ خطِ تیغ پڑ کر رہ گیا بس میری گردن پر

کلامِ شاد عظیم آبادی : چمن میں جب تلک ملتے رہے مسّی وہ ہونٹوں میں
میں کیا کیا چشمکیں کرتا رہا نسرین و سوسن پر

اصلاحِ صفیر بلگرامی : وہ جب تک باغ میں ملتے رہے مسّی کو دانتوں میں
میں کیا کیا چشمکیں کرتا رہا نسرین و سوسن پر

کلامِ شاد عظیم آبادی : پہلو سے چُھٹ کے ہجر میں دل مبتلا نہ ہو
جنگل سے اے جنوں، کوئی وحشی جدا نہ ہو

اصلاحِ صفیر بلگرامی : پہلو سے چُھٹ کے ہجر میں دل مبتلا نہ ہو
نکبت میں اے جنوں! کوئی گھر سے جدا نہ ہو

کلامِ شاد عظیم آبادی : لاش اپنی ہم نے کہہ کے پھرائی ہے کُو بہ کُو
ملنے کا تیرے غیر کو تا حوصلہ نہ ہو

اصلاحِ صفیر بلگرامی : لاش اپنی ہم نے کہہ کے پھرائی ہے کُو بہ کُو
ملنے کا تجھ سے غیر کو تا حوصلہ نہ ہو

کلامِ شاد عظیم آبادی : چاہا تو تھا کہ فیصلۂ جسم و جاں کرے
ہجراں کا کیا گناہ جو میری قضا نہ ہو

اصلاحِ صفیر بلگرامی : چاہا تو تھا کہ فیصلۂ جسم و جاں کریں
وحشت کا کیا گناہ جو اپنی قضا نہ ہو

کلامِ شاد عظیم آبادی : نازک ہے دل، مزاج کو احساں نہیں پسند
شرمندۂ قبول ہماری دعا نہ ہو

اصلاحِ صفیر بلگرامی : اپنے دلِ غیور کو احساں نہیں پسند
شرمندۂ قبول ہماری دعا نہ ہو

کلامِ شاد عظیم آبادی : زیبا نہیں ہے رشک دو روزہ نشاط پر
اپنی خوشی سے تنگ ہماری قبا نہ ہو

اصلاحِ صفیر بلگرامی : زیبا نہیں ہے ناز دو روزہ نشاط پر
اپنی خوشی سے تنگ بدن میں قبا نہ ہو

کلامِ شاد عظیم آبادی : رہنے دو تا بہ مرگ تصور اُس آنکھ کا
آنکھوں سے میری ساغر و مینا جدا نہ ہو

رائے صفیر بلگرامی : یہ شعر کچھ نہیں

کلامِ شاد عظیم آبادی : مانا کہ شعر گوئی سے میری ہے سب کو لطف
اے شاؔد کیا کروں جو طبیعت بجا نہ ہو

اصلاحِ صفیر بلگرامی : مانا کہ شعر گوئی سے میری ہے سب کو لطف
کیوں شاؔد کیا کروں جو طبیعت بجا نہ ہو

کلامِ شاد عظیم آبادی : گئی ہرگز نہ بوئے میرزایانہ مرے سر سے
گدائی بھی اگر عالم میں کی تو کاسۂ سر سے

اصلاحِ صفیر بلگرامی : گئی ہرگز نہ بوئے میرزایانہ مرے سر سے
گدائی بھی اگر عالم میں کی تو کاسۂ زر سے

کلامِ شاد عظیم آبادی : حرارت ہوئے گی جس دم سوا گرمیِ محشر سے
چھپالوں گا میں جسمِ زار اپنا دامنِ تر سے

اصلاحِ صفیر بلگرامی : حرارت جب کہ بھڑکے گی سوا خورشیدِ محشر سے
چھپالوں گا میں جسمِ زار اپنا دامنِ تر سے

کلامِ شاد عظیم آبادی : جو وہ زلفِ سیاہِ فتنہ ساماں رام ہوجائے
تو بھر دوں یا الٰہی طاقِ مسجد مشک و عنبر سے

اصلاحِ صفیر بلگرامی : جو وہ زلفِ سیاہِ فتنہ ساماں ہاتھ آجائے
بھروں گا یا الٰہی طاقِ مسجد مشک و عنبر سے

کلامِ شاد عظیم آبادی : مثالِ عاشقِ شیدا جو ہر دم اُس کا طالب ہے
ملا کیا لطف اِس غم کو ہماری جان مضطر سے

اصلاحِ صفیر بلگرامی : بسانِ عاشقِ شیدا جو ہر دم گرد ہے اُس کے
ملا کیا لطف ہے غم کو ہماری جانِ مضطر سے

کلامِ شاد عظیم آبادی : برافت میں صفا میں روشنی میں ایک پاتا ہوں
کروں گا استعارہ دل کا رخسارِ منوّر سے

اصلاحِ صفیر بلگرامی : صفائی میں جلا میں روشنی میں ایک پاتا ہوں
بجا ہے استعارہ دل کا رخسارِ منوّر سے

کلامِ شاد عظیم آبادی : شبِ فرقت جب آئی خونِ دل اپنا پیا آکر
نہیں مہماں پھرا بھوکا خلیل اللہ کے گھر سے

اصلاحِ صفیر بلگرامی : شب فرقت جب آئی خون دل کا کردیا حاضر
نہیں مہماں پھرا بھوکا خلیل اللہ کے گھر سے

کلامِ شاد عظیم آبادی : دمِ رحلت خبر ہے کس مسیحا دم کے آنے کی
کئی باری اجل پھر پھر گئی آ آ کے بستر سے

اصلاحِ صفیر بلگرامی : دم رحلت خبر ہے کس مسیحا دم کے آنے کی
: کئی باری اجل پھر پھر گئی آ کر مرے سر سے

مخمس برغزل خواجہ وزیر لکھنوی:

کلامِ شاد عظیم آبادی : کون سی ساعتِ بد تھی جو یہاں آ کے پھنسے
پائے وحشت زدہ بڑھ بڑھ کے مژہ نے چومے
حضرتِ خضر کچھ آگاہ ہیں ان باتوں سے
مدتِ قیدِ اسیرانِ کہن کیا کہیے
گل کے سو بار گرے تختۂ زنداں سر پر

اصلاحِ صفیر بلگرامی : جائے رقت ہے، اسیری کے محن کیا کہیے
ہڈیاں رہ گئی ہیں حالِ بدن کیا کہیے
جس کی تحقیق نہ ہو کچھ وہ سخن کیا کہیے
مدتِ قیدِ اسیرانِ کہن کیا کہیے
گل کے سو بار گرے تختۂ زنداں سر پر

کلامِ شاد عظیم آبادی : حلقۂ گیسوے پیچیدہ نہیں، زنداں ہیں
یہ بھی انسان ، کرو غور، نہیں حیواں ہیں
چھوٹنے کی نہیں صورت تو عجب حیراں ہیں
دلِ عشاق بہت گیسوؤں میں نالاں ہیں
کر دو آزاد کہ ہے شورِ اسیراں سر پر

اصلاحِ صفیر بلگرامی بے وفا! دونوں ہیں گیسو ترے یا زنداں ہیں
اِن کے حلقوں میں ہیں دل یا کہ مہِ کنعاں ہیں
سالہا سال سے بے چارے بلا گرداں ہیں
دلِ عشاق بہت گیسوؤں میں نالاں ہیں
کر دو آزاد کہ ہے شورِ اسیراں سر پر

کلامِ شاد عظیم آبادی : مزۂ وحشتِ دل دشت میں چکّھا ہم نے
اے جنوں رتبۂ عالی ترا دیکھا ہم نے
کر کے صحرا میں گزر لطف اُٹھایا ہم نے
دامنِ دشت میں جب پھاڑ کے پھینکا ہم نے
چوم کر قیس نے رکھا وہ گریباں سر پر

اصلاحِ صفیر بلگرامی : جب کیا وادیِ وحشت کا ارادہ ہم نے
جسم سے رختِ تعلّق کا ارادہ ہم نے
جا کے لی سلطنتِ وادی و صحرا ہم نے
دامنِ دشت میں جب پھاڑ کے پھینکا ہم نے
چوم کر قیس نے رکھا وہ گریباں سر پر

کلامِ شاد عظیم آبادی : شاؔد سے پوچھیے کیفیتِ حالِ دلگیر
ضعف بڑھتا گیا جب سے ہوئے اُلفت کے اسیر
حال کیا کیجیے اب آپ سے اپنا تقریر
ناتوانی نے خمیدہ یہ کیا مجھ کو وزیر
زیرِ پا چاکِ گریباں ہے تو داماں سر پر

اصلاحِ صفیر بلگرامی : قابلِ رحم ہے اب شاؔد کا حالِ دلگیر
ضعف بڑھتا گیا جب سے ہوئے الفت کے اسیر
حال کیا کیجیے اب آپ سے اپنا تقریر
ناتوانی نے خمیدہ یہ کیا مجھ کو وزیر
زیرِ پا چاکِ گریباں ہے تو داماں سر پر

اِن اصلاحوں کا سلسلہ کامل سات برس تک جاری رہا۔ ۱۲۸۱ھ سے ۱۲۸۷ھ تک۔ اُس زمانے میں صفیؔر بلگرامی کا قیام زیادہ تر عظیم آباد کشمیری کوٹھی میں تھا۔ اِس وجہ سے جناب شاؔد کو فیض حاصل کرنے میں بہت سہولت ہوئی۔ خود حضرت صفیر بلگرامی

کے الفاظ یہ ہیں:

''......(ہجرتی عظیم آبادی کے ہاں جو مشاعرہ ہوا تھا، اُس میں) جناب میر علی محمد صاحب شاد کا حال معلوم ہوا کہ پانچ چار مہینے سے شعر کہتے ہیں۔ اور جناب شاہ الفت حسین صاحب فریاد سے اصلاح لیتے ہیں۔ اتنے میں گذری کا مشاعرہ برخواست ہوا۔ اور اب میری خاطر سے کشمیری کوٹھی میں جناب نکہت کی طرف سے ہونے لگا...... اِسی مشاعرے کی دوسری طرح میں (زمین: نہال ہے، خیال ہے)...... غزل کہہ کر جناب شاد میرے پاس اصلاح کے لیے لائے۔ اور شاگرد ہونے آئے...... میں تو جانتا تھا کہ وہ جناب شاہ الفت حسین صاحب فریاد کے شاگرد ہیں۔ مجھ کو تامل ہوا، اور استفسار کیا کہ اِس کا سبب کیا ہے؟ فرمایا وہ کلکتہ جاتے ہیں اور میں آپ کے سوا کسی دوسرے کو قابل اصلاح دینے کے نہیں پاتا...... آخر میں نے بعد اصرار کے قبول کیا اور چند رئیسانِ کشمیری کوٹھی کے سامنے اُن کی غزل پر اصلاح دی اور ہر اصلاح پر وجہِ اصلاح کی بھی لکھ دی۔ اُس دن سے جناب شاد اصلاح لینے لگے، اور میں بھی روزانہ چار گھڑی دن رہتے حاجی گنج جاتا اور نو دس بجے شب کو سواری پر وہاں سے آتا۔ اور یہی حال برسوں رہا۔ اِس مدت میں بیسیوں مشاعرے ہوئے اور جناب شاد کو شوق بڑھتا گیا اور میں بھی اپنی کم مائیگی پر جو کچھ جانتا تھا، بتانے میں دریغ نہیں کیا۔ اور اُن کی طبیعت کہ مائل بہ پستی تھی اُس کو طریقہ بتا بتا کر بلند کر دیا اور اپنے ڈھنگ اور اپنے خاندان کی وضع پر لایا...''۔

اس بیان کی تصدیق خود جناب شآد کا قلم اس طرح کرتا ہے:

(۱) دروغ گو نہیں کچھ شاد جو زباں پھیرے
جہاں میں کہنے کو شاعر ہیں یوں تو بہتیرے
جو مجھ سے پوچھ تو یہ ہے گمان میں میرے
صفیؔر لطف ہے ملتا کلامِ میں تیرے
زبان خوب ہے تیری بیاں بہت اچھا

(۲) کرلیا ہے شآد کو زلفِ مضامیں نے اسیر
فی الحقیقت آپ اس فن میں نہیں رکھتے نظیر
اب نئی طرحوں میں پڑھیے شعرہائے دل پذیر
یہ زمیں تفریح کی تھی، بس کریں آپ اے صفیر
ہو چکے اس میں بہت اشعار رہنے دیجیے

زمانۂ شاگردی میں جناب شاد نے اپنے استاد صفیر بلگرامی کو جو خطوط بھیجے، ان میں سے چند یہ ہیں:

مکتوب اول

بلبلِ شاخسارِ حدیقۂ جادو بیانی جناب استاذی میر فرزند احمد صاحب مدظلہ العالی۔ بعد تسلیم عرصہ رساست بخیریت بود صحت وریِ مزاجِ اقدس می خواہد۔ از چندے احوالِ صحت وری معلوم ندارم۔ خداوندِ کریم ذاتِ عالی از جمیع بلیات محفوظ دارد۔ بمنہ و کرمہ۔

دریں مشاعرہ سوائے بندہ و شاہ حفاظت حسین صاحب و سیّد کاظم حسین صاحب کسے نبود۔ جناب خود تشریف نداشتند بدیگراں چہ رسد؟ بنائے جلسہ را لاحاصل دانستہ موقوف ساختم۔ و باوجود وعدہ جناب میر حامد حسین صاحب نیز تشریف نیاوردند۔ برائے تفریح طبع دریں روزہا می خواہم کہ بخدمت شریف حاضر شوم۔ اطلاعاً عرض ساخت۔ زیادہ حدادب۔

کمترین علی محمد عفی عنہ

مکتوب دوم

بُلبلے کہ صفیر منقار گہر بارش لبِ طوطیانِ ہند بندد۔ دام ظلہ۔ تلمیذِ حلقہ بگوش علی محمد عفی عنہ تسلیم و نیاز می رساند... روزے کہ جناب والا رونق افروزِ خانہ ام بودند بحسبِ تذکرہ دو چہار بند مختلف از مراثی جناب مرزا دبیر صاحب خواندہ بودند۔ پس منجملہ آں اگر کدامی مرثیہ ایں جا باشد بعنایتش ممنون تواں فرمود۔ و الاّ دوچار بند کہ یاد باشد نوشتہ عنایت فرمایند۔ بخدمت جناب میر حامد حسین صاحب نکہت سلام می رسانم۔ فقط۔

علی محمد شاؔد

مکتوب سوم

ہادی، سرگروہ معرکہ آرایان سخن استادی۔ شبستانِ فصاحت را شمعِ انجمن دام عنایتہ۔ شاد چوں دلِ خود در اضطراب ہدیۂ سلام و تحیات تسلیمات رسانیدہ عرضہ دہِ ایں کہ عرصہ ہوا کہ آپ کی خیریت سے آگاہ نہیں۔ ترسیل عنایت نامہ ضرور ہے کہ اِس سے باعث زور وقوت شاگرد نیاز مند متصور ہے۔

ان دنوں عجب واقعہ، طرفہ ماجرا، برپا ہے۔ ہر چند پہلے مولوی محمد احسن صاحب شاعرگر و میر محبوب شیر شاگرد اُن کے، ہم سے مباحثے میں الزام اٹھا چکے ہیں، اب پھر وہی تقریب پیش آئی۔ ایک آشنا کے مکان پر بندہ گیا تھا۔ وہاں ایک سادی کتاب رکھی تھی۔ اِس میں کچھ اشعار مولوی صاحب کے لکھے تھے۔ اور ایک رنڈی ہے۔ مستّی جبا۔ ردیفِ غزل اُسی کے نام سے تھی۔ بندے نے وہیں ایک غزل اُسی قافیہ ردیف میں کہہ کے لکھ دی۔ جب مولوی صاحب کے ملاحظے میں آئی تب انھوں نے ایک مطلع اور دو شعر اِس کتاب میں لکھ کر جو عبارت کہ ہم آگے لکھیں گے، لکھ دی۔ جب بندے نے وہ دیکھا خدا کے فضل سے وہیں جواب اُس کا لکھا اور پھر مولوی صاحب نے اُس کو دیکھ کے جواب لکھا۔ بندے نے پھر اُس کا جواب لکھا۔ جب سے پھر اس کا جواب مرحمت نہ ہوا۔ اِس شہر میں ایک دھوم ہوئی کہ جناب شاعرگر صاحب سپر انداختہ ہوئے اور الزام کھایا۔

چوں کہ اطلاع اس کی آپ کی جناب میں حقیر کو ضرور تھی، اِس واسطے التماس کیا۔ فقط کمترین علی محمد شاد۔

مکرر آں کہ جو کچھ امان علی خاں صاحب پدرِ یکتا سے اتفاق ہوا بالمشافہہ انشا اللہ۔

نقل عبارت مولوی صاحب:

''جس شخص کو دعویِ شاعری ہو، اِس میں شعر کہے، تب حقیقتِ امر کھلے۔

ببیں کہ دارم بسوز عشقت	جگر میں داغوں کا ایک گلشن
متاع روحی فداک انظر	تنک تو پیارے ہمار کلپن[۷]
ثنائے حسنت چہ برنگارو	تمھارے غمزوں کا کشتہ احسن
تخجل الشمس والکواکب	تمھارے مکھ کی دمک سے سرجن[۸]

اور یہ مطلع ہے کہ جس پر ہم کو دعویٰ ہے کہ ورائے قافیہ جبا و قبا کوئی نہیں کہہ سکتا:

کل جو ہم نے طرفِ سینۂ جبا دیکھا	صفحۂ حسن میں بس نور کا قبا دیکھا

راقم محمد احسن عفی عنہ

الجواب:

تیغ آب دارِ زبان سوالِ اول کے جواب میں رطب اللسان ہے:

بگو، دلا چیست حالتِ تو	بتا تو اے عقل و دیں کے دشمن
فجاء من فی الخیال الآن	جو بیٹھا بیٹھا کرے ہے سن سن[۹]
چناں ز وحشت بتنگ گشتم	کہ روز کرتا ہوں چاک دامن
فکنت کالقیس یا حبیبی	پڑے جو پٹا تو لاج کیسن[۱۰]
وصالِ تو بہرِ دردِ فرقت	دوا ہے اے حور عیسوی فن
لعلتی لا شفاء قط	لگاؤ ہو ماتھ پر جو چندن[۱۱]

شدہ است عالم چناں ز وحشت	کہ ہووے جس کے بیاں سے اُلجھن [۱۲]
ففی فراق الحبیب سرت	اتیت جیسے پھرے ہے بن بن
صنم چہ گویم کہ کس طرح ہے	تمھاری آفت کی چشمِ پُرفن [۱۳]
یکون سیفا لقلب محزون	گجب کریں ہیں تہار چتون
شدہ است تاریک و تار ازحد	مری نظر میں جہانِ روشن [۱۴]
رایت فی اللیل یا الٰہی	یہ ہم نے سپنے میں کہہ کا درسن
ولم شکستہ چو جام شیشہ	خبر ہے او عاشقوں کے دشمن [۱۵]
من الحجار الفراق انظر	یہ تم نے پھوڑیو ہمار باسن
گہے چو آمد بزیرِ پالش	ز اتفاقات ، میرا مدفن [۱۶]
فقال من الرحم قم باذنی	موئے ہوتم شاد کہہ کے کارن

اب جواب سوال ثانی کا بیان ہے۔ بہت عجب ہے۔ اور مقام فکر و تعب کہ کس دانائے بے بدل، اور کس جادو نگارِ شیوا زبان نے یہ مطلع، مثل مطلع خورشید، آسمان کاغذ پر جلوہ گر کیا ہے، اور کس ناظمِ دور اندیش، انشاکیش نے اِس عبارت کو لکھ دیا ہے۔ اول مشبہ بہ واحد کا اِس مقام پر استعمال ضرور ہے۔ اور اگر مشبہ جمع ہے تو مشبہ بہ جمع لانا ایسے مقام پر دستور ہے۔ لیکن یہ مطلع عاشقانِ بے سروپا کی طرح، دونوں سے مہجور ہے۔ اگر یہ مطلع پھر درست کر کے لکھیں تو ہم اِس پر توجہ کریں۔

اور ایک دو قافیے نادر اگر تلاش سے ہاتھ آئیں تو باعثِ فخر و مباہات نہیں۔ اکثر کم گو بھی نکال لیتے ہیں۔ کچھ بات نہیں۔ یہ امر اتفاقیہ دلیلِ شاعری نہیں۔ برہانِ ماہری نہیں۔ وہ بھی ٹھیک نظر نہیں آتا۔ کیوں کہ لفظ جبّا ساتھ الف مقصورہ کے علم ہے۔ اور قبّا ہائے مختفی کے ساتھ ضم ہے۔ ہر چند صحتِ قافیہ آشکارا ہے۔ پر طبعِ رسا کو کب گوارا ہے: ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا۔

پردے میں گفتگو کب خوب ہے، اپنے نزدیک معیوب ہے۔ گیسوے مشک بارِ سخن کو طول ہو، کسی صحبت میں اِس کا چرچا معقول ہو:

ہمچو مرداں سر میداں آیند	در پسِ پردہ زباں نکشانید

مطلعے کا جواب پائیں، کچھ حظ اٹھائیں۔

کتبہ خادم الشعرا سیّد علی محمد شاؔد عفی عنہ

مکرر یہ ہے کہ ایک غزل بندے نے کہی ہے۔ طالب جواب ہے:

یاد آئی کیوں اسیری میں ترے بالے کی گونج
توڑتی ہے سقفِ زنداں کو مرے نالے کی گونج

مے کدے میں قلقلِ مینا سے شورِ صور ہے
حشر برپا کر رہی ہے آج متوالے کی گونج

ابتدائے حسن میں کب تھی تمھیں اتنی تمیز
یاد ہے کہتے تھے اکثر کھول دو بالے کی گونج

دسترس ہو کاش ہم کو بھی کبھی اے آسماں!
وصل میں وہ ہم سے کھلوایا کریں بالے کی گونج

زلف جاناں کے تصور میں جو روئے دشت میں
میرے نالوں سے کہیں دب دب گئی بالے کی گونج

کیا اُسے بالا کسی محبوب کا سمجھا ہے شاؔد
غور کر کے دیکھتا ہے چاند کے ہالے کی گونج

جواب از طرف محمد احسن:

یہ چند سطریں کسی کی لکھی ہوئی نظر سے گزریں۔ کیفیتِ استعداد کاتب ہویدا ہے۔ اگر سوال قابلِ جواب ہوتا دیا جاتا۔ قابلِ خطاب نہ جان کر احتراز کیا۔ مگر باصرار عنایت فرمائے حاضر الوقت دو تین بیت بجواب ہر دو ایرادِ معترض لکھ دیے جاتے ہیں۔

فردوسی:

چو بکشاد آں طرۂ مشک ناب شب آمد بپا بوسیِ آفتاب

مولانا جامی علیہ الرحمہ:

چو فرق آراست آں پاکیزہ گوہر کشیدہ بر محک گویا خطِ زر

قلق:

سامنا سلطان عالم سے ہمارا ہوگیا   پرتوِ خورشید سے ذرّہ ستارا ہوگیا

العاقل تکفیہ الاشارہ۔ اگر خرداست ہمیں قدر بس است۔

محمد احسن

جواب الجواب:

يَا قَوْمِ اِنِّی لَكُمْ مِنَ النَّاصِحِيْنَ۔ واہ واہ۔ سبحان اللہ۔ کاتب کا لکھا دیکھا۔ یہ جو تحریر ہے کہ سوال قابلِ جواب نہیں، یہ وہی مثل ہے کہ ناچ نہ جانوں آنگن ٹیڑھا۔ اور جو اشعار اساتذہ کے لکھے ہیں وہی ہے کہ:

چہ خوش گفت است سعدی در زلیخا

الایا ایہا الساقی ادر کاساً و ناولہا

وہ اشعار جواب نہیں۔ جواب دہندہ کامیاب نہیں۔ جو اصل قاعدہ ہے وہی مطلعے میں رہ گیا ہے۔ اِس میں جائے گفتگو کیا ہے۔ مگر عارفوں کی بول چال ہے۔ اِس کا سمجھنا محال ہے۔ فقط، عبدالمذنب سیّد علی محمد شآد۔

نقل لفافہ مہری ڈاک خانہ پٹنہ وآرہ:

بعونہ تعالیٰ بقصبہ آرہ ضلع شاہ آباد۔ بہ پھاٹک صاحبان بلگرام...... بعالی ملاحظہ بلبلِ شاخسارِ خوش بیانی جناب استاذی سیّد فرزند احمد صاحب قبلہ المتخلص بہ صفیر دام ظلہ، مشرف باد۔ از عظیم آباد۔ علی محمد شآد۔ بیرنگ۔

جناب شاد کا اپنے استاد صفیر بلگرامی کے نام یہ بیرنگ خط پڑھیے۔ اور پھر نواب سیّد محمد خاں رِند لکھنوی کا یہ مقطع پڑھیے:

چل کے اب عرض کرو حضرتِ آتش سے رند

معرکہ آپ کا یہ طفلِ دبستاں جیتا

جناب شاد کے اِس پُرلطف خط میں چند باتیں تفصیل طلب ہیں:

(۱) عظیم آباد میں ایک مرتبہ ڈھول پٹ گیا کہ صفی پور ضلع ہردوئی سے ایک

استاد ایسا آیا ہوا ہے جو آٹھ دن میں شاگرد کو خاقانی اور سعدی اور فردوسی بنا دیتا ہے۔ یہ غوغا ہوا تو پچھم سے پورب سے دکھن سے اُتر سے جو آتا ہے وہ سیّد محبوب شیر صولت عظیم آبادی کے مکان کا پتا پوچھتا ہے کیوں کہ یہ عجیب و غریب استاد اِسی مکان میں جلوہ فرما تھا۔ اِس جادو گھر میں ایک نومشق بھی جاتا ہے تو دو دن کے بعد حافظ اور جامی کے لباس میں نکلتا تھا۔ سیّد محبوب شیر اور دیگر شاگردوں سے پوچھا گیا کہ آخر معما کیا ہے تو جواب ملا کہ استاد کا حکم ہے کہ یہ راز فاش نہ ہو۔ تب ایک جاسوس بھیجا گیا۔ یعنی عبدالحکیم تمکین قنوجی۔ اِس جاسوس نے شاگردی اختیار کی اور دو دن کے بعد راز فاش کیا...... استاد کے پاس دو کتابیں ہیں۔ ایک میں مترادف الفاظ ہیں۔ دوسری میں مترادف فقرات۔ جس شاعر کی غزل کے موافق کہنا ہوا وہ کتاب سامنے رکھ دی جاتی ہے۔ الفاظ کی تبدیلی کر کے مصرع موزوں ہو جاتا ہے۔ پہلے تو کتاب دیکھنے کی حاجت ہوتی ہے۔ پھر مبتدی اِس کے الفاظ و فقراتِ مترادف کو یاد کر لیتا ہے اور غزل پر غزل کہہ دیتا ہے۔

یہ استاد وہی استاد ہے جس کو جناب شاد نے اس خط میں مولوی محمد احسن شاعر گر لکھا ہے۔ شاعر گر سے مراد یہی واقعات ہیں۔ اور عجیب اتفاق کہ تمکین قنوجی جنھوں نے احسن کا راز فاش کیا، اور شاد عظیم آبادی جنھوں نے احسن کو شکست دی، دونوں صفیر بلگرامی کے شاگرد تھے۔ احسن کو بدگمانی ہوئی کہ پسِ پردہ صفیر بلگرامی ہیں۔ حالاں کہ جناب شاد کا یہ خط شاہد ہے کہ عظیم آباد میں جس وقت یہ معرکہ ہو رہا تھا صفیر بلگرامی اُس وقت آرہ میں تھے۔

احسن کا قیام سیّد محبوب شیر صولت عظیم آبادی کے ہاں تین چار برس رہا۔ مگر تمکین و شاد کا بخار انھوں نے صفیر بلگرامی سے نکالا۔ اور باوجود ہم وطنی کے (صفی پور موضع بلگرام کے پاس ہے) اُن سے ملاقات نہ کی۔ صفیر بلگرامی نے ایک مرتبہ رقعہ لکھ بھیجا جس میں کسی کا یہ شعر بھی تھا:

تعجب کی جگہ ہے ہم تم اک بستی میں بستے ہیں
اور اِس پر یہ مزہ ہے دیکھنے کو بھی ترستے ہیں

اِس کا جواب احسن نے دیا کہ جو مشتاق ہو وہ خود آئے۔ الغرض احسن تین چار برس رہ کر اور سیّد محبوب شیر صولت کو صاحب دیوان بنا کر غازی پور چلے گئے۔ وہاں محمد تقی کوکب جون پوری، حکیم محمد اسحاق حاذق لکھنوی وغیرہ احسن کے شاگرد ہوئے۔ اب عظیم آباد کا واقعہ سنیے کہ سیّد محبوب شیر نے اپنا دیوان میر قاسم شیر کے ہاتھ مولانا محمد سعید حسرت عظیم آبادی کی خدمت میں بھیجا اور تقریظ لکھنے کی استدعا کی۔ مولانا حسرت نے یہ لکھ کر ٹال دیا:

''وصفِ کلامِ فصاحتِ التیام سامی کہ مالا مالِ نازک خیالی ہاست
چہ گویم کہ می ترسم کہ تحسینِ ناشناس موجبِ شکستِ قدرِ آں گوہرِ شاہوار نگردد۔''

یعنی آپ کے کلام کی تعریف ہم کریں تو کیوں کر کریں؟ ڈر یہ ہے کہ تحسینِ ناشناس اِس کو بے قدر کر دے گی۔ تقریظ آپ کسی سخن شناس سے لکھوایئے۔ بہرکیف سیّد محبوب شیر نے ۱۲۸۵ھ میں رحلت کی۔ چار برس کے بعد مرحوم کے خلف سیّد علی شیر مکنت نے یہ دیوان چشمۂ علم پٹنہ میں طبع کرایا۔

آج نہ احسن ہیں، نہ سیّد محبوب شیر ہیں، نہ شاد عظیم آبادی ہیں مگر اِس ہنگامے کی یاد شادؔ کے مقطعے سے آج تک تازہ ہے:

کیا اُسے بالا کسی محبوب کا سمجھا ہے شادؔ
غور کر کے دیکھتا ہے چاند کے ہالے کی گونج

مصرع اول میں ''محبوب'' کا اشارہ جناب احسن کے محبوب یعنی سیّد محبوب شیر کی طرف ہے۔

(۲) جس زمانے میں احسن کا دور دورہ تھا، اُس زمانے میں زلیخائے مصری کی دو بہنیں نجا اور جبا سارے عظیم آباد کو چالے ہوئی تھیں۔ نجا کی نشانی باندی۔ باندی کی نشانی سعیدہ۔ مگر جبا کی نشانی پوچھیے تو شاد و احسن کا یہی معرکہ:

صنم چہ گویم کہ کس طرح ہے تمھاری آفت کی چشمِ پُرفن
یکون سیفا لقلب محزون گجب کریں ہیں تہار چتون

شاد نے جن آنکھوں کی دوہائی دی ہے، وہ آنکھیں ایک باکمال عورت کی تھیں۔ جبّا کی فارسی دانی اور ادبی قابلیت سے لوگوں کا ناطقہ بند تھا۔ ایک مرتبہ کشمیری کوٹھی میں مخصوص فارسی قصائد کے لیے مشاعرہ تھا۔ فارسی گو اساتذہ کا مجمع تھا اور صدر میں جبّا تھی۔ شعرا اپنے اپنے قصائد سنا رہے تھے۔ اتنے میں ایک ممتاز رئیس و ادیب نے اپنا قصیدہ شروع کیا تو جبا بول اٹھی:

''میں اِس کا قصیدہ سن کے کیا کروں گی؟''

رئیس و ادیب بے چارہ پانی پانی ہوگیا۔ مجمع انگشت بدنداں تھا۔ مگر جبّا کے سامنے کوئی دم نہ مار سکا۔

(۴) جناب شاد کے اِس خط میں ایک جملہ ہے: ''جو کچھ امان علی خاں صاحب پدرِ یکتاؔ سے اتفاق ہوا بالمشافہہ انشاء اللہ''۔ اِس سے مراد مرزا قتیلؔ کے شاگرد مرزا امان علی خاں غالبؔ لکھنوی ڈپٹی کلکٹر ہیں۔ اردو میں قصۂ امیر حمزہ اِنھیں کی تالیف ہے۔ اِن کا قیام دیوان محلّہ عظیم آباد میں تھا۔ غالبؔ لکھنوی کے بیٹے مرزا نوروز علی خاں یکتاؔ عظیم آبادی وہی ہیں جن کی یکتائی عبدالغفور خاں نساخ کو نہ بھائی۔ نساخ کا نشتر ملاحظہ ہو:

''اُن میں (یکتا میں) ایک بڑا عیب ہے کہ دوسرے شاعروں کے شعر کو اپنے نام سے پڑھتے ہیں''۔

مگر ناظر وزیر علی عبرتی کے ایسا مستند ادیب و چشم دید گواہ کہتا ہے:

''چشمِ بد دور تلاشے وارد رنگین تراز دامنِ گل۔ و فکرے دارد آتشیں تر از نغمۂ بلبل... نظم آبدار می نگارد۔ و نثر ثریا نثار می طرازد۔ ایزد تعالیٰ نہالِ خیالش را ہمہ بہار دل داراد...''

باب سوم

در بیان — ص

حضرت غالب کے مطبوعہ خطوط میں چودھری عبدالغفور کے نام جو خطوط ہیں روئے سخن ان کا دراصل حضرت صاحب عالم صاحب بلگرامی سجادہ نشین مارہرہ ضلع ایٹہ کی طرف ہے۔ چنانچہ ایک خط میں حضرت غالب فرماتے ہیں:

"تحقیق کہ اب روئے سخن جناب فیض نساب، جامع مدارج جمع الجمع، بزم وحدت کی فروزندہ شمع، مستغرق مشاہدۂ شاہد ذات، حضرت عالم صاحب قدسی صفات کی طرف ہے......"

ایک دوسرے خط میں فرماتے ہیں:

"جناب چودھری صاحب! آؤ۔ ہم تم حضرت عالم کے پاس چلیں۔ اور اپنی آنکھیں اُن کے کف پائے مبارک سے ملیں۔

میں سلام کروں گا۔ تم معرف ہونا کہ غالب یہی ہے! اہل دہلی میں آپ کے دیدار کا طالب یہی ہے! میں نے عزمِ قدم بوسی کیا... پیر و مرشد نے مجھے گلے لگایا۔

فرماتے ہیں۔ غالب! تو اچھا ہے؟... عرض کرتا ہوں کہ الحمدللہ! حضرت کا مزاج مقدس کیسا ہے؟

ارشاد ہوا کہ مولوی سیّد برکات حسن تیری بہت تعریف کرتے رہتے ہیں۔ جناب! یہ ان کی خوبیاں ہیں۔ میں ایسا نہیں ہوں جیسا وہ کہتے ہیں۔ کاش وہ میری رنجوری کا حال کہتے، ضعفِ قویٰ و اضمحلال کہتے۔ تا کہ میں اُن کے کلام کی تصدیق کرتا۔ اُن کی غم خواری اور درد مندی کا دم بھرتا:

در کشاکشِ ضعفم بگسلد رواں از تن
اینکہ من نمی میرم، ہم ز ناتوانی ہاست

حضرت نے میری گرفتاری کا نیا رنگ نکالا۔ بوستانِ خیال کے دیکھنے کا دانہ ڈالا۔ مجھ میں اتنی طاقت پرواز کہاں کہ بلا سے اگر پھنس جاؤں، دام پر گر کے دانہ زمین پر سے اٹھاؤں۔ حضرت! سچ تو یوں ہے کہ غم ہائے روزگار نے مجھ کو گھیر لیا ہے۔ سانس نہیں لے سکتا۔ اتنا تنگ کر دیا ہے:

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
ناامیدی اس کی دیکھا چاہیے"

یہ خط دہلی سے مارہرہ گیا تھا۔ مگر اِس کو تعلق آرہ سے ہے۔ آرہ میں حضرت صاحب عالم صاحب کے نواسے اور حضرت غالب کے شاگرد صفیر بلگرامی نے بوستانِ خیال کی اٹھارہ جلدوں کا ترجمہ فارسی سے اردو میں کیا اور دو جلدیں شائع ہوئیں تو غالب نے مبارک باد دی:

نور نظر، لخت جگر، زبدۂ اولاد پیغمبر، مولوی سیّد فرزند احمد زادمجدہ۔ اِس درویشِ گوشہ نشیں کی دعا قبول فرمائیں۔ بوستانِ خیال کے ترجمے کا عزم اور دو جلدوں کا منطبع ہوجانا مبارک۔ حضرت! یہ آپ کا احسان عظیم ہے۔ مجھ پر خصوصاً۔ اور بالغ نظرانِ ہند پر عموماً۔ غالب ۱۲/ ذیقعد ۱۲۸۱ھ۔"

اِسی بوستانِ خیال اردو کی اور جلدیں صفیر بلگرامی کے نانا حضرت صاحب عالم سجادہ نشیں مارہرہ نے غالب کو دیکھنے کے لیے بھیجیں تو چودھری عبدالغفور کے خط میں وہ جواب آیا جو اوپر لکھا گیا۔

صفیر بلگرامی کے بارے میں جو ہر شناس کیا کہتے تھے اور کیا کہتے ہیں، اِس کا بیان قصیدۂ زلفِ لیلیٰ ہے۔ اِس قصیدے کا چہرہ یہ ہے:

مفتی سیّد محمد عباس شوستری:

جہان[☆۱۷] است آلنگ خوش شہر پور   انوشہ بخوشہ فروزندہ ہور

بھادوں کی جھڑی ہے۔ ہریالی ہے۔ جبھی تو سورج مہاراج تک ایک کنیا کے پھیرے میں آگئے!

بپیشم شتاباں بیا موبدا   مبجشنی چہ خوانی برائے خدا

اے اگنی دیوتا کی آنکھوں کے تارے! تیری پوتھی جائے چولھے بھاڑ میں۔ ہمارے پاس آتا کیوں نہیں؟

چہ ازبر سرائی نسک ہائے ژند   ببین و بخواں نامۂ دل پسند

ہم پوچھتے ہیں کہ وہاں بیٹھا ہوا کیا الاپ رہا ہے؟ تیری پوتھی میں آخر رکھا کیا ہے؟ دیکھنا ہو تو ادھر آ۔ پڑھنا ہو تو ادھر آ۔

کہ فرزند احمد ہمایوں منش   گرامی نژاد و خجستہ روش

فرزند احمد کو دیکھ۔ جس کا سبھاؤ اچھا۔ جس کی پیڑھی اونچی۔ جس کی چال ڈھال اچھی۔

بنشت است زیبا تر از گلستاں   نگرا تا دلت شاد گردد ازاں

پھلواڑی میں وہ پھول کہاں جو اُس کے پاس ہیں؟ آ کر دیکھ لے۔ جھولی بھر لے۔

کہ فرزند احمد دبیرِ کبیر   جوان است و خوش فکر و بلبل صفیر

فرزند احمد قلم کا دھنی ہے۔ جگت گرو ہے۔ جوان ہے۔ کبیشر ہے۔ بلبل ہے۔ صفیر ہے۔

میرزا دبیر لکھنوی:

(۱) ''خطیبِ منابرِ فصاحت و نکتہ دانی، عندلیب حدائقِ بلاغت و رنگین بیانی، سلمک اللہ تعالیٰ''۔

(۲) نمک خوانِ سخن، محکِ امتحانِ طرزِ ممتحن، فصاحت سرمایہ، بلاغت پیرایہ، سیّد فرزند احمد صاحب متخلص بہ صفیر زاد قدرہ۔ بادۂ تمنا در جام و زلالِ مدعا ہموارہ بکام باد!''

مرزا محمد باقر صحبت شیرازی:

از قصیدہ در مدح حضرت صفیر بلگرامی:

ہزار مرتبہ گر مدح حضرت تو سرایم　　یک از ہزار نگویم چہ منجلی و چہ مبہم
ہم آسمان جلالی، ہم آفتاب جمالی　　ہم آستان کمالی، جلیل قدر و معظم
جناب سیدِ فرزند احمدی و صفیری　　ہمی ز زمرۂ ساداتِ بلگرام مقدّم
گرم بلطف بخوانی، ورم بقہر برانی　　سراندرم بکمند تو است و حکم تو محکم
بپاے رحمت و فضل ار قدم کنی سوئے صحبت　　رسد بزخم درونش زخاک پاے تو مرہم

مرزا حاتم علی مہر لکھنوی:

''نہ تنہا عشق از دیدار خیزد　　بساکیں دولت از گفتار خیزد

الحمدللہ علی احسانہ کہ از صریر خامہ صفیرے بگوش خورد۔ و دلم از دست برد:

بریں مژدہ گر جاں فشانم رواست　　کہ ایں مژدہ آسایشِ جان ماست

مکرمت نامہ دی کہ یکم اگست بود با یک جلد ''علی بند'' و ''حسین بند'' براے بندہ، و دو تا براے برادر عزیزم میرزا عنایت علی ماہ سلّمہٗ اللہ، و نورچشم آغا سخاوت علی ضیا اسسٹنٹ کلکٹر و ڈپوٹی مجسٹریٹ ایں ضلع ایدہ اعلی اللہ درجاتہم، معہ یک جلد ''سفر صفیر'' و

یک جلد تذکرہ تلامذۂ بلند فکر خیرالذکر سبیل ڈاک رسید۔ و ایں خمسہ چوں خمسۂ نظامی بر حواس خمسہ ام نظام تازہ بخشید۔ ماشاء اللہ ہر تصنیف شریف لطفے دارد کہ دل شیدائے سخن می خارد:

بمانا و آں دوست کو دوستاں را غذائے دل و راحتِ جاں فرستد

مہجور، از عالی دودمان و والا شان اعز اعزّا میر بادشاہ علی صاحب بقا صہر میرزا سلامت علی صاحب دبیر مغفور خلف الصدق جناب میر وزیر صاحب مبرور، محامد و مدیح جناب بیشتر از بیشتر می شنفت۔ اکنوں از کلامِ بلاغت نظام بہ ازاں دریافتم کہ عزیزم می گفت۔ تعالیٰ شانہ سلامت داشتہ باشد۔ بحق محمد و آلِ محمد۔ می خواہم کہ گاہ گاہ بخاطرِ مبارک رسیدہ باشم۔ زرد چہر۔ مہر عفی عنہ"۔

حضرت امیر مینائی:

"بلبل شیراز و طوطی ہند کے ہم صفیر سلامت۔ سلام مسنون اخلاص و سپاس مشحون۔ سفر سے پلٹ کر بیماریوں اور بیماروں کی پرستاریوں نے مجھ سے جی بھر کے اُن آسایشوں کا عوض لیا جو میں نے ملاقات احباب سے سفر میں پائی تھیں۔ وہ سرگزشت لکھوں تو خط مرثیہ ہوجائے۔ کتنے ہی عزیز چل بسے۔ خدا مغفرت فرمائے۔

اِس اجمالی اطلاع سے مقصود یہ ہے کہ آپ اپنے فقیر، نام کے امیر، کو یہ نہ سمجھیں کہ وطن پہنچ کر آپ کی مہربانیوں اور قدر دانیوں کی لذت بھول گیا۔ نہیں نہیں۔ سب اُسے یاد ہے۔

امیر اللغات کے اصول سے متعلق ایک کاپی بھیج کر آپ کے دل و دماغ سے جواب باصواب کی آرزو ہے۔ زیادہ حاجت تصدیع نہیں۔

امیر احمد عفی عنہ

اجی حضرت! جلوۂ خضر کی دوسری جلد چھپنے میں کیا دیر ہے؟ ضرور لکھیے کہ کب تک مشتاقوں کو تڑپائے گا۔ فقط۔ والسلام بالاکرام۔ ۹ر دسمبر ۱۸۸۸ء"۔

اس خط میں جس سفر کا حوالہ ہے، اُس سے مراد عظیم آباد ہے۔ ۱۳۰۵ھ میں حضرت امیر مینائی اپنے شاگرد مہدی حسن خاں شاداب رئیس رسول پور ضلع مظفر پور کے طلبیدہ عظیم آباد تشریف لائے۔ اور ریاض و کوثر کے ساتھ لال کوٹھی میں ٹھہرے۔

اردو کا سب سے پہلا لغت سیّد احد الدین بلگرامی نے، اور اُسی زمانے میں میر علی اوسط رشک لکھنوی نے لکھا۔ رشک کا لغت غیر مطبوع رہا۔ اِس کے تقریباً ۳۶ برس کے بعد حضرت امیر مینائی کا یہ خط صفیر بلگرامی کو آیا۔ آرہ سے اِس کا جواب ۲۲ر دسمبر کو چالیس صفحوں میں گیا۔ خط کیا ہے کہ دریائے تحقیق موجیں مار رہا ہے۔ صفیر بلگرامی کا جواب پانے کے چار سال بعد حضرت امیر مینائی نے امیر اللغات کا پہلا حصہ شائع کیا۔

''جلوۂ خضر'' جس کے بارے میں امیر مینائی لکھتے ہیں کہ مشتاقوں کو کب تک تڑپائے گا، صفیر بلگرامی کی وہ بلند پایہ تالیف ہے جس پر صوبۂ بہار ناز کرسکتا ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر بیلی، پروفیسر لندن یونی ورسٹی، اپنی کتاب ہسٹری آف اردو لٹریچر (تاریخ ادب اردو) مطبوعہ ۱۹۳۲ء ص ۹۲ میں تحریر فرماتے ہیں:

SAFIR BILGRAMI.... HE LIVED A LARGE PART OF HIS LIFE IN 'ARA' AND WROTE MUCH VERSE, PRINCIPALLY LOVE LYRICS. HIS PUBLISHED BOOKS INCLUDE AN ANTHOLOGY, SALAVAT-I-KHIZR, AND VOLUMES OF LYRICS CALLED-SAFIR-I-BULBUL AND KHUMKHANA-E-SAFIR. HE WROTE A NOVEL, RUH AFZA, WHICH WAS NOT PUBLISHED. PERHAPS HIS MOST IMPORTANT WORK WAS JALVA-E-KHIZR, A HISTORY OF URDU LITERATURE, WHICH HE WROTE WITH A VIEW TO CORRECTING WHAT HE CONSIDERED THE MIS-STATEMENTS OF AZAD'S AB-I-HAYAT (A HISOTRY OF URDU LITERATURE BY DR-T-G-BAILEY,M-A.)

ترجمہ: ''صفیر بلگرامی... زندگی کا زیادہ حصہ اُن کا آرہ میں گزرا۔ نظم میں ان کا کلام بہت کچھ ہے۔ بالخصوص غزلیات۔ اُن کی مطبوعہ کتابوں میں 'صلوات خضر' (بیاض اشعار) اور ''صفیر بلبل'' و ''خم خانۂ صفیر'' دو دیوان غزلیات بھی ہیں۔ ایک ناول 'روح افزا' بھی لکھا تھا جو طبع نہیں ہوا۔ مگر اُن کی اہم ترین تالیف ''جلوۂ خضر'' ہے۔ یہ تاریخ ہے ادب اردو کی اور مؤلف کے خیال میں آزاد کی ''آب حیات'' میں جو غلط بیانیاں تھیں، اُنھیں کی تصحیح کے لیے یہ کتاب لکھی گئی''۔

شوق نیموی:

(۱) ''جناب فیض مآب، سخن ور نامی گرامی، حضرت سیّد فرزند احمد صاحب صفیر بلگرامی مد فیضکم۔ محمد ظہیر احسن شوق نیموی عظیم آبادی شاگرد حضرت تسلیم لکھنوی بعد تسلیم و بندگی کے التماس کرتا ہے کہ جلال لکھنوی نے ایک رسالہ ''کارآمد شعرا'' تانیث و تذکیر میں لکھا ہے۔ ایک روز فخراً کہنے لگے کہ اِس رسالے کا موجد میں ہوں۔ اِس پر حضرت استاد نے فرمایا کہ سبحان اللہ صفیر بلگرامی اِس قسم کا رسالہ پہلے لکھ چکے ہیں...... تب جلال کچھ طعن کی باتیں کہنے لگے...... چند روز ہوئے کہ میں حضرت استاد کی خدمت میں رام پور گیا تھا۔ اِس کا ذکر آیا۔ میں نے کہا کہ عرصہ ہوا کہ اصل رسالہ چھپ گیا۔ انھوں نے فرمایا کہ اگر وہ مل سکے تو ایک جلد بھیج دینا کہ جلال کو دکھاؤں۔ اِس سبب سے التماس ہے کہ اب آپ کے پاس کوئی نسخہ ''رشحات'' کا موجود ہے یا نہیں......''

(۲) ''سخن ورِ نامی گرامی، چاشنی بخش مایدۂ شیریں کلامی، جناب سیّد فرزند احمد صاحب صفیر بلگرامی مد ظلکم اللہ السامی۔ خاک پائے ارباب ذوق، محمد ظہیر احسن شوق بعد تسلیم و بندگی کے التماس کرتا ہے کہ آپ کا نامۂ نامی ورود ہوا...... آپ نے در باب ''رشحات'' جو کچھ تحریر فرمایا ہے سب بجا درست ہے۔ میرے ایک عم زاد برادر کے پاس یہ رسالہ ہے۔ میں نے اِس کی خوب سیر کی ہے۔ فی الحقیقت آپ اِس کے موجد ہیں۔ ''رشحات'' اور ''کارآمد شعرا'' میں آسمان و زمین کا فرق ہے۔ جلال کا دعویٰ محض بے بنیاد ہے۔ حضرت تسلیم کے پاس تسہیل تانیث و تذکیر تھی۔ میں نے عندالتذکرہ اُن سے کہا کہ جس طرح اِس میں متقدمین و متاخرین کے اختلاف بیان کیے گئے ہیں، اُسی طرح اصل میں بھی ہر اک کی مثالیں بھی اِس قسم کی موجود ہیں کہ جن کی بنا قوافی و ردیف پر ہے۔ اِس میں اغلاط کاتب کے گمان کو بھی گنجایش نہیں، اور ''کارآمد شعرا'' میں اِس کا التزام نہیں ہے۔ یہ سن کر جناب ممدوح نے آپ کی جاں فشانی کی کمال داد دی اور بہت مداح رہے...... ہر چند آپ ایسے لائق لوگ کی خدمت میں اپنا کلام

بے نظام موردِ کلام بھیجنا سراسر گستاخی ہے..... مگر دو غزلیں جو فی الحال کہی ہیں ارسال کرتا ہوں..... اگر خدا نے چاہا تو اب کے مرتبہ جب وطن کو جاؤں گا تو آرہ ہوتے جاؤں گا۔ ملاقات کی کمال آرزو ہے.....

از شہر لکھنؤ، کشمیری محلہ، متصل چاہ حیدر بیگ خاں''۔

''رشحات صفیر'' تانیث و تذکیر کی تحقیق میں صفیر بلگرامی کی ایک دوسری بلند پایہ تالیف ہے۔ اِس پائے کی کتاب اب تک ہندوستان میں نہیں لکھی گئی۔ حضرت جلال لکھنوی کو دعویٰ تھا کہ وہ اِس کے موجد ہیں۔ حضرت تسلیم لکھنوی اور شوق نیموی نے صفیر بلگرامی کی کتاب اِسی دعوے کو رد کرنے کے لیے منگائی تھی۔

''رشحات صفیر'' کے بارے میں حضرت غالب کا فیصلہ ملاحظہ ہو:

حضرت غالب:

''سیّد سندی، نور بصر، لختِ جگر، قرۃ العین اسد، مولوی سیّد فرزند احمد کے طولِ عمر و دوامِ دولت و بقائے اقبال کی دعا مانگتا ہوں جن کو مبدءِ فیاض ہے اِس رسالے کے لکھنے کی توفیق عطا ہوئی ہے..... سیّد صاحب دانا اور دقیقہ رس اور منصف ہیں... قوتِ علم اور حسنِ فہم اور لطفِ طبع سے وہ مضبوط ضوابط بہم پہنچائے ہیں، مجھے دل سے پسند آئے ہیں۔ دعا یہ ہے اور یقین بھی یہی ہے کہ یہ رسالہ صفحۂ دہر پر یادگار اور ہمیشہ منظورِ انظار اولوالابصار رہے گا..... مؤلف صاحب جو کامیاب اپنے ذہنِ رسا سے ہیں، رئیس جلیل القدر آرہ اور حضرت فلک رفعت مولوی صاحب عالم صاحب مارہروی کے نواسے ہیں۔ سیّد واسطی بلگرامی ہیں، جہاں کے سادات علم و فضل میں نامی اور قدر و منزلت میں گرامی ہیں۔ اِن حضرت کا مادّح گویا اپنا ثناخواں ہے۔ جیسا کہ مولوی معنوی رومی علیہ الرحمہ کا بیان ہے:

مادّح خورشید مداح خود است
کہ مرا دو چشم سر نامرمد است

داد کا طالب، غالب''

ایک اور خط میں حضرت غالب فرماتے ہیں:

''بعلاقۂ مہر و محبت نورِ چشم و سرورِ دل۔ اور برعایتِ سیادت مخدوم و مطاع، مولوی سیّد فرزند احمد...... اشعارِ گہر بار دیکھ کر دل بہت خوش ہوا۔ سب اچھے ہیں۔ مگر جو میرے دل میں اتر گئے ہیں وہ تم کو لکھتا ہوں:

ہائے وہ لب ہلا کے رہ جانا
ابھی کچھ بات کر نہیں آتی

ورق ہیں جوششِ مضمونِ گریہ سے بادل
بسانِ ژالہ ہے ہر نقطۂ کتاب میں آب
کبھی ہوں گرم کبھی سرد حسبِ موقعِ وقت
صفیر آگ میں ہوں آگ اور آب میں آب

عارفانہ اور موحدانہ مضمون۔ اور بالغانہ الفاظ:

تم سلامت رہو قیامت تک
صحت و لطفِ طبع روز افزوں

نجات کا طالب، غالب۔ شنبہ ۲۵/ ذیقعدہ ۱۲۸۱ھ۔

نواب سیّد رضا علی خاں عظیم آبادی (نبیرۂ جعفر حسن خاں فیضِ شاگرد مصحفی علیہ الرحمہ):

خوشا اے رضا ایں کلامے کے از وے بدل ہست قوت و بجاں ہست قوت
بود از تصانیف سحبانِ دوراں بلیغ الکلام و کلام البلاغت
گرامی دل و بلگرامی توطن صفیرِ سخن سنج عالی طبیعت
بریں خوانِ یغما چہ یاراں چہ اعدا بیایند و گیرند صد گونہ لذت

جناب راز عظیم آبادی:

سیّد عزیز الدین احمد بلخی راز عظیم آبادی مؤلف ''تاریخ شعرائے بہار'' لکھتے ہیں:

''ادب اردو کی تاریخ میں صفیر بلگرامی بھی ایک امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔

نظم میں غالباً آٹھ دیوان کے قریب اُن کے کلام مرتب ہوگئے تھے جیسا کہ خود فرماتے ہیں:

مشق تیری یہ بیالیس برس کی ہے صفیر
آٹھواں فضلِ الٰہی سے ہے دیواں تیرا

نثر میں تالیف و تصنیف کی تعداد نظم سے بھی زیادہ ہے۔ فہرست تصانیف حسب ذیل ہے''۔

جناب راز عظیم آبادی کی فہرست نامکمل ہے کیوں کہ اِس میں صرف بیس کتابوں کا حوالہ ہے۔ حالاں کہ ۱۲۹۴ھ تک نظم میں ۵۷ اور نثر میں ۱۷۴ کتابیں تصنیف و تالیف ہوچکی تھیں۔ اور اِن ایک سو چوہتر کتابوں میں تین کتابیں، مجموعۂ فیضِ صفیر، گلبنِ موزوں اور بوستانِ خیال اردو بہتر جلدوں میں تھیں۔

نواب خیال عظیم آبادی:

مکتوب نواب سیّد نصیر حسین خاں خیال عظیم آبادی بنام سیّد وصی احمد بلگرامی:

''پرنسب اسٹریٹ کلکتہ۔ ۲۴؍ جولائی ۱۹۱۵ء۔

عزیز محترم۔ میں مرثیہ گویانِ ہند کا ایک تذکرہ مرتب کرنے کی فکر و کوشش کررہا ہوں۔ چونکہ جناب غفران مآب مولوی سیّد فرزند احمد صاحب مغفور نے بھی مرثیے کہے تھے، اِس لحاظ سے اِن مرحوم کا ذکر خیر بھی اِس تذکرے میں ضرور و واجب ہے۔ میں نے کوشش کی مگر اِن جناب کا کوئی مرثیہ مجھے اب تک نہیں مل سکا۔ آپ کا پتا بھی معلوم نہ تھا جو قبل آپ کو لکھ سکتا۔ کسی طرح آپ کا نشان حاصل کر کے آج اِس طرف متوجہ کرسکا ہوں۔ فرمایش ہے کہ اِس کام میں خاطر خواہ میری مدد کیجیے اور آپ کے ذریعے سے اگر پرانے مراثی کہیں مل سکیں تو اُن کے حاصل کرنے کی فکر کیجیے اور اپنے دادا صاحب (صفیر بلگرامی) مرحوم کے مراثی میں سے دو ایک بھی مل سکیں تو مجھے فوراً بھیجیے...... جو تعلقات اُن مرحوم کو ہم لوگوں کے ساتھ رہے ہیں، اُس کا اقتضا یہ ہے کہ میرے قلم سے اُن کے صحیح و ضروری حالات نکلیں۔ واقعی حیف کی جا ہوگی اگر یہ

تذکرہ ان جناب کے اُن ذکروں سے خالی رہ جائے جن کا درج ہونا ضروری و لازمی ہو۔ اور مجھے تو ایسا قلق ہوگا کہ اپنی باقی کل محنت کو رایگاں سمجھوں گا...... مرحوم نے ایک تذکرہ بھی تالیف کیا تھا جس کا نام ہے ''جلوۂ خضر''۔ مجھے اِس کی بے حد ضرورت ہے۔ کسی طرح اِس کو بھی فراہم کر کے مجھے بھیجیے۔ ایک فرنچ گارسن دی تاسی تذکرہ نویس خبر دیتا ہے کہ مرحوم نے ۱۸۶۸ء میں ''گلبن منظوم'' اور ''خلاصۂ فیض صفیر'' دو تالیفیں پٹنہ سے شائع کیں۔ یہ دونوں کتابیں بھی کسی طرح مل جاتیں تو معلومات میں اضافہ ہوسکتا......''

اِس خط میں ایک جملہ غور طلب ہے:۔ ''جو تعلقات اُن مرحوم کو ہم لوگوں کے ساتھ رہے ہیں اُس کا اقتضا یہ ہے...... واقعی حیف کی جا ہوگی اگر یہ تذکرہ اُن جناب کے اُن ذکروں سے خالی رہ جائے جن کا درج ہونا ضروری و لازمی ہو۔''

یہ تعلقات کیا تھے؟...... جواب یہ ہے کہ نواب خیال کے حقیقی چچا میر جعفر حسین فرہاد، اور حقیقی ماموں سیّد علی محمد شاد و سیّد امیر حسن ایجاد کو صفیر بلگرامی کی شاگردی کا (ایک زمانے میں) فخر حاصل تھا۔

خواجہ عشرت لکھنوی:

خواجہ محمد عبدالرؤف عشرت لکھنوی تذکرۂ ''آبِ بقا'' میں فرماتے ہیں:

''زبان کی خدمت کرنے والوں کے نام دنیا کے صفحات سے بہت جلد مٹ رہے ہیں۔ اِنھیں میں ایک سیّد فرزند احمد صفیر بلگرامی ہیں جن کی خدمات کو بھلا دینا بڑا ستم ہے۔ میر صاحب نے ابتدائے سن سے اردو زبان کی خدمت کی، اور بہت سی کتابیں تصنیف کر کے خود چھپوائیں اور پورب (یعنی صوبۂ بہار) میں زبان کی خدمت کا شوق پیدا کیا...... صفیر نے آرہ کا رہنا کم کیا۔ پٹنہ میں قیام کیا۔ یہاں شعر و سخن کا بہت چرچا تھا۔ اور لوگ قدردانِ سخن تھے۔ یہاں رہ کر تیس (۳۰) مثنویاں اور پانچ قصے اردو میں لکھے۔ ایک کتاب 'رشحاتِ صفیر' تذکیر و تانیث میں تالیف کی۔ ایک تذکرہ 'جلوۂ خضر' لکھا...... پٹنہ میں اُن کے بہت سے شاگرد ہوئے...... صفیر نے نثاری کی طرف رخ کیا

تو سب سے پہلے 'بوستانِ خیال' کی اٹھارہ جلدوں کو فارسی سے اردو میں لانا چاہا۔ کچھ جلدیں ترجمہ کیں۔ دو جلدیں اپنے ہاتھ سے کاپی لکھ کر اپنے مطبع میں چھپوایا۔ دوسرا دیوان 'خم خانۂ صفیر' مطبع کارنامہ لکھنؤ میں چھپا...... صفیر بہت پُرگو تھے۔ 'پیام یار' میں ان کی غزلیں برابر چھپتی رہیں...... اب کوئی صفیر جیسا زبان کی خدمت کرنے والا آرہ میں نہیں ہے جس کے دم سے شاعری کا چرچا ہے...... صفیر مرحوم اگلی وضع کے آدمی تھے۔ چوگوشیہ ٹوپی پہنتے تھے۔ دراز قد تھے۔ کسی قدر ہکلاتے تھے۔ شعر پڑھنے کا بھی انداز اچھا تھا۔ کلام عاشقانہ ہوتا تھا۔ اور بندش چست...... ایسا شخص جس کی تمام عمر اردو کی خدمت میں صرف ہوئی ہو، اُس کا اکثر کلام غیر مطبوع پڑا رہے، نہایت افسوس کی بات ہے۔ امید ہے کہ اُن کے تلامذہ توجہ کریں گے۔''

یہاں تک تو دوسروں کا بیان ہوا۔ اب خود صفیر بلگرامی کا بیان اپنے بارے میں یہ ہے:

''ہیچ مداں، ہیچ میرز، مقلدِ گزشتگان، معتقدِ فصحائے زمان، حدِّ غرور سے منزلوں دور، شاگردِ خاندان ناسخِ مغفور، فیض یابِ خدمت شیخ امان علی سحر و برق و بحر، کوچہ گردِ شہر شہر، زلہ ربائے خوانِ فیضِ غالب و دبیر، روشناسِ برنا و پیر۔ شعرا کا دوست غم خوار یار، باوجود ہیچ مدانی مشہور دیار و امصار۔ کشتۂ تیغ ستمِ تلامذہ، موردِ مراحمِ اساتذہ۔ بندۂ حقیر سیّد فرزند احمد صفیر بلگرامی مقیم قصبہ آرہ ضلع شاہ آباد''۔

اِس بیان میں مرثیے کا ایک ٹکڑا بھی ہے۔ یعنی ''کشتۂ تیغ ستمِ تلامذہ''! شاگرد اپنے استاد کو ستم کی تیغ سے کیوں ذبح کرتا ہے، اِس کو پوچھنا چاہیے افضل الدین خاقانؔی سے جس نے ابوالعلا سے بغاوت کی۔ اور شریفؔ سے جس نے لسانؔی سے بغاوت کی۔ اور بساطؔی سے جس نے کمالؔ خجند سے بغاوت کی۔ اور مومنؔ دہلوی سے جس نے شاہ نصیؔر دہلوی سے بغاوت کی اور سکندؔر شاہجہان پوری سے جس نے مومنؔ دہلوی سے بغاوت کی۔

(۱) خاقانی کو ابوالعلا نے لکھایا پڑھایا۔ بتایا سکھایا۔ جب کسی قابل ہوا تو اس کو ہاتھ پکڑ کے خاقان کبیر منوچہر شروان شاہ کے دربار میں لے گیا۔ اور خاقان کی رعایت سے خاقانی تخلص بخشا۔ اِن احسانوں کا صلہ خاقانی نے یہ دیا کہ ابوالعلا کی ہجو کہی اور کہا کہ تو ہوتا کون ہے جو ہمارا استاد بنے؟ مرا دل پیر تعلیم است و من طفلِ زباں دانش! پھر کہا کہ:

از لکدِ حادثات سخت شکستہ دلم
بست خیالم کہ ہست ایں خلل از ابوالعلا

آخر ابوالعلا کو کہنا پڑا:

خاقانیا! اگرچہ سخن نیک دانیا یک نکتہ گویمت، بشنو رایگانیا
ہجو کسے مکن کہ ز تو مہ بود بہ سن شاید ترا پدر بود و تو ندانیا

(۲) اِسی طرح شریفؔ نے اپنے استاد لسانیؔ سے بغاوت کی تو اُس کے دیوان پر اعتراض کیے اور ''سہواللسان'' نام کتاب لکھی۔ اِن اعتراضوں کا جواب حیدری شاگرد لسانی نے ''لسان الغیب'' میں دیا۔

(۳) اِسی طرح بساطیؔ شاگرد کمالؔ خجند نے شوخ چشمی کی:

غزل ہائے بساطیؔ را کمالؔ از خود مداں کمتر
کہ پروردست چوں خواجہ بآب دیدہ سلمانش

کمال خجند نے جواب دیا:

اے خواجہ تو مرد خود فروشی رخت تو دریں دکاں نگنجید

(۴) اِسی طرح حکیم مومن خاں دہلوی نے اپنے استاد شاہ نصیر دہلوی سے بغاوت کی تو شاہ نصیر نے کہا:

کمان و تیر نمط ربط تھا مجھے اُس سے
جب اُس نے آپ کو کھینچا میں گوشہ گیر ہوا

(۵) اِسی طرح سکندر خاں سکندر شاہ جہاں پوری نے اپنے استاد مومن خاں

سے بغاوت کی۔ قصہ یہ تھا کہ سکندر اپنی غزل اصلاح کے لیے لایا۔ اِس غزل میں ایک شعر تھا:

دم لینے میں ہے مجھ کو تو آئینے کا لحاظ
اور یار یہ سمجھتے ہیں، مجھ میں ہے دم نہیں

مومن نے کہا یہ شعر بے معنی ہے۔ قابلِ اصلاح نہیں۔ سکندر نے کہا کہ آئینہ میلا ہوجانے کا خوف تھا، اِس لحاظ سے ہم نے دم سادھ لیا، دیکھنے والوں نے سمجھا کہ اِس میں دم ہی نہیں۔ مومن نے کہا کہ آئینے کا لایا جانا خود بتا رہا ہے کہ اِس وقت عالم کیا ہے۔ پھر دم سادھنا؟ سکندؔر کو آئینے پر ناز تھا، حجت کرنے لگا۔ بات بڑھی۔ آخر سکندر نے مومن سے کہا کہ آپ کو استاد کس نے بنایا؟ اصلاح کو پوچھیے تو بات اتنی ہے کہ ہم آپ کا کلام دیکھتے تھے۔ آپ ہمارا کلام دیکھتے تھے۔ اِس میں استادی اور شاگردی کیسی؟

علامہ تفتازانی اپنے شاگردوں سے اِس قدر نالاں تھے کہ پاؤں میں ایک مرتبہ کانٹا گڑ گیا تو علامہ نے آب دیدہ ہو کر پوچھا...... ''اے کانٹے! سچ سچ بتا۔ کیا تو نے بھی ہم سے کچھ سیکھا تھا؟'' پھر حضرت صفیر بلگرامی نے اپنے کو کشتۂ تیغِ ستمِ تلامذہ کہا تو کون سی انوکھی بات کہی؟ بقول مؤلف ''آبِ حیات'':

''شعرا میں اپنے لیے خود پسندی اور دوسرے کے لیے ناتواں بنی ایک ایسی عادت ہے کہ اگر اُسے قدرتی عیب کہیں تو کچھ مبالغہ نہیں۔ بلکہ شاگردوں کو استادوں سے دست و گریباں ہوتے دیکھا تو اکثر اِسی فن (شاعری) میں''

اِس اجمال کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۲۵۵ھ۔ جناب شاہ الفت حسین صاحب فریاؔد عظیم آبادی پٹنہ سے مرشد آباد گئے۔ قیام تین سال۔

۱۲۵۸ھ۔ جناب فرہاؔد مرشد آباد سے کلکتہ گئے۔ قیام بیس سال۔

۱۲۶۲ھ۔ ولادت میر علی محمد شاد عظیم آبادی۔ اِسی سال صفیر بلگرامی نے شاعری شروع کی۔

۱۲۷۶ھ۔ حضرت فریآد صرف چار ماہ کے لیے کلکتہ سے پٹنہ آئے۔ پھر کلکتہ واپس گئے۔ قیام تین سال۔

"حیات فریاد"، صفحہ ۱۱۶۔۱۱۷ میں جناب شاد فرماتے ہیں:

> "اڑتیس سال اپنی عمر گراں بہا کے حضرت (فریاد) نے مرشدآباد کلکتہ میں بسر کیے۔ منجملہ جس کے پینتیس سال کلکتہ میں صرف ہوئے۔ اِس طویل مدت میں حضرت تین دفعہ عظیم آباد آئے۔ تیسری دفعہ تو اخیر دفعہ تھی۔ اور اِس کے قبل دو دفعہ تشریف لائے۔ ایک دفعہ تو ۱۸۵۵ء میں غدر کے دو سال قبل جب کہ راقم کی عمر چودہ پندرہ سال کی تھی۔ اور چار ماہ صرف عظیم آباد میں قیام فرمایا۔ راقم اُس زمانے میں شرح سلم پڑھتا تھا۔ ایک روز ناظر وزیر علی عبرتی مرحوم کے ہاں سے مشاعرے کی طرح: جب سے اُس ابرو نے پیدا تیغ عالم گیر کی" آئی۔ اُس وقت تک راقم نے کبھی ایک شعر غزل کا نہیں کہا تھا...... حضرت (فریاد) نے والد سے ارشاد فرمایا کہ طرح میں چند شعر اِس لڑکے کو کہنے دو...... (میں نے) گیارہ شعر کہہ کر حاضر کیے...... یہی بنیاد راقم کی شاعری اور حضرت (فریاد) کے زمرۂ تلامذہ میں داخل ہونے کی شرف یابی کی ہے"۔

تاریخ لکھنے میں جناب شاد سے سہو ہوا ہے، کیوں کہ ۱۸۵۵ء میں اُن کی عمر دس سال کی تھی نہ کہ چودہ پندرہ سال کی۔ اور شاعری انھوں نے نہ تو دس سال کی عمر میں شروع کی نہ چودہ پندرہ سال کی عمر میں۔ جناب شاد کے دست و قلم کی تحریر مورخہ اپریل ۱۹۲۶ء ہمارے پاس موجود ہے جس میں وہ تحریر فرماتے ہیں: "سترہ اٹھارہ برس

کی عمر میں شاعری وتصنیف کا شوق ہوا''۔ اِس تحریر کے آٹھ ماہ بعد شاعری کی شمع خموش ہوگئی۔ الغرض حضرت فریاد کلکتہ سے چار ماہ کے لیے جب پٹنہ آئے تھے، اُس وقت تک جناب شاد نے شاعری شروع نہیں کی تھی۔

۱۲۷۹ھ۔ حضرت فریاد دوسری دفعہ کلکتہ سے پٹنہ آئے۔ اِس سال جناب شاد نے شاعری شروع کی۔ اور اٹھارویں برس پہلی غزل کہی۔

۱۲۸۰ھ۔ صفیر بلگرامی کا پہلا دیوان ۱۲۷۳ھ میں مرتب ہوا تھا۔ سالِ ترتیب: جمع شد مایۂ حیات صفیر۔ اُس وقت جناب شاد کو بارھواں سال تھا۔ اِس کے سات برس بعد ۱۲۸۰ھ میں دیوانِ صفیرِ بلبل پٹنہ سے شائع ہوا تو جناب شاد کو انیسواں سال تھا اور انھوں نے تاریخِ طبع دیوان کہی:

چو ایں دیوان رنگیں طبع گردید
پُر از معنی و الفاظِ خوش اسلوب
بجستم سالِ طبعش شادؔ از طبع
شدہ ''شیریں سخن'' تاریخِ مرغوب

۱۲۸۱ھ۔ حضرت فریاد عظیم آباد سے کلکتہ گئے۔ وہاں قیام گیارہ سال رہا۔

اِسی سال جناب شاد اپنی غزل لے کر شاہ حفاظت حسین صاحب مطیرؔ رئیس حاجی گنج کے ساتھ میر حامد حسین نکہت عظیم آبادی کے مکان پر صفیر بلگرامی کی خدمت میں شاگردی کے لیے حاضر ہوئے۔ اور اُن کی درخواست قبول کی گئی۔

۱۲۸۱ھ سے ۱۲۸۷ھ۔ مسلسل سات برس تک جناب شاد نے صفیر بلگرامی سے اصلاح لی۔

۱۲۸۷ھ۔ صفیر بلگرامی عظیم آباد سے مظفر پور تشریف لے گئے۔ وہاں قیام تین سال رہا۔

۱۲۸۸ھ۔ صفیر بلگرامی کو استادی راس نہیں آئی۔ جناب شاد نے شاگردی سے انحراف کیا اور اِس انحراف کے بعد حضرت فریاد سے ملنے کے لیے کلکتے گئے۔ کلکتے میں صرف دو ماہ قیام رہا۔

۱۲۹۰ھ۔ صفیر بلگرامی مظفر پور سے عظیم آباد واپس آئے۔ آئے تو کیا دیکھا؟

اِس کا حال خود صفیر بلگرامی کے قلم سے سنیے:

''......غرض ۱۲۸۷ ہجری تک جناب شاد کو مجھ سے برابر تلمذ رہا...... آخر میں طبیعت اُن کی منحرف ہوئی۔ اور میری شان میں کچھ فرمانے لگے۔ اگرچہ واقف کاروں کی روک ٹوک سے کبھی کبھی خاموشی بھی اختیار کرتے تھے۔ مگر ناواقفوں میں اپنی تعلّی کی لیتے تھے۔ میں تین برس کے بعد مظفرپور سے آیا۔ جناب شاد کا رنگ ہی اور پایا۔ مگر میرے سامنے کچھ نہیں کہتے تھے۔ میں نے بھی کچھ نہ چھیڑا۔ آخر کشمیری کوٹھی میں اُنھیں کی فرمایش سے مشاعرہ شروع ہوا۔ یہ پہلی دفعہ ہے کہ اُنھوں نے مشاعرے کی غزل میرے ہوتے بے اصلاح پڑھی۔ خدا کے کارخانے! غیر طرح میں جناب بحرؔ لکھنوی کے دو چار شعر پڑھ گئے۔ شعرا نے گرفت کی۔ اور یہ غلغلہ تمام پٹنہ میں پھیلا۔ دوسرے مشاعرے میں اِسی زمین میں ایک غزل کہہ کرلائے۔ اِس پر بھی اعتراض ہوئے۔ مومنؔ خاں کی رباعیاں، سحرؔ کے قصیدے کے اشعار پکڑے گئے۔ آخر مشاعرے کا آنا چھوڑ دیا۔''

''دو چار مشاعروں کے بعد ایک دن مشاعرے کے وقت میرے پاس آئے۔ میں ہمراہ جناب نکہت کھانا کھاتا تھا۔ مجھ سے فرمایا کہ آج صبح سے لوگ مجھے دق کرتے ہیں کہ تم نے صفیر سے اصلاح لینے سے انکار کیا، اور میں کہتا ہوں کہ میں انکار کب کرتا ہوں، اِس لیے آپ کے پاس بھی آیا ہوں کہ مجھے انکار نہیں ہے، میں بے شک آپ کا شاگرد ہوں۔ میں نے کہا: میر علی محمد صاحب! میں بھی سنتا تھا مگر جب آپ کہتے ہیں تو خیر میرا شک نکل گیا۔ بولے اگر فرمائیے تو میں اِس مضمون کی رباعی کہہ کر مشاعرہ میں پڑھ دوں۔ میں نے کہا اس کی ضرورت کیا ہے۔ غرض یہی باتیں کر کے چلے گئے۔ اِس کی شہادت جناب نکہت نے اپنے دستخط میں دی ہے اور میں نے بھی اِس کی یاد جناب شاد کو 'نمیقۂ محبت وثیقہ' میں دلائی ہے۔ غرض یہ کہ جناب شاد مشاعرے میں نہ گئے''۔

''اب اُنھوں نے مشاعرے میں آنا چھوڑا۔ مگر میں اُسی طرح اکثر ملاقات کو

جایا کرتا۔ وہ اپنی غزلیں پڑھتے تھے۔ سن لیتا تھا۔ کبھی کبھی بول بھی دیتا تھا۔ طبیعت تیز تھی۔ اچھا کہنے لگے۔ ۱۲۹۱ھ میں اُنھوں نے مثنوی 'نالۂ شاد' تصنیف فرمائی۔ اُس پر شعرائے عظیم آباد نے اعتراض کیے۔ مگر جناب شاد کو مجھ پر گمان ہوا۔ ایک دن مجھے چھیڑ کر پوچھا۔ میں نے انکار کیا اور کہا بھلا میر علی محمد صاحب! میں آپ پر اعتراض کروں گا؟ یہ البتہ کہتا ہوں کہ جناب شاد میرے شاگرد ہیں۔ یہ سن کر بولے اب میرا دل صاف ہوا، لوگوں نے مجھے ناحق بدظن کیا تھا۔ غرض پھر وہ باتیں رفع ہوئیں''۔

۱۲۹۱ھ۔ ''اور اب جناب شاہ الفت حسین صاحب فریاد بھی کلکتے سے پٹنہ تشریف لائے۔ پھر جناب شاد کو وہی سوجھی۔ اور اب برملا کہتے پھرے۔ مشاعرے میں تو خود نہیں آتے تھے مگر چند شاگرد درست کیے۔ اور میرے پڑھنے میں خلل ڈالنا شروع کیا۔ آخر میں آدمی ہوں۔ یہ ادا ناپسند ہوئی۔ البتہ اشعار مشتمل برنصائح میں نے پڑھے اور محمد ہاشم (عزیز و شاگرد صفیر بلگرامی و مہتمم مطبع نورالانوار، آرہ) سے کہا کہ ایک مجموعہ اسنادِ شاگردان کا درست کریں اور اُس کا نام 'نشان فیض' رکھا۔ اِس میں جمیع شاگردوں کے اسنادِ دستخطی اور کلامِ اصلاحی موجود ہیں۔ اور واقف کارانِ شاگردی جناب شاد کے سامنے پیش کیا کہ حقاً اور ایماناً جو کچھ جانتے ہوں لکھ دیں۔ چنانچہ بیک جلسہ چودہ حضرات نے دستخط بلا اکراہ، بے تامل، بدون میری لجاجت اور سماجت کے اپنے دستِ مبارک سے فرمائے اور جو کچھ جانتے تھے تحریر کیا''۔

''یہ خبر جناب شاد کو پہنچی۔ اکثر اہلِ دستخط کے پاس جا کر فرمایا کہ میں آپ لوگوں کا ہم وطن ہوں، آپ نے دستخط کیوں کیے؟ اُنھوں نے فرمایا کہ ایمان کے باب میں کسی کا پاس نہیں کیا جاتا۔ جو ہم جانتے تھے لکھ دیا۔ جب اُنھوں نے دیکھا کہ اب تو دستخط ہوگئے، پھر کشمیری کوٹھی میں آ کر جناب نکہت کے سامنے میری شاگردی کا اقرار کیا جس کو جناب نکہت نے اپنے دستخط میں تحریر کیا ہے''۔

۱۲۹۳ھ (۱)۔ ''العبد سیّد حامد حسین نکہت۔ باللہ العظیم کہ میر علی محمد صاحب شاد روبروئے من اصلاح چند از میر صفیر صاحب گرفتہ ماند۔ انکار ازاں انحراف از ایمان

است۔ و اقرار زبانی، بعد انکار ہم، دو دفعہ در غریب خانہ کردہ اند۔ یک بار کہ ہمراہ شاہ حفاظت حسین صاحب وقت شب در مشاعرہ کشمیری کوٹھی تشریف آوردہ بودند۔ د بار دگر وقتے کہ میر فرزند احمد صاحب صفیر ایں اسناد استادیِ خود دریں شہر شایع کردند، خود نزد حقیر آمدہ گفتند کہ ایں چنیں اصلاح از ناظر عبرتی مرحوم نیز گرفتہ ام۔ پس ازیں چہ حاصل کردم؟ مگر می دانم کہ اصلاح دادن صفیر سلمہٗ اللہ القدیر مثل اصلاحِ ناظر صاحب مرحوم نیست کہ از خطوط کہ نوشتۂ شان است ظاہر است۔ فقط بقلم خاص نکہت''۔

(۲) ''ہمارے علم میں میر علی محمد صاحب شاد شاگرد میر فرزند احمد صاحب کے ہیں۔ آغا مرزا عفی عنہٗ''۔

(۳) ''العبد علی مرزا عفی عنہ۔ ہم نے اپنی آنکھوں سے دو بار اصلاح لیتے دیکھا ہے۔ اور یہ بھی یقینی کہہ سکتے ہیں کہ اکثر ہا اصلاح لی ہے بقلم خاص۔ اور بھی واضح ہو کہ چند رقعات اور غزلیں اور مرثیہ جو دستخط خاص جناب میر علی محمد صاحب شاد سے ہیں، ہم بقسم کہہ سکتے ہیں کہ یہ سب اُن کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے اور اصلاح بھی جناب میر فرزند احمد صاحب صفیر کے ہاتھ کی ہے۔ فقط''۔

''اور یہ بھی یاد بہت اچھی طرح ہے کہ جس وقت یہ مرثیہ جو اُس کتاب میں موجود ہے، جناب میر علی صاحب، ہمراہ جناب میر فرزند احمد صاحب کے واسطے اصلاح پاس جناب مرزا دبیر صاحب مرحوم کے لے گئے تھے۔ ہم بھی حضور میں جناب مرزا دبیر صاحب کے حاضر تھے۔ فقط''۔

(۴) ''ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ سیّد علی محمد صاحب شاد نے ہمارے مکان میں بروز مشاعرہ اکثر اصلاح لی ہے اور ہم کو اُس وقت شوق غزل گوئی کا نہیں تھا۔ فقط محمد عسکری خاں عرف حسن نواب صاحب عفی عنہٗ''۔

''اور جس وقت اُس مرثیے کو جناب مرزا دبیر صاحب کے حضور میں واسطے اصلاح کے سیّد علی محمد صاحب کو ساتھ میر فرزند احمد صاحب لے گئے تھے، ہم بھی موجود تھے۔ بلکہ میر بادشاہ علی صاحب بقاؔ نے ہم سے پوچھا کہ یہ مرثیہ میر علی محمد صاحب نے

کہا ہے یا میر فرزند احمد نے کہہ دیا ہے؟ ہم نے جواب دیا کہ نہیں میر علی محمد صاحب نے کہا۔ مگر شاید میر فرزند احمد صاحب نے دیکھا ہو تو عجب نہیں۔ فقط"۔

(۵) "فی الحقیقت ہم واقف ہیں۔ اکثر غزل دکھاتے ہوئے بچشم خود دیکھا۔ بلکہ اصلاح، اور غیر اصلاح، قبل اصلاح، اکثر غزلیں میر علی محمد صاحب کی دیکھنے میں آئیں۔ اور اکثر رقعہ بنام میر فرزند احمد صاحب صفیرؔ تحریر میر علی محمد صاحب دیکھے۔ اور ہم حرف بھی پہچانتے ہیں۔ چنانچہ مرثیے کی تمام و کمال کیفیت سے ہم خوب واقف ہیں۔ بقلم خاص سیّد محمد حسن عرف منجھلے صاحب...... فطنتؔ"۔

واضح ہو کہ نواب سیّد محمد حسن خاں فطنتؔ اور نواب سیّد محمد حسین خاں ہجرتؔ دونوں ناظر وزیر علی عبرتؔ کے شاگرد تھے۔ ہجرتی وہی ہیں جن کے ہاں 'امتحان موج' کا معرکہ ہوا تھا۔ اور فطنتؔ وہ ہیں جن کے صاحب زادے نواب سیّد محمد رضا خاں عرف بنا صاحب موجؔ عظیم آبادی جناب شادؔ کے شاگرد تھے۔

(۶) "ہم نے اپنی آنکھوں سے اصلاح دیتے بھی دیکھا۔ اور خوب واقف ہیں۔ اور جلسۂ مشاعرہ میں بھی غزل دکھاتے ہوئے میر علی محمد صاحب شادؔ میر فرزند احمد صفیرؔ سے اپنی آنکھوں سے خاص مشاعرے میں دیکھا ہے۔ اکثر سیّد محمد حسین خاں عرف چھوٹے صاحب متخلص بہ ہجرتی۔ اور اُن کے رقعے وغیرہ بھی لکھے اور مرثیہ وغیرہ بھی اصلاح دیا ہوا دیکھا ہے۔ بقلم خاص سیّد محمد حسین خاں رضوی عرف چھوٹے صاحب متخلص بہ ہجرتی"۔

(۷) "میر علی محمد صاحب اور ہم ایک ہی ہفتے میں جناب استادی میر فرزند احمد صاحب قبلہ و کعبہ کے شاگرد ہوئے۔ اور اکثر ہم اور وہ ساتھ اصلاح لیا کیے۔ پانچ سات برس برابر یہی کیفیت رہی۔ سیّد تجمل حسین خاں عرف سیّد سلطان میرزا۔ بقلم خاص"۔

(۸) میں نے اپنی آنکھوں سے اصلاح دیتے حاجی گنج کے مشاعرے میں دیکھا ہے۔ اور خطوط بھی اُن کے لکھے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔ بقلم خاص

سیّد علی اصغر عفی عنہ۔ عرف سیّد وزیر نواب صاحب عفی عنہ''۔

واضح ہو کہ انھیں سیّد وزیر نواب کے صاحب زادے سیّد مرتضٰی نواب مفتوںؔ عظیم آبادی جناب شاؔد کے شاگرد تھے۔

(۹) ''ہم نے اپنی آنکھوں سے اصلاح دیتے دیکھا ہے اور رقعہ بھی اُن کا دیکھا ہے کہ اُس میں لفظ 'استادی' لکھتے ہیں اور لفظ 'تلمیذ حلقہ بگوش علی محمد' بھی لکھتے ہیں۔ سیّد مظفر حسین خاں عرف سیّد نصیر نواب عفی عنہ''۔

(۱۰) ''ہم خوب جانتے ہیں کہ ابتدائے مشاعرات کشمیری کوٹھی ۱۲۸۱ء ہجری تا مشاعرہ حاجی گنج بمکان میر علی محمد صاحب شاؔد کہ جس میں مولوی وحید صاحب الٰہ آبادی بھی شریک تھے، اُس وقت میر علی محمد صاحب میر فرزند احمد صاحب سے اصلاح لیتے تھے۔ اور شاگردی میر فرزند احمد صاحب کی اپنا فخر جانتے تھے۔ جب میر فرزند احمد صاحب مظفر پور تشریف لے گئے اور تین برس تک وہاں بذریعہ چھاپاخانہ کتب کے وہیں تشریف فرما رہے، اُسی عرصے میں میر علی محمد صاحب نے ان کی شاگردی سے انکار کیا۔ العبد سیّد عبدالحکیم''۔

واضح ہو کہ یہ وہی عبدالحکیم تمکین قنوجی ہیں جو معرکہ شاد و احسن کے زمانے میں سیّد محبوب شیر کے ہاں جاسوس بنا کر بھیجے گئے تھے۔

(۱۱) ''العبد یوسف حسین ماہؔر لکھنوی۔ خوب می دانم کہ جناب میر علی محمد صاحب شاد شاگرد میر صفیر صاحب ہستند، چنانچہ در ۱۲۸۲ ہجری کہ فقیر شریکِ صحبت مشاعرۂ جناب میر حامد حسین صاحب نکہت شد موی الیہ را اقرار شاگردیِ جناب میر موصوف کماینبغی بود۔ تا زمانہ ۱۲۸۴ ہجری کہ با میر عطا حسین صاحب و میر علی حسن صاحب نزاعِ کلی رو داد۔ فقط''۔

واضح ہو کہ مرزا یوسف حسین ماہر لکھنوی کے تین صاحب زادے مرزا الیاس حسین، مرزا ممتاز حسین نہر اور مرزا محدث حسین۔ بڑے نے انتقال کیا۔ دوسرے اور تیسرے بقید حیات ہیں۔

حضرت صفیر بلگرامی فرماتے ہیں: ''جناب شاؔد نے دیکھا کہ اب تو میری شاگردی ثابت ہوئی تو ۱۲۹۳ھ میں اور لوگوں کو ابھارا......'' یہ اشارہ خواجہ فخرالدین حسین سخن دہلوی کی طرف ہے۔ وہی خواجہ سخن جو آرہ میں ۱۲۷۵ھ میں صفیر بلگرامی کے شاگرد ہوئے تھے۔ اور جن کی تصنیف 'سروش سخن' استاد نے بعد اصلاح حضرت غالب کی خدمت میں بھیجی تھی۔

خواجہ سخن کی دوسری شادی عظیم آباد میں میر نجف علی وکیل کی صاحب زادی سے ہوئی۔ میر نجف علی کے چھوٹے بھائی میر سیّد علی، حضرت فریاد عظیم آبادی کے داماد تھے۔ اور خود میر نجف علی حضرت فریاد کے شاگرد تھے اور جناب شاد و حضرت فریاد میں صرف شاگردی و استادی کا رشتہ نہیں تھا بلکہ عزیز داری بھی تھی۔ چنانچہ جناب شاد کی دادی حضرت فریاد سے پردہ نہیں کرتی تھیں اور حضرت فریاد اُن کو باجی صاحبہ کہتے تھے۔ اِن تعلقات کی وجہ سے شاد و سخن میں یک جہتی تھی۔

نتیجہ یہ ہوا کہ جناب سخن نے جناب شاد کا ساتھ دیا...... اور اِس طرح ساتھ دیا کہ خود بھی شاگردی سے انکار کیا۔ بقول صفیر بلگرامی:

گھر کیا دل میں جو اُن کے تیر نے
وہ لگے میرا کلیجا چیرنے!

۱۲۹۵ھ جناب شاد کی تردید میں نواب سیّد تجمل حسین خاں سلطان عظیم آبادی نے ''مرقع فیض'' یعنی تذکرۂ شاگردانِ صفیر بلگرامی لکھا۔ اُس سے شاؔد و سخؔن کی شاگردی ثابت ہوئی تھی۔ جناب سخن نے ''تنبیہ صفیر بلگرامی'' لکھی اور ایک فرضی شخص سردار مرزا کے نام سے شائع کی۔ یہ کتاب عین ۱۰ ذی الحجہ کو مطبع محمدی پٹنہ سے نکلی اور نمازیوں میں تقسیم ہوئی۔ الغرض عید قربان اِسی طرح منائی گئی۔

یہ کتاب کسی طرح بھی جناب خواجہ فخر الدین سخن کے شایان شان نہ تھی۔ تفصیل اِس کی مناسب نہیں۔ کیوں کہ:

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ، انھیں کچھ نہ کہو!

مگر اِس انحراف و ہجوگوئی سے جناب شاد وسخن کو کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ یہ کتاب عظیم آباد سے لکھنؤ پہنچی تو لکھنؤ سے جناب شوق نیموی نے صفیر بلگرامی کو لکھا:

"تنبیہہ وغیرہ جو آپ کے مخالفین نے لکھی ہے، اُس کا کچھ جواب آپ نے تحریر کیا یا ازراہِ حلم وتحمل سکوت فرمایا۔ اِس سے ضرور اطلاع دیجیے گا......"

ایک کشتۂ تیغِ ستمِ تلامذہ کے دل سے دھواں کس طرح اٹھتا ہے اور قلم سے خون کس طرح ٹپکتا ہے، یہ دیکھنا ہو تو مکتوب صفیر بلگرامی بنام شاد عظیم آبادی دیکھیے:

"عزیزِ سابق و شفیقِ حال جناب میر علی محمد صاحب شاد سلمۂ اللہ تعالیٰ۔

از صفیر عفی اللہ القدیر بعد سلام مسنون واضح باد۔ نامۂ لیاقت آما...... ورود نمود و تعجب بر تعجب افزود:

می شنیدم کہ جان جانانی

چوں بدیدم ہزار چندانی

تا ایں دم کہ انکارِ شاگردیِ من از جانب آں صاحب، کہ اصغا شد، زبانِ دگراں بود، حالاکہ خود بنوکِ قلم آوردند چہ گفتہ آید؟ مگر زمانہ تعلیم یادکنم، و ہم خطوطِ آں ہنگام ڈاکی و غیر ڈاکی با ایں، دو خطوط کہ حالیا بمن رسیدہ اند پیشِ خودنہم و خون گریم، بر بربادیِ محنت و مشقتِ خود، و سیلیِ زنم بر سروصورت خود۔

دارم آرے ز ہرزہ لائیِ خویش	نوحہ بر خویش و بے نوائیِ خویش
گردش روزگار خویشتنم	حیرتِ کاروبار خویشتنم
با من ایں خشم و کیں دریغ دریغ!	من چناں تا چنیں دریغ دریغ!
ور بگویند ماجرائے رفت	از تو در گفتگو خطائے رفت
مہربانا خدائے را انصاف!	تا نخست از کہ بود رسم خلاف؟
نمک اندر سبوئے مے کہ فگند؟	بچمن رستخیز وے کہ فگند؟
زلف گفتار را کہ درہم کرد؟	بزم اشعار را کہ برہم کرد؟

مطلب یہ کہ اب تک ہم دوسروں سے سنا کرتے تھے کہ آپ کو شاگردی سے انکار ہے۔ آپ کی تحریر نے آج یہ پردہ بھی اٹھا دیا۔ کل کی بات ہے کہ آپ ہم سے تعلیم پاتے تھے۔ ایک طرف ہمارے سامنے آپ کے شاگردانہ خطوط ہیں۔ اور دوسری طرف حال کے وہ خطوط ہیں جن میں شاگردی سے انکار ہے۔ اب آنکھ خون نہ برسائے تو کیا کرے۔ اور ہاتھ ماتم نہ کرے تو کیا کرے؟ اللہ رے انقلاب زمانہ! آپ اپنے کو دیکھیے ہم کو دیکھیے اور یہ کینہ پروری دیکھیے۔ دریغ! دریغ!

یہ خط بہت بڑا ہے۔ اس کے چند ٹکڑے یہ ہیں:

''درمیان من و خود خدائے حق پسند را حاضر دانستہ و ایمان را ذریعۂ نجات شمردہ، دریک یک حالت سابق نیک نگرند کہ وقتے کہ در ۱۲۸۱ ہجری مشاعرہ در کشمیری کوٹھی از طرف میرن صاحب می شد، آں صاحب ہمراہ شاہ حفاظت حسین صاحب غزلِ خود مخصوص نزد من برائے اصلاح نیاوردند؟ و بندہ بآں صاحب اصرار نکرد کہ آں صاحب شاہ الفت حسین صاحب را چرا گزاشتند؟ جوابش شنیدم کہ شاہ صاحب رہگرائے کلکتہ می شوند۔ باز نہ گفتم دریں پٹنہ دگراں ہستند۔ تخصیصِ من چیست؟ جواب دادند اعتقادِ من درباب تو از ہمہ بیشتر است۔ باز نہ گفتم کہ اگر چنین است بسم اللہ! مگر یاد دارند کہ اگر احیاناً بعد ازیں کسے از من فاضل تر از لکھنو یا دہلی بیاید، از من نخواہند برگشت۔ جواب نقص و عیب کلام شما ذمہ من است۔ من جواب خواہم داد۔ آں صاحب اقرار کردند۔ و ہماں وقت بر غزل: 'ملال ہے' وصال ہے، کہ در شگوفۂ نکہت مندرج است اصلاح دادم''۔

''و از آں روز آمدورفتِ روزانہ بخانۂ آں صاحب و از پاۓ از روز باقی و تا دہ ساعت شب، یا بیش و کم ازاں نزد آں صاحب ماندن برخود متحتم کردم۔ و از طرف آں صاحب روزانہ سواری برائے رفتنِ من تا کشمیری کوٹھی می یافتم...... بامن ایں سلوک مسلوک بود تا دو سہ سال برابر۔ چوں بفضلِ خدا تعلیم یافتند، بندہ ہم آمدورفتِ ہر روزہ کم کرد۔ و بعد دو چار روز جاری نمود''۔

''افسوس کہ والد ماجد و عمِ نامدار آں صاحب رخت بجناں کشیدند۔ خدا شاں

را در جوارِ خود جا دادہ باشد۔ اگر می بودند ہرگز از شہادت انکار نمی کردند۔ و ایں وقت ہم می دانم کہ جناب میر جعفر حسین صاحب و جناب میر امیر حسن صاحب و جناب شاہ حفاظت حسین صاحب و دیگر صاحبان حاجی گنج کہ در آں وقت بر کاشانۂ آں صاحب با جناب محسن صاحب مرحوم صحبت گرم می داشتند زنہار دروغ نخواہند گفت، چناں کہ صاحبانِ کشمیری کوٹھی و گذری وغیرہ از شہادت دادن وبدستِ خود نوشتن پہلوتہی نکردند......''

''حالا ایں قصہ بطول انجامید۔ می خواہم کہ فیصلۂ ما و آں صاحب برہمیں شود کہ قرآن پیش نہادہ روبروئے عماید انصاف کیش و جناب شاہ الفت حسین صاحب فریاد آں خطوط را ملاحظہ فرمایند وقسمیہ گویند کہ از من نیست۔ من قبول بدارم و ازاں وقت باز دعویِ استادی نکینم''۔

''حالا نامہ را بر دعا خاتم می کنم و از دل می گویم کہ خداوند حق را بر زبان جاری کن''۔

ترجمہ: آپ کو واسطہ ہے اُس خدا کا جو حاضر و ناظر ہے۔ اور اُس ایمان کا جو ذریعۂ نجات ہے کہ سابق کی کل باتوں کو اچھی طرح یاد کیجیے۔ ۱۲۸۱ ہجری میں جب کشمیری کوٹھی میں میرن صاحب کی طرف سے مشاعرے شروع ہوئے تو کیا آپ شاہ حفاظت حسین صاحب کے ساتھ مخصوص ہمارے پاس اپنی غزل اصلاح کے لیے نہیں لائے تھے؟ اور کیا ہم نے بہ تکرار آپ سے یہ نہیں پوچھا تھا کہ آپ تو شاہ الفت حسین صاحب کے شاگرد ہیں، پھر اُن کو کیوں چھوڑ دیا؟ آپ نے جواب دیا کہ شاہ صاحب کلکتہ جارہے ہیں۔ تب کیا ہم نے آپ سے نہیں کہا تھا کہ پٹنہ میں اور لوگ بھی موجود ہیں۔ یہ ہماری ہی تخصیص کیوں ہے؟ آپ نے جواب دیا کہ یہ تو اپنی اپنی پسند ہے۔ آپ سے بڑھ کر کسی کو نہیں سمجھتے۔ تب ہم نے کیا نہیں کہا تھا کہ اگر ایسا ہے تو بسم اللہ، مگر یہ یاد رکھیے کہ لکھنؤ یا دلّی سے اگر کل کوئی شخص ہم سے فاضل تر آگیا تو آپ کو ہم سے انحراف نہیں کرنا ہوگا۔ باقی رہا آپ کے کلام کا نقص، تو یہ بوجھ ہماری گردن پر رہا، ہم اِس کا جواب دے لیں گے۔ آپ نے یہ شرط قبول کی، اور تب ہم

نے اُسی وقت آپ کی غزل پر اصلاح دی۔ یہ غزل: 'ملال ہے' وصال ہے، شگوفۂ نکہت میں موجود ہے......

اور اُس روز سے ہمارا معمول ہوا کہ روزانہ سہ پہر کو آپ کے گھر جایا کرتے۔ اور تقریباً دس بجے شب تک ٹھہرا کرتے۔ اور پھر آپ ہی کی سواری پر کشمیری کوٹھی واپس آیا کرتے...... دو تین برس تک یہی معمول تھا۔ جب خدا کے فضل سے آپ تعلیم پا گئے تو ہم نے بھی اپنا جانا کم کر دیا۔ اور اب دو چار روز پر جانے لگے۔

افسوس اِس کا ہے کہ آپ کے والدِ ماجد اور عمِ نامدار جنت کو سدھارے۔ خدا اُن لوگوں کو اپنے جوار میں جگہ دے۔ آج وہ لوگ زندہ ہوتے تو ضرور ہماری تصدیق کرتے۔ اور یقین ہے کہ میر جعفر حسین اور میر امیر حسن اور شاہ حفاظت حسین اور حاجی گنج کے اور لوگوں سے جو آپ کے گھر میں محسن صاحب مرحوم سے ملنے آتے تھے، پوچھا جائے تو وہ لوگ ہرگز جھوٹ نہیں بولیں گے جس طرح صاحبانِ گذری و کشمیری کوٹھی نے اپنے دست و قلم سے تحریری شہادت دینے سے دریغ نہ فرمایا (واضح ہو کہ سیّد امیر حسن ایجاد جناب شاد کے چھوٹے بھائی اور میر جعفر حسین اُن کے چچیرے بھائی تھے)۔

یہ قصہ بہت طول ہو گیا ہے۔ اب تصفیہ یوں ہی ہو سکتا ہے کہ قرآن سامنے رکھا جائے اور خود جناب شاہ الفت حسین صاحب فریاد اور دیگر عمائدینِ معتبر کے سامنے آپ حلف لیں کہ یہ خطوط آپ کے لکھے ہوئے نہیں ہیں۔ اگر آپ نے قسم کھالی تو ہم فوراً مان لیں گے اور پھر کبھی یہ دعویٰ نہیں کریں گے کہ آپ ہمارے شاگرد ہیں (واضح ہو کہ اِن خطوط سے مراد وہ خطوط ہیں جو شاگردی کے زمانے میں جناب شاد نے صفیر بلگرامی کو بھیجے تھے۔ اور جن میں 'استاذی' اور 'تلمیذ حلقہ بگوش علی محمد' تحریر فرمایا تھا۔)

اب اِس خط کو ہم ختم کرتے ہیں اور دل سے دعا مانگتے ہیں کہ خدایا! تو شاد کی زبان پر حق کو جاری فرما۔

۱۲۹۶ھ۔ جناب شاد نے اِس خط کا یہ جواب دیا کہ ''اغلاطِ صفیر'' نام ایک

رسالہ ترتیب دیا۔ اِس رسالے کی حقیقت یہ ہے کہ اُس زمانے میں مولوی عبدالغفور خاں نساخ نے میر انیس و مرزا دبیر کے کلام پر اعتراض کر کے ''انتخابِ نقص'' نام ایک رسالہ شائع کیا تھا۔ نساخ کی اِس جرأت پر اساتذہ برہم تھے اور ہندوستان میں آگ لگی ہوئی تھی۔ اِس آگ سے جناب شاد نے فائدہ یہ اٹھایا کہ شعرائے لکھنؤ و کلکتہ و رام پور کو لکھ بھیجا کہ نساخ پر اعتراض کیے جائیں تو آپ لوگ دستخط کریں گے؟ وہاں سے جواب آیا کہ ضرور۔ اندھا چاہے دو آنکھیں! جب یہ طے پا گیا تو جناب شاد نے عظیم آباد سے کھچڑی پکا کر بھیجی۔ یعنی دس بیس شعر نساخ کے باقی صفیر بلگرامی کے، نتیجہ یہ ہوا کہ نساخ کے دھوکے میں صفیر بلگرامی کی گردن ماری گئی۔ یہی مجموعۂ اغلاط صفیر جناب شاد نے اپنے شاگرد سیّد رحیم جان رحیم عظیم آبادی کی طرف سے شائع کیا۔

اِدھر یہ ہو رہا تھا اور اُدھر شاہ حفاظت حسین صاحب مطیر عظیم آبادی چشم دید گواہوں سے دستخط لے رہے تھے کہ شاد شاگرد صفیر بلگرامی ہیں۔ چند گواہوں کے نام یہ ہیں: محمد وجیہہ الحق، امیر الحسن عرف الفت حسین دانا پوری، الیاس حسین، امداد حسین، شیخ فرزند علی، شیخ نقی جان، سیّد الطاف حسین، سیّد شفاعت حسین، ساکنان حاجی گنج... اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جناب شاد و جناب مطیر میں بول چال بند ہوگئی۔ آخر نواب محمد علی خاں نے صلح کرا دی۔ اِس صلح کی خبر آرہ پہنچی تو صفیر بلگرامی نے جناب شاد کو یہ خط بھیجا:

''اعزّالاحبا جناب سیّد علی محمد صاحب شاد زادلطفہ۔ تسلیم! تحریر احباب سے مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ سے اور جناب شاہ حفاظت حسین صاحب مطیر سے جو اتفاقیہ ناچاقی ہوگئی تھی وہ بسعی و فہمایش جناب نواب مولوی محمد علی صاحب مدظلہ برطرف ہوئی۔ الحمدللہ والمنتہ۔ بخدا میرا جی بہت خوش ہوا... میں نے اِس صلح کا قطعہ تاریخ کہا ہے، وہ آپ کی خدمت میں بھیجتا ہوں۔ وہوہذا:

فتاد صلح میان دو مومن خوش خُو!
ز پاے مردی و سعی امیر ابن امیر

فگند طرح ولا با علی محمد شاد
بمہر شاہ حفاظت حسیں کہ ہست مطیر
بگوش خورد چو ایں مژدۂ مسرت زائے
چو گل شگفتہ شد از انبساط قلب صفیر
خیالِ مصرع تاریخ داشتم در دل
سرود ہاتفِ غیبی: خلوصِ شاد و مطیر

۱۲۹۶ھ

کاش اِسی طرح میرے آپ کے بھی صلح ہوجائے تو میں حافظ کا یہ شعر پڑھوں:

شکر للہ کہ میان من و اُو صلح فتاد
حوریاں رقص کناں ساغر شکرانہ زدند

مگر یہ صلح بہت دشوار معلوم ہوتی ہے۔ خیر: بیدل نیم ہنوز، ببینم چہ می شود!......''

۱۲۱۷ھ۔ شیخ پورہ ضلع مونگیر سے جناب شاد کے چھوٹے بھائی سیّد امیر حسن ایجاد نے صفیر بلگرامی کو خط بھیجا کہ بات بڑھ رہی ہے، اب صلح ہوجانا چاہیے۔ صفیر بلگرامی نے اِس کا مفصل جواب دیا۔ چند سطریں یہ ہیں:۔

''سعیدِ زمن مولوی امیر حسن ایجاد سلّمہ اللہ تعالیٰ...... آپ کا خط مورخہ چہارم محرم ڈاک سے پایا۔ اِس کو دیکھ کر دل بھر آیا۔ جو کچھ آپ نے لکھا ہے سب سچ ہے اور جو کچھ خیال کیا ہے سب راست ہے۔ افسوس! میں خود اِن باتوں سے نادم ہوتا ہوں۔ اور پانی پانی ہوا جاتا ہوں۔ بھائی! میں تو بہت رکتا ہوں اور سنبھلتا ہوں۔ مگر کیا کروں؟ بعض باتیں اُدھر سے ایسی ہوجاتی ہیں کہ ناچار جواب دینا پڑتا ہے۔ خدا اِس کا علیم ہے کہ میں نے باوجودے کہ برسوں بہت کچھ سنا اور بے اعتنائی اپنی آنکھوں بھی دیکھی مگر دم بخود رہا۔ کیوں کہ مجھ سے تو کوئی نہیں بولتا تھا۔ کیا ضرور کہ میں دخلِ بے جا

کرتا۔ اگر وہ (شاد) اپنی تعریف کرتے تھے تو میرے خوش ہونے کا مقام تھا۔ اگر وہ میری توہین کرتے تھے تو شنیدہ را اعتبارے چنداں نیست، سمجھ کر ناشنیدہ کر دیتا تھا...... آخر کہاں تک؟ میرا منصب، جو میرے نزدیک کیا بہتوں کے نزدیک بلکہ خدائے عادل کے نزدیک ہے، آخر مجھے غیرت میں لایا۔ اور روز روز کی ناشنیدنی سے جی گھبرایا۔ یعنی جب یہ سنا کہ اُدھر اب انکار صاف ہے تو میں نے اپنی پرانی رڈیوں کو دیکھا بھالا اور جو کچھ زمانۂ شاگردی کا بندھا بندھایا رہ گیا تھا نکالا۔ اور اُس کا ایک مجموعہ درست کر کے شاہدین سے اُس پر دستخط لکھوایا۔ پھر بھی اُن کو (شاد کو) خیال نہ ہوا، ایک بے تہذیب سے مل کر میری تہجین میں کوشش فرمائی...... معاذ اللہ مجھے اُن ملاعین سے مثال دی جن کے مقابلے میں اُن کے اور میرے آباء طاہرین نے صبر کیا تھا...... جناب میر امیر حسن صاحب! حسبۃً للہ فرمایئے کہ اِن سب باتوں کا جواب میری طرف سے کیا ہوا؟۔ خاموشی!... آپ اگر صفائی چاہتے ہیں تو مجھے محال معلوم ہوتی ہے، کیوں کہ میرا دعویٰ اِسی قدر ہے کہ وہ (شاد) بقسم اقرار کر دیں کہ میں صفیر کا شاگرد ہوں... جب تک شاہ صاحب (فریاد) کلکتہ سے نہ آئے تھے اُس وقت تک بخدا میرے سوا وہ کسی کو نہیں دکھاتے تھے... اِس بات پر فیصلہ اگر ہو، اور وہ بھی علیٰ رؤس الاشہاد ہو (کیوں کہ یہ قصہ دور دور تک پہنچ گیا ہے، اُن لوگوں کو بھی اِس سے آگاہ ہونا ضرور ہے) تو میں حاضر ہوں۔ ورنہ رسوا ہو کر چپکے سے فیصلہ کر لینا غیرت قبول نہیں کرتی...''

۱۲۹۸ھ۔ رحلت حضرت شاہ الفت حسین صاحب فریاد عظیم آبادی۔ مصرع تاریخ: ''شاہ الفت حسین صدر جہاں۔''

''حیات فریاد'' (ص۱۸۹) میں مصرع تاریخ رحلت ''شاہ الفت حسین فردوسی'' صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ ۷ عدد زائد ہیں۔

۱۳۰۷ھ۔ رحلت حضرت سیّد فرزند احمد صاحب صفیر بلگرامی۔ نعش عظیم آباد سے خشکی کے راستے آرہ آئی اور محلّہ میرگنج میں پیوند خاک ہوئی۔ بتاریخ ۲۲ر رمضان المبارک

وقت شب:

اے شاد تم تو روتے تھے نکہت کے واسطے

اے لو! عدم کو آج سدھارے صفیر بھی!

یہ وہی نکہتؔ ہیں جن کے گھر میں جناب شادؔ حضرت صفیر بلگرامی کے شاگرد ہوئے تھے۔ اور یہ وہی نکہتؔ ہیں جنھوں نے تصدیق کی تھی کہ: ''العبد سیّد حامد حسین نکہت۔ باللہ العظیم کہ میر علی محمد صاحب شاد روبروے من اصلاحے چند از میر صفیر گرفتہ اند۔ انکار ازاں انحراف از ایمان است......''

۱۳۲۹ھ۔ اِس سال بی اے پاس کرنے کے بعد ہم حضرت شاد عظیم آبادی کی زیارت کے لیے حاضر ہوئے۔ حضرت نے پوچھا آپ کون؟ ہم نے کہا کہ ننگِ اسلاف سیّد وصی احمد بلگرامی۔ حضرت نے پوچھا اسلاف کون؟ ہم نے کہا کہ جدّی مرحوم و مغفور حضرت صفیر بلگرامی۔ حضرت کی آنکھوں نے کہا:

اے گل بتو خرسندم تو بوئے کسے داری!

حضرت کی زبان نے کیا کہا، اِس کے بیان کا یہ موقع نہیں۔ مگر حضرت کے قلم نے کیا کہا، اِس کا مختصر بیان یہ ہے:

مکتوبات شاد عظیم آبادی بنام سیّد وصی احمد بلگرامی

(۱)

چشم وجانِ شاد۔آپ کا خط مورخہ ۲۵/جولائی مجھ کو ابھی ملا۔میں خود بھاگل پور اب تک نہیں جاسکا۔ حالت یہ ہے کہ مجھ کو پہلے بخار آیا۔ پھر اسہال و اختلاجِ قلب میں حد سے زیادہ پریشان رہا۔ آپ جانتے ہیں کہ چراغ سحری کے لیے اندک جھونکا ہوا کا کافی ہوتا ہے اور یہاں تو اِس دفعہ سخت سخت جھونکے تھے۔ برابر یہی یقین رہا کہ آج کا دن میری رخصت کا ہے۔ مگر خیر۔ چوں کہ اجلِ موعود میں وقفہ ہے، اب کے بچ گیا۔

اور سچ یوں ہے کہ اِس بچنے کی چنداں خوشی نہیں ہے۔ زمانے کے رنگ کو دیکھ کر ایسا کبیدہ خاطر ہو رہا ہوں کہ اب زندگی کو دل نہیں چاہتا۔ جتنے خاندان پرانے اور باوقار تھے سب مٹ گئے۔ اُن میں اگر کوئی ہونہار نوجوان بھی باقی رہ گیا ہے تو وہ بزرگوں کے نام و نشان و ملکیت کو اور بھی خاک میں ملائے جاتا ہے۔ ہر چند زمانہ خلافِ دستور یہ کام نہیں کرتا لیکن کیا کروں؟ دل کو گوارا نہیں ہوتا۔ برخلاف اِس کے ایسے ایسے خاندان والے اب ابھر رہے ہیں جن کے باپ دادا تک کو شریف کہتے ہوئے تامل ہوتا تھا۔ تِلْکَ الْاَیَّامُ نُدَاوِلُھَا بَیْنَ النَّاسِ۔ میرے پیارے! بخدائے لم یزل میں اُن مسرت بھری خبروں کو سن کر اِس قدر خوش ہوا ہوں کہ بیان سے باہر ہے۔ قرآن میں ہے۔ **وَنُرِیْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَی الَّذِیْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِی الْاَرْضِ وَ نَجْعَلَھُمْ اَئِمَّۃً وَّ نَجْعَلَھُمُ الْوَارِثِیْنَ**۔ یہ آیت سورہ قصص کے آخر یا وسط میں ہے۔ ٹھیک اِس کے مصداق آپ ہوئے۔ **فالحمد للّٰہ علی ذلک، ثم الحمد للّٰہ**۔ یہ سیّد سچے میاں صاحب شفیقی سیّد اولاد حیدر سلمہٗ کے کون تھے (ہیں)۔ اِن تعلقات کو ضرور لکھ بھیجیے۔

ایک نہایت ضروری اور واجب التعمیل بات یہ ہے کہ آپ کے پاس میرا وہ مرثیہ موجود ہے جو میرے قلم کا لکھا ہوا اور مرزا دبیر مرحوم کی اس پر اصلاح ہے۔ مجھ کو قسم ہے اپنے آباءِ کرام کی کہ اگر آپ اُس کو مجھے دو تین دنوں کے لیے دیں تو میں محض ایک نظر اُس کو دیکھ کر فوراً واپس کردوں گا۔ بیٹا! میں اُس کو یا اور کسی ایسی چیز کو اب اپنے پاس رکھ کر کیا کروں گا۔ تم سے زیادہ اُس کا مستحق کون ہے؟ تم خوب جانتے ہو کہ سیّد سلمہٗ جس قابل ہیں۔ شاگردوں میں بھی کوئی ایسا نہیں ہے۔ تم کو خدا نے محض اپنے تفضّل سے ہر طرح کی قابلیت دی۔ الحمدللہ۔ پھر میں تم سے اگر کسی چیز کو عزیز کروں تو ہزار لعنت مجھ پر۔ دیکھو! اگر تم نے بواپسی ڈاک نہ بھیجا تو عذر کو بہانہ سمجھ کر سخت رنج ہوگا۔

دوسری بات یہ ہے کہ ماشاء اللہ ڈپوٹی کلکٹری کے کام سے آپ کو فرصت کہاں۔ مگر میں پھر کیا کروں؟ کیوں کہ بخدا آپ سے زیادہ میری ناچیز تصانیف کا

خبر گیر کون ہے؟ اور اگر ہو بھی تو یہ دل سوزی، محبت، قابلیت کس میں ہے؟ میری کتاب ''فکر بلیغ'' کا مسودہ جوں کا توں پڑا سڑتا ہے۔ اگر یہ کتاب مرتب و شائع نہ ہوئی تو کچھ نہ ہوا۔ اِسی پر دارومدار میری تمام تصانیف کے چھپنے کا ہے مگر ہنوز یہ کتاب حسب خواہ مرتب تک نہیں ہوئی ہے۔ آپ سے یہ استدعا ہے کہ آپ کے پاس تھوڑا تھوڑا مسودہ لکھ لکھ بھیجتا رہوں، اور آپ اپنے قلم سے میرے حسب خواہ صاف کرتے رہیے اور مجھ کو بھیجتے بھی جایئے۔

آخر کتاب میں آپ اپنے حسب وخواہ وہ سب باتیں بھی پائیں گے جس کا ایما آپ نے اِس خط میں کیا ہے۔ مرحوم میر قوت علی صاحب سے اِس بارے میں کہہ بھی چکا تھا کہ اب میرا دل ہر طرح کے غِش سے پاک صاف ہے۔ یہ کتاب اگر میری زندگی میں آپ کی محنت اور توجہ سے چھپ گئی تو شاید اِس سے بڑھ کر میری خوشی کا اور کوئی ذریعہ نہیں ہے... ان شاء اللہ غزلوں کی ترتیب کا بار بھی آپ ہی پر دوں گا۔ خدا کرے میری یہ سب تمنائیں پوری ہوجائیں۔

اگر زندہ رہا تو آیندہ دو شنبہ سہ شنبہ کو بھاگل پور کا قصد ہے۔ وہاں سے آکر یا خود میں آرہ آجاؤں گا یا ایک دن کے لیے آپ کو زحمت دوں گا۔ لیکن آپ بلا کسی انتظار کے اول تو وہ مرثیہ بھیج دیجیے تاکہ میں قبل اپنے جانے کے دیکھ کر واپس کردوں۔ دوسرے میری کل باتوں کا مفصل جواب دیجیے...... ہماری تمنا یہی ہے کہ تم کو خداوند کریم عمر طبعی کو پہنچائے۔ دونوں بھائی پھلو پھولو۔ ہر طرح کی ترقی کرو۔ الٰہی آمین۔ ثم آمین۔ سیّد تسلیم کہتے ہیں۔ تمھارا بڈھا دعاگو۔ السیّد علی محمد شاد۔ از پٹنہ سٹی ۱۶/ اگست ۱۹۱۸ء۔

اس اعزاز نامے میں چند باتیں تشریح طلب ہیں:

(ا) ''شاگردوں میں بھی کوئی ایسا نہیں ہے''۔ نہایت افسوس کی بات ہے کہ حضرت شاد کے ایک شاگرد نے اُن کے گھر میں آگ لگادی۔ آگ لگانے سے مطلب

یہ ہے کہ اور شاگردوں کو استاد کی نظروں سے گرا دیا۔ اُس فتنہ پرداز میں اتنی بھی صلاحیت نہ تھی کہ میر عنایت حسین امدؔاد عظیم آبادی اور سیّد علی حیدر شیدؔا عظیم آبادی کی حد کو پہچان سکتا۔ یا پروفیسر محمد مسلم عظیم آبادی، سیّد شاہ ولی الرحمٰن ولؔی ڈپٹی کلکٹر، سیّد شاہ خلیل الرحمٰن وفا عظیم آبادی وغیرہ کا کلام سمجھ سکتا۔ مگر اُس کی عیاریوں نے کسی کو ٹھہرنے نہ دیا۔ یہ شخص مہینوں استاد کے سر میں تیل ملتا، اُن کے پاؤں دابتا اور باور کراتا کہ اور جتنے شاگرد ہیں، سب آپ کے دشمن ہیں۔ یہ دروغ مجسم اِسی غلامی کے ذریعے بادشاہت کرتا تھا۔ یعنی کہنہ مشقوں کو ذلیل کرنے کے لیے خود حضرت شاؔد کی غزلیں مشاعروں میں اپنے نام سے پڑھتا تھا۔ مگر بقول حضرت امیر مینائی:

ستارے مرے دیکھے بھالے ہوئے ہیں
یہ سب گیند اُن کے اچھالے ہوئے ہیں

''حیاتِ فریاد'' (ص۱۶۴) میں حضرت شاد فرماتے ہیں: ''فی زمانا جو حرکات تلامذہ کے اپنے استادوں کے ساتھ ہیں کیا بیان کیے جائیں، دل ہمہ داغ داغ شد، پنبہ کجا کجا نہم؟ ان شاء اللہ اگر موقع ملا تو اِس بیان کو تفصیل وار کسی جگہ لکھ جاؤں گا تا کہ ناظرین کو حیرت و عبرت ہو...''۔ اِس فتنہ پرداز شاگرد کے ایک سو ستر ہاتھ تھے، اُن میں دو ہاتھوں کا کرشمہ یہ تھا کہ ایک ہاتھ سے حضرت شاد کو اُن کے اور شاگردوں سے لڑا دیا اور دوسرے ہاتھ سے شعرائے عظیم آباد و آرہ کو خود حضرت شاد سے لڑا دیا۔ یہ جنگ برسوں رہی۔ نومبر اور دسمبر ۱۹۲۳ء میں میدان جنگ کا نقشہ کیا تھا ملاحظہ ہو:

(۱)

۷۸۶

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

مشاعرے کا منشا یہ ہے کہ سخن گو اپنے کلام سنا کر محنت کی داد پائے اور حاضرین کو غیر جانب داری کا یقین آئے۔ سارے سخن گو بلائے جائیں۔ سب کا کلام سنا جائے۔ اور سب کی محنت

کی داد دی جائے۔ خود نمائی آئی۔ پھر مشاعرہ مشاعرہ نہ رہا۔ انھیں باتوں کو ملحوظ رکھ کر ایک صحبت مشاعرہ بتاریخ ۱۰ نومبر بوقت ۱۰ بجے شب بمقام بخشی محلّہ پٹنہ قرار پائی ہے۔ امید ہے کہ آپ بتاریخ و وقتِ معینہ پر تشریف لا کر ملتمسین کو رہینِ منت فرمائیں گے۔

مصرع طرح: ہر بزم سے اِس بزم کا انداز جدا ہے

قافیہ: جدا۔ فدا۔ حنا۔ خدا وغیرہ۔

ردیف...... ہے۔

الملتمسین

نظیر حسین شائق، ابوالقاسم وارثی مذکورؔ، نجم الدین نجمؔ، رضی الدین حسنؔ دہلوی، خواجہ عین الہدیٰ ثمرؔ، عزیز الدین بلخی رازؔ۔

(۲)

۱۸۸۶ء

الحمدللہ کہ مشاعرے کا حقیقی منشا عملی طور پر پچھلے مشاعرے میں جو نہایت حسن و خوبی کے ساتھ انجام پایا، کل حضرات نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ شہر کے تمام اہلِ کمال اور ماہر فن اور سخن سنج شریکِ بزم ہوئے۔ خلوص اور غیر جانب داری کے اعتبار سے یہ جلسہ جس قدر کامیاب ہوا، اُس کے متعلق بس یہی عرض کر دینا کافی ہوگا کہ شہر کے ہر حلقے کے سخن گو بلا استثنا شریک تھے اور کسی کو الحمدللہ کوئی وجہ شکایت پیدا نہ ہوئی۔ ہاں بعض مخالفین نے اِس بزم کو مفسدانہ جلسہ اور تو تو میں میں کے لفظ سے تعبیر کرنے میں تامل نہ کیا اور ایک نئی جولاں گاہ کی طرح ڈالی۔ لہٰذا ایسے لوگوں کے ناموں کو ترکِ فہرست کر کے عام دعوت دی جاتی ہے

کہ کل حضرات جن کو شعر وسخن سے دلچسپی ہے بتاریخ ۸ر دسمبر ۱۹۲۳ء روزشنبہ بوقت دس بجے شب بمکان مولوی سیّد عزیزالدین بلخی صاحب بخشی محلہ پٹنہ سٹی تشریف لا کر شریکِ بزم ہوں اور ملتمسین کو مرہون منت فرمائیں۔

مصرع طرح: بزم اغیار میں جانے کی ضرورت کیا ہے

قافیہ: ضرورت۔ محبت۔ وغیرہ۔ ردیف: ہے۔

الملتمسین، عین الہدیٰ ثمر۔ سیّد حسن سیّد۔ نظیر حسین شائق۔

یہ مشاعرے بخشی محلہ عظیم آباد میں ہوئے تھے۔ مصرع طرح کا روئے سخن حضرت شاد کی طرف تھا: ہر بزم سے اِس بزم کا انداز جدا ہے۔ یعنی بزم شاد میں صرف شاد و شاگردان شاؔد کو داد ملتی ہے۔ اور خود نمائی کا تماشا ہوتا ہے۔ بزم اغیار میں جانے کی ضرورت کیا ہے۔ یعنی بزم شاد میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ملتمسین کی فہرست میں دو نام خاص طور سے قابل توجہ ہیں، اول نظیر حسین شائق شاگرد حضرت شاد اور دوم عین الہدیٰ ثمر، شاگرد مولانا بدر آروی۔ اب دیکھیے کہ زمانہ حضرت صفیر بلگرامی کا انتقام حضرت شاد سے کس طرح لیتا ہے۔ شاد نے ۱۲۸۷ ہجری میں صفیر بلگرامی سے انحراف کیا تھا، اب پچپن برس کے بعد خود حضرت شاد کا شاگرد شائق عظیم آبادی اُن سے ٹوٹ کر ملتا کس سے ہے، شاگرد شاگرد صفیر بلگرامی یعنی حافظ سیّد عین الہدیٰ ثمر آروی سے۔ بہرکیف اِن دونوں مشاعروں کے رقعے ہم کو بکسر ضلع شاہ آباد میں ملے۔ مشاعرے میں ہم خود شریک نہ ہوسکے۔ مگر ایک غزل بھیج دی جس میں یہ دو شعر بھی تھے:

جو داد کے قابل نہیں اُس کو بھی ملی داد!
"ہر بزم سے اس بزم کا انداز جدا ہے"
فاؔنی متعصب نہیں جو شاد سے روٹھے
شاگرد صفیر آج تو تاج الشعرا ہے

مشاعرے میں ہمارے یہ دو شعر پڑھے گئے تو ایک شخص حضرت شاد کے پاس دوڑا گیا۔ اور کہا کہ دیکھیے صفیر بلگرامی کے پوتے نے اِس مقطعے میں پھر آپ کی شاگردی کا فسانہ چھیڑ دیا۔ مگر اُس غریب کو یہ خبر نہیں تھی کہ اِس سے پہلے ہی ہم حضرت شاد کو براہ راست لکھ چکے تھے کہ اب آپ کو غور فرمانا چاہیے کہ انحراف کا بوجھ اپنی گردن پر لے جانا آپ کے لیے مناسب ہے یا نہیں۔ اِسی سوال کا جواب حضرت شاد نے ہم کو دیا تھا کہ:

> ''آخر کتاب (فکر بلیغ) میں آپ اپنے حسب خواہ وہ سب باتیں بھی پائیں گے جس کا ایما آپ نے اِس خط میں کیا ہے۔ مرحوم میر قوت علی صاحب سے اِس بارے میں میں کہہ بھی چکا تھا کہ اب میرا دل ہر طرح کے غِش سے پاک صاف ہے...''

اِس جملے میں میر قوت علی صاحب سے مراد حضرت میر امامی بلگرامی کے خلف میر قوت علی شورش بلگرامی، شاگرد صفیر بلگرامی ہیں۔ مرزا اوج لکھنوی (خلف میرزا دبیر) اور حضرت شاد اُن کا بہت احترام کرتے تھے۔ انھیں سے حضرت شاد نے اقرار کیا تھا کہ صفیر بلگرامی کی شاگردی سے ہمارا انحراف دراصل عالم شباب کا ایک شعبدہ تھا۔ یہی مطلب ہے اِس فقرے کا کہ اب میرا دل ہر طرح کے غِش (یعنی کدورت و خیانت) سے پاک صاف ہے۔

حضرت شاد کا یہ خط ہم کو ۱۹۱۸ء میں آیا تھا۔ اِس کے آٹھ سال بعد ہم ایک مرتبہ حضرت شاد کی زیارت کے لیے اُن کے درِ دولت پر حاضر ہوئے تو حضرت نے اپنے صاحب زادے سیّد حسن خاں سے فرمایا کہ مطبوعہ اوراق جو اُس کمرے میں رکھے ہیں ذرا وصی احمد کو دکھلا دو۔ وہ اوراق آئے تو ہم نے دیکھا کہ ایک قطعے میں حضرت شاد نے اپنے استادوں کو یاد کیا ہے اور اِس فہرست میں صفیر بلگرامی بھی ہیں۔ مگر ایک بیت کے مصرع ثانی میں مطبوعہ الفاظ یہ ہیں: ''...... صفیر استادِ فن بود۔''

اِس فقرے کا پڑھنا تھا کہ ہم کو حضرت ناسخ کا مصرع یاد آگیا: خط وہ لکھتا

ہے، یہ لکھنے نہیں دیتے ہیں رقیب! یعنی حضرت شاد نے صفیر بلگرامی کی شاگردی کا اقرار کرنا چاہا بھی تو رقیبوں نے یہ ذلت گوارا نہ کی اور ایک نقطے سے اپنا کام نکال لیا۔ ہم نے حضرت شاد سے کہا کہ ذرا اِن الفاظ کو ملاحظہ فرمایا جائے۔ حضرت نے چشمہ طلب فرمایا اور اِس بیت کو پڑھ کر فرمایا کہ یہ غلط ہے۔ الفاظ یہ تھے: ''صفیر استادِ من بود''۔ ہم نے کہا کہ اپنے دست مبارک سے تصحیح فرما دی جائے۔ تب حضرت نے قلم دوات منگا کر حاشیے پر یہ ثبت فرمایا:۔

''ایں جافن نیست۔ من است۔ السید علی محمد شاد''

حضرت شاد سے یہ دستاویز لے کر ہم اُسی وقت بانکی پور گئے۔ اور بھائی صاحب مدظلہ العالی حاجی سیّد عنایت احمد صاحب بلگرامی ڈپٹی کلکٹر سے کہا کہ لیجیے حضرت شاد نے قرض بے باق کر دیا۔ بھائی صاحب مدظلہ العالی نے فرمایا کہ اِس دستاویز کو خدا بخش خاں صاحب کے کتب خانے میں رہنا چاہیے۔ ہم نے کہا کہ ضرور۔ چنانچہ دوسرے دن حضرت شاد کا وہ نوشتہ جناب مولوی ولی الدین خدا بخش خاں سیکریٹری اورینٹل لائبریری بانکی پور کو سپرد کر دیا گیا۔

(۲) ''آپ کے پاس میرا وہ مرثیہ موجود ہے جو میرے قلم کا لکھا ہوا اور مرزا دبیر مرحوم کی اُس پر اصلاح ہے''۔ یہ مرثیہ وہی ہے جس کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے۔ حضرت شاد کا یہ سب سے پہلا مرثیہ ہے۔ اور اس پر صفیر بلگرامی اور مرزا دبیر کی اصلاحیں ہیں۔ حضرت شاہ کو اُس کی زیارت ستر برس کے بعد نصیب ہوئی یعنی یہ خط پاکر ہم مرثیہ لیے ہوئے پٹنہ گئے اور حضرت شاد کو سپرد کر آئے۔ پھر چند ماہ کے بعد دوبارہ پٹنہ گئے اور مرثیہ لے آئے۔ یہ تبرک ہمارے پاس اب تک محفوظ ہے۔

(۲)

برخوردار نور چشم فضائل مآب سلمکم اللہ تعالیٰ۔

آپ کے تشریف لے جانے کے بعد مجھ کو زیر ناف سخت درد پیدا ہوگیا۔ رات تڑپ کر کٹی۔ تھوڑی دیر سے کچھ افاقہ ہے۔ جس مموریل کا میں نے آپ سے ذکر

کیا ہے، اُس کا ایک انگریزی مسودہ اور کچھ مضمون اس پر زیادہ کیا ہے۔ اردو میں وہ مضمون جاتا ہے۔ پوری امید ہے کہ آپ اِن مضامین کو اپنے طور پر انگریزی میں لکھ دیجیے۔ اور صاف کر کے اِس دو شنبہ کے قبل میرے پاس روانہ کر دیجیے۔ دو شنبہ کے دن کمشنر صاحب کو دکھا کر چھپوانے کا ارادہ ہے۔ اور اگر آپ کی عنایت ہوگی تو ان شاء اللہ ۱۵ر نومبر کو داخل کیا جائے گا...... اللہ تعالیٰ آپ کی عمر و اقبال میں ترقی کرے۔ آمین! رقیمتہ الدعا السید علی محمد شاد ۱۷ر نومبر ۱۸ء پٹنہ۔

(۳)

برخوردار نور چشم، بہتر از جان، طال عمرہ و اقبالہ۔

بعد دعائے ترقیِ درجات کے واضح خدمت ہو، آپ جس دن سے مجھ کو دیکھ کر گئے ہیں میں سخت ضعیف و ناتواں ہوگیا ہوں۔ ظاہرا زکام تھا مگر تپاکِ قلب اور تبخیر نے ایسا پریشان کر دیا ہے کہ چار سطریں غور کر کے لکھنا محال ہے۔

وقت گزرا جاتا ہے۔ اگر میں جلد مر گیا اور غالباً وہ وقت قریب ہے تو اِن ننھے بچوں کا کوئی کفیل نظر نہیں آتا۔ آخر دل اِس قدر گھبرا گیا کہ بغیر ترتیب دیے اور صاف کیے موریل کے نوٹوں کو آپ کی خدمت میں بھیجنا پڑا۔ میرے عزیزوں اور شاگردوں کی تعداد سیکڑوں سے زیادہ ہے۔ مگر آج ایک بھی مددگار نظر نہیں آتا۔ خدا آپ کو ترقی عمر و اقبال دے۔ محض آپ پر ہر قسم کا بھروسا ہے۔

میں نے جب جب جس جس قدر نوٹ کیے ہیں سب کو بھیج دیتا ہوں۔ سب کو ملاحظہ کر کے مسودہ جلد درست فرمائیے۔ اولڈھم صاحب مارچ تک چلے جائیں گے۔ اِس سے زیادہ آپ سے کیا گزارش کروں... اب آپ خود سمجھ لیجیے۔ مجھ بوڑھے بیمار کو تکلیف نہ دیجیے۔ اللہ تعالیٰ تم کو سلامت رکھے۔

دعا گو السید علی محمد شاد

۴ر جنوری

(۴)

برخوردار سعادت اطوار، والا دودمان سلمکم اللہ تعالیٰ۔

بعد سلام شوق و ترقیِ عمر و اقبال واضح خدمت ہو، چند روز ہوئے کہ میرے غم خوار، دل نواز، شفیقِ بے ریا، مولوی بدر صاحب نے مشاعرے کا اشتہار میرے پاس بھجوایا۔ اُس کو دیکھ کر کیا بتاؤں کہ میری کیا حالت ہوئی۔ آٹھ مہینے کامل گزر گئے کہ اِس عارضۂ قدیمہ یعنی وحشت و اختلاجِ قلب نے میری کیسی حالت بنا دی۔ اور اور باتیں ایک طرف، لکھنا پڑھنا، دروازے سے باہر نکلنا، سب چھوٹ گیا۔

علاوہ اِس کے میں مدتوں سے ترکِ مشاعرہ کرچکا۔ نہ میں قابلِ مشاعرہ رہا۔ نہ مشاعروں کی حالت ایسی ہے کہ شرفا شریک ہونا گوارا کریں۔ مگر ساتھ اِس کے اللہ اکبر آرہ! اور پھر مولوی صاحب سلّمہٗ کا اِس محبت سے بلانا، اور میرا نہ جانا بھی کچھ کم میرے لیے باعث صدمۂ عظیم نہیں ہے۔

آپ یہ ملاحظہ کریں کہ میرے پاس مدتوں سے ایک ٹوٹا پریس پڑا تھا۔ اُس کی مرمت کر کے ڈین صاحب کلکٹر سے اجازت مانگی۔ انھوں نے بلاضمانت اجازت تو دی مگر یہ کہا کہ میں قانون سے مجبور ہوں، حسب قاعدہ دو منٹ کے لیے وہ آ کر خود افیڈفٹ کر جائیں۔ مگر اِس کم بخت عارضے کے سبب سے میں جا ہی نہ سکا۔

یہاں ایک تاجر بڑے نامی ہیں۔ منت خاں۔ اُن کے بھتیجے چھنگے خاں نے سخت اصرار کر کے چاہا کہ اپنے خرچ سے کل میری تصانیف چھپوادیں اور کوئی دقیقہ اصرار کا اٹھا نہ رکھا۔ میں نے مجبور ہو کر اقرار بھی کرلیا۔ پہلے انھوں نے یہ خبر نہیں دی تھی کہ کس مطبع میں چھاپیں گے۔ لیکن چوں کہ اُن کے بہت روپے آرہ کے مطبع "۔۔۔" کے ذمّے باقی ہیں، وہیں بات چیت طے کرلی تھی۔ جب مجھ کو یہ معلوم ہوا...... تو مجھ کو اُس نمک حرام کے مطبع میں چھپوانا گوارا نہ ہوا۔ چھنگے خاں کو تو اپنے روپے وصول کرنے تھے۔ خاموش ہو بیٹھے۔ اور مجھ سے بہت لوگوں نے کہا کہ آپ کو کیوں ایسی کد ہے۔ مجھ کو یہ بھی گوارا نہ ہوسکا کہ پرانا قصہ لے بیٹھوں۔ صرف یہی

جواب دیا کہ وہ نہایت وعدہ خلاف شخص ہے۔ میں نے عہد کرلیا ہے کہ چاہے مفت چھاپے مگر میں وہاں ہرگز نہ چھپواؤں گا۔ یہ ایک جملۂ معترضہ تھا۔

اب پھر مشاعرے کا ذکر کرتا ہوں۔ چند دن سے میں جیسا ہوں اگر ایسا ہی رہا تو آنکھوں سے حاضر ہوں گا۔ اور اگر خدا ناکردہ دل قابو میں نہ رہا تو ریل پر دو گھنٹے گھٹ کر رہنا ہی ستم ہے۔ ورنہ پٹنہ اور آرہ میرے لیے دونوں برابر ہیں۔

دوسری گزارش یہ ہے کہ بصورت حاضری میرے پڑھنے کے لیے ایک مجلس عزا کا ہونا ضرور ہے۔ پندرہ برس اُدھر اگر میں کسی جگہ مشاعروں میں گیا ہوں تو پہلے ہی یہی نیت کرلی ہے۔ اگرچہ اب میری حالت ایسی نہیں ہے کہ حسب خواہ مجلس پڑھ سکوں مگر اس کو سعادت اور برکت جانتا ہوں اور یہ کل امور جب ہی باعثِ دلچسپی ہوں گے جب آپ آرہ میں تشریف رکھتے ہوں گے۔ ابھی تک میں نے مولوی بدر صاحب کو خط تک نہیں لکھا ہے۔ آپ کا خط پانے کے بعد البتہ جواب لکھوں گا۔

والسلام۔ دعا گوئے شما   السید علی محمد شاد۔ ۲۳ر اکتوبر ۲۰ء۔ پٹنہ سٹی۔

اِس خط میں دو فقرے تشریح چاہتے ہیں مگر تشریح کا موقع نہیں:

(۱) ''اللہ اکبر آرہ!'' اس فقرے پر مولانا جامی علیہ الرحمہ کا ایک شعر بے اختیار یاد آگیا:

مرا کُشتی و تکبیرے نگفتی
چہ سنگیں دل کسی، اللہ اکبر!

تو نے ہم کو ذبح کیا اور تکبیر تک نہ کہی۔ تو بھی کتنا سنگ دل ہے۔ اللہ اکبر!

(۲) ''مجھ کو اُس نمک حرام کے مطبع میں چھپوانا گوارا نہ ہوا۔'' نمک حرامی ایک شخص نے دراصل حضرت صفیر بلگرامی کے ساتھ کی تھی۔ اِس لیے شاگرد کی غیرت نے گوارا نہ کیا کہ جس نے استاد کے ساتھ نمک حرامی کی، اُس کے مطبع میں اپنا کلام طبع کرائے۔

(۵)

جان و دلِ شاد بقربانِ شما۔ ایک ہفتے سے زیادہ ہوا کہ آپ کا گرامی نامہ باعثِ قوتِ دلِ حسرت منزل ہوا تھا۔ کتابوں کی نسبت کیا عرض کروں۔ ایک ہفتے سے یہی ہو رہا ہے کہ کل چاروں کا ایک جزو طیار ہوجائے گا۔ مگر کوئی نہ کوئی بکھیڑا نکل آتا ہے۔ شاید اب اتوار تک طیار ہوکر آپ کے پاس روانہ ہوجائے...... بھائی! اِس عمر اور دھڑکن اور ضعف نے مجھ کو مار ڈالا ہے۔ اُس پر مسودہ دیکھنا، کاپی دیکھنا، پروف دیکھنا، اور پھر مختلف مضامین پر نظر رکھنا۔ خدا اہلِ علم وفن میں عزت رکھ لے... اللہ تعالیٰ آپ کو خوش رکھے اور درجۂ اعلا پر پہنچائے کہ دیکھ کر اور بھی دل خوش ہو۔ میں تو اِس وقت بھی فخر کرتا ہوں اور دل چاہتا ہے کہ تمھارے پاؤں کی خاک اپنی آنکھوں سے لگایا کروں۔

تمھارا خاکسار۔ السید علی محمد شاد (۳۰؍ دسمبر ۱۹۲۰ء)

اِس خط میں چار کتابوں سے مراد ''ریاضِ عمر'' ''چشمِ بصیرت'' ''فکرِ بلیغ'' اور ''آیئنۂ انقلاب'' ہیں... ریاض عمر: دیوان غزلیات۔ چشم بصیرت: کلیات مولود و مراثی۔ فکر بلیغ تذکرۂ مرثیہ گویاں۔ آیئنۂ انقلاب: تاریخ صوبہ بہار۔ اشتہار کی سرخی یہ تھی:

آزمالو یوں بھی اِس گرتے ہوئے بازار کو
شاد بیچو توڑ کر اِن موتیوں کے ہار کو

موتیوں کے ہار توڑ کر اِس طرح بکے کہ ایک ایک جزو چاروں کتابوں کے بیک وقت شائع ہوئے۔ افسوس کہ حضرت شاد کی مجبوریوں اور زمانے کی ناقدری نے یہ سلسلہ بھی موقوف کر دیا۔ ورنہ ''ریاض عمر'' کا سرنامہ بالکل بجا و درست تھا۔ سرنامہ یہ تھا:

تن دیدہ اند از من و جانم ندیدہ اند   نامم شنیدہ اند و نشانم ندیدہ اند
آنہا کہ آورند مرا در نظر حقیر   بر آستان میکدہ شانم ندیدہ اند
آناں کہ سرکشند ز نخوت بر آسماں   بیچارگاں بکوئے مغانم ندیدہ اند

حضرت شاد کا دیوان جو شائع ہوا ہے وہ بالکل ناقص ہے۔ یہی حال ''فکر بلیغ'' کے اُس حصے کا ہے جو رحلتِ حضرتِ شاد کے بعد شائع ہوا۔ مجروح کبوتر کو دیکھنا ہو تو اِن دونوں کتابوں کو دیکھیے۔

(٦)

نورچشم، سراپا قابلیت، سراپا احسان، مولوی سیّد وصی احمد صاحب طال عمرہ و اقبالہ۔ بعد سلام شوق و دعائے مخلصانۂ ترقیات التماس یہ ہے کہ ہر چند آپ کو تکلیف دیتے ہوئے سخت حجاب آتا ہے۔ مگر الغریض مجنون۔ کیا کروں؟

حالت یہ ہے کہ اِس دفعہ حسب ایمائے سر فخرالدین صاحب ایک موریل میں نے پھر گورنمنٹ میں دیا تھا۔ کمشنر نیا تھا۔ اُس نے مرے بیان کی تحقیقات کی۔ کلکٹر نے سٹی مجسٹریٹ کے پاس بھیج دیا۔ سٹی مجسٹریٹ نے نہایت حسب خواہ رپورٹ کیا۔ مگر اتنا لکھ دیا کہ سات سو سالانہ جمع بندی کا ایک گاؤں بھی ہے جس کی آمدنی بسبب دفعہ ۴۰ اور آسامیوں کے جھگڑے سے چار برس سے بند اور قرض سودی اُس پر پانچ ہزار ہے۔ کلکٹر نے یہ رپورٹ دیکھا (ازبسکہ شریر النفس مشہور ہے) برخلاف لکھا۔ مگر پھر کمشنر نے اپنی رپورٹ میں سفارش لکھ دی۔ سر فخرالدین نے شاید اُس انگریزی ممبر سے جو ایسے کاغذات دیکھتا ہے، سفارش بھی کی۔ مگر اُس کلکٹر نے بقول ان کے کچھ زبانی جا کر ایسا کہا کہ ناکامیابی ہوئی۔

بجز تحقیقاتی رپورٹ کے اور کاغذوں کی نقل آپ کی خدمت میں جا رہی ہے۔ زیادہ افسوس یہ ہے کہ اگر کوئی صورت لڑکوں کے لیے وظیفے کی نہ نکلی تو اُن کی تعلیم دشوار ہے۔ سر فخرالدین نے کہا کہ اِس دفعہ صرف لڑکوں کی تعلیم میں معقول مدد ملنے کی استدعا کیجیے۔ چوں کہ اِس کو ایجوکیشن سے تعلق ہے، شاید حکم آخر کے لیے میرے پاس آئے گا۔ میں نے پوچھا کہ ایسا موریل کس سے لکھوایا جائے۔ انھوں نے کہا کہ یاد آتا ہے کہ مولوی سیّد وصی احمد صاحب سے آپ نے ایک موریل لکھوایا تھا۔ وہ سب سے بہتر تھا۔ انھیں سے لکھوایئے۔

میں نے اِس پیری و نابینائی میں کئی مسودے کیے۔ پھر استخارہ کیا تو واجب یہی آتا ہے کہ آپ لکھیے۔ اور ضرور لکھیے۔ اور پھر ٹیپ کرواکر، ہرطرح مرتب کر کے، جلد بھیج دیجیے۔ سر فخرالدین اوائل مئی میں رانچی چلے جائیں گے: سپردم بتو مایۂ خویش را۔

مجھ کو معلوم نہیں کہ یہ موریل بھی کمشنر کے ذریعے سے جائے گا یا اور کسی کے۔ بہرحال یہ کام آخرِ عمر کا جلد کر دیجیے۔ دست بستہ گزارش ہے کہ جلد مرتب کر دیجیے۔ اگر ضرورت لڑکوں کے نام کی ہو تو ذیل میں لکھتا ہوں:

سیّد سلطان احمد خاں۔ عمر ۹ سال۔ جارج ام ای اسکول میں ساتویں کلاس میں پڑھتا ہے۔

سیّد نقی احمد خاں۔ عمر ساڑھے سات۔

دعاگو، السید علی محمد شاد۔ پٹنہ سٹی۔ ۲۳ اپریل ۲۶ء۔

اِس خط میں سر فخرالدین کی زبانی جس موریل کا حوالہ ہے، اُس میں ہم نے حضرت شاد کی طرف سے لکھا تھا کہ گورنمنٹ سال میں لاکھوں روپے آثارِ قدیمہ پر صرف کرتی ہے۔ کیا قہر ہے کہ گورنمنٹ نے آثارِ قدیمہ کی فہرست میں اب تک شاد عظیم آبادی کا نام درج نہیں کیا۔ یہ موریل پہنچا تو گورنمنٹ آف انڈیا نے ایک ہزار روپیہ سالانہ وظیفہ حضرت شاد کے لیے عطا فرمایا۔ یہ وظیفہ نو سال تک جاری رہا۔ جنوری ۱۹۲۷ء میں موقوف ہوا، جب حضرت شاد نے رحلت فرمائی، اور شمع شاعری ہمیشہ کے لیے خموش ہوگئی:

سکھی! سنیو میری کہانی   میں تو بھئی ہوں بر ہا. دیوانی

حواشی:

۱۔ نامۂ شوق میں ۱۷۱ ابیات ہیں۔ یہاں صرف ۸ بیتیں لکھی گئیں۔ اول بیت میں دلبر اور آخری دو بیتوں میں حیراںؔ فرضی نام ہیں۔ دلبر بر وزن حیدر چنانچہ چوتھی بیت میں اصل نام حیدر موجود ہے۔ رئیس زادے کا نام بھی اِس خط میں پوشیدہ ہے۔

۲۔ ان چھ بیتوں میں اُس محلے کا نام پوشیدہ ہے جہاں رئیس زادے کا محل تھا۔

۳۔ جس میرزا غلام حسین کی پرورش خود حضرت شاہ عالم بادشاہ دہلی نے کی، اُس کو مولوی عبدالغفور خاں نساخ تعصب کی راہ سے کاغذ فروش لکھنوی لکھتے ہیں (تذکرۂ سخن شعرا، ص ۱۵۸) میرزا غلام حسین کا سنگین جرم یہ تھا کہ مرزا دبیر لکھنوی کے وہ باپ تھے۔ اور میرزا دبیر کا سنگین جرم یہ تھا کہ لیلائے شاعری اُن کے قدم چومتی تھی۔ نساخ کو اس کی تاب کہاں؟ نساخ کا ادنیٰ کمال یہ ہے کہ شہنشاہ اقلیم سخن میر انیس کے بارے میں فرماتے ہیں (ص ۵٦): "سوائے مرثیہ کے اور کسی صنفِ سخن میں مطلق دخل نہیں رکھتے تھے۔ بلکہ مرثیہ بھی اُن کا ایسا نہیں کہ عیوب شاعری سے پاک ہو"۔ اور پھر میر انیس کی رسوائی کے لیے نمونہ کلام میں صرف تین شعر دیے:

ہوا ہے، ابر ہے، ساقی ہے، مے ہے
پر اک تو ہی نہیں، افسوس، ہے ہے

کس سے اے شوخ ہوئی رات کو ہاتھا پائی
نورتن آج جو ڈھلکا ہے ترے بازو سے

کل تو آغوش میں شوخی نے ٹھہر نے نہ دیا
آج کی شب تو نکل جاؤ مرے قابو سے

حضرت غالب نے اِسی موقعے کے لیے کہا تھا:

شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے!

نساخ کو اکثر فضلائے روزگار سے خلش تھی۔ حضرت شاہ الفت حسین صاحب فریاد عظیم آبادی کے بارے میں پہلے تو یہ لکھا کہ اپنی شاعری کا بہت غرور رکھتے ہیں اور پھر انتخاب میں صرف دو شعر دیے جس میں ایک شعر یہ ہے:

نفس کو نالۂ دل سے اسیر درد کرتے ہیں
صبا کے پاؤں میں زنجیر بوئے گل سے بھرتے ہیں
(ص ۳٦۷)

مصرع ثانی مہمل ہے کیوں کہ زنجیر بھرنا کوئی محاورہ نہیں ہے۔ مگر نساخ کو ثابت بھی یہی کرنا ہے کہ فریاد عظیم آبادی اگر چہ اپنی شاعری کا بہت غرور رکھتے ہیں مگر جاہل ہیں۔

نساخ نے میر انیس و میرزا دبیر کے کلام میں غلطیاں نکالیں اور رسالہ "انتخاب نقص" شائع کیا۔ اُس کا جواب حضرت ناسخ کے شاگرد مرزا محمد رضا معجز نے رسالۂ "تیغ النساخ" میں دیا۔ مطبوعہ ۱۲۹٦ ہجری مطبع شعلۂ طور کان پور۔ اعتراضات نساخ کا نمونہ یہ ہے:

یاں تیغ جگر بند علی میان سے نکلی
کس زرق سے کس برق سے کس شان سے نکلی
(میر انیسؔ)

اعتراض یہ تھا کہ توابع کا جدا ہونا جائز نہیں۔ اِس لیے زرق برق کو جدا کرنا غلط ہے۔ جواب دیا گیا کہ فارسی میں توابع کے درمیان واوِ عاطفہ لاتے ہیں۔ مثلاً زرق و برق، گفت و شنید۔ اور اِسی کا نام جدا کرنا ہے۔ چنانچہ آرزو کا فیصلہ ہو چکا ہے:

''انچہ نوشتہ کہ تابع بہ عطف مستعمل نہ شود غلط صریح است''۔

اور میر انیس کی طرح نیشاپوری بھی فرماتے ہیں:

زد سخن بر لب نظیری خوش
عشق در گفت و در شنود آمد

۴۔ اِس مشاعرے میں جناب شفق نے ایک رباعی کہی تھی جس کا پہلا اور دوسرا مصرع یہ ہے:

روشن ہے جہاں میں بدر سے نام صفیر ۔۔۔ ناچیز شفق ہے کفش بردار امیر

حضرت امیر مینائی کے پہلے جناب شفق کو شوق نیموی سے تلمذ تھا۔ اُس زمانے کا نمونہ کلام یہ ہے:

نو گرفتارِ محبت ہوں ابھی کیا جانوں! ۔۔۔ فرقت اچھی ہے کسی کی کہ وصال اچھا ہے
کیا مزہ ہو انقلاب ایسا اگر ہو دہر میں ۔۔۔ میں تو روٹھوں اور وہ آئیں منانے کے لیے

۵۔ فہرست تصانیف حضرت صفیر بلگرامی تا ۱۲۹۴ ہجری:

نظم	نثر
دیوان۔ فارسی ۳۔ اردو ۸	بوستان خیال۔ ۱۸ جلد
مثنویات۔ فارسی ۴۔ اردو ۲۶	فیض صفیر۔ ۲۱ جلد
قصائد...... فارسی ۲۔ اردو ۴	تذکرہ مردم دیدہ۔ ا جلد
کلیات مولود و مراثی۔ ۲ جلد	مضامین مختلف۔ ۷۵
دیوان خمسہ جات۔ ا جلد	گلبن موزوں۔ ۳۳
دیوان رباعیات۔ ا جلد	قصص۔ ۷
قطعات۔ ا جلد	مرغوب القلوب۔ ا جلد
واسوخت۔ ۴ جلد۔ نظم مختلفہ۔ ا جلد	جوہر مقالات۔ ۳ جلد
	سراج العقول۔ ا جلد
	فال نامہ۔ ا جلد
	ترجمہ تفسیر۔ ا جلد
	ترجمہ کتبِ مختلفہ۔ ۵

۶۔ یہ کوٹھا وہی کوٹھا ہے جو عرش سے باتیں کر رہا ہے۔ اِس کوٹھے کے نیچے زنجیروں کی جھنکار ہے، تیروں کی بوچھار ہے، رسن ہے، دار ہے۔ خون کی ندیاں ہیں، ظلم کی بجلیاں ہیں۔

ماہ کنعاں قید خانے جا رہا ہے۔ زلیخا کھڑی ہوئی ہنس رہی ہے...... سیّد الشہدا ایک شیر خوار کو ہاتھوں پر لیے ہوئے فریاد کر رہا ہے: ''ایک گھونٹ پانی خدا کی راہ میں''۔ حرملہ کا تیر علی اصغر کی پیاس بجھانے آتا ہے۔ اِدھر معصوم کے حلق سے خون کا فوارہ چھوٹ رہا ہے اور اُدھر فوج یزید میں عید قربان ہے...... ایک ماں اپنی گدڑی کے لعل کو صندوق میں بند کر کے دریائے نیل کو سونپ رہی ہے اور صندوق

بہتا ہوا فرعون کے محل کی طرف جا رہا ہے...... اللہ کا ایک فرماں بردار غلام یہودیوں کے نرغے میں ہے اور اُس غلام کے لیے سولی کھڑی کی گئی ہے...... سقراط کو زہر کا پیالہ دیا جا رہا ہے اور تاج دارِ مشہد مقدس کو زہر آلود انگور بھیجے جا رہے ہیں...... ایک میدان میں کبوتر کے پر بھی ہیں۔ جس کو شک ہو وہ آ کر اپنی آنکھوں سے دیکھ لے۔ کہیں عباس علم دار کے دست بریدہ ہیں۔ کہیں علی اکبر کا تن بے سر ہے۔ کہیں حبیب ابن مظاہر کا سر بے تن ہے۔ یہ میدان کرب و میدان بلا ہے۔ یعنی کربلا ہے۔

گلی میں یہ سامان، فدائیوں کی یہ شان اور کوٹھے والا دیکھتا ہے مگر دیکھتا نہیں۔ بے نیاز ہے۔ دیکھتا نہیں مگر باغ باغ ہوا جاتا ہے۔ اِسی دن کے لیے اُس نے آگ کو حکم دیا تھا کہ مٹی کو سجدہ کر! مٹی کا وزن آگ سے زیادہ ہے۔ مگر مٹی کہیں اِترا نہ جائے، غرور نہ کر بیٹھے۔ اس لیے:

''بھری ہوگی سب سے نظر دیکھ لینا!''

۷۔ برہ کی سنگن سے جگر داغ داغ ہے۔ داغوں کی پھلواڑی ہے۔ اے پیارے! ہماری جان تجھ پر فدا ہو! اس تڑپن کو ایک نظر دیکھ تو لے!

۸۔ تیری اداؤں کا مارا حسن تیرے حسن کی تعریف کرے تو کیا کرے؟...... جب تیرے مکھڑے کی دمک سے سورج اور سورج بنسی تک شرمائے جا رہی ہیں۔

۹۔ اے دل! اے عقل اور دین کے دشمن! تیرا حال کیا ہے؟...... تجھ کو اِس وقت کس کی یاد آگئی جو تو بیٹھا ہوا یوں سن سن کر رہا ہے؟

۱۰۔ وحشت کا اب یہ زور ہے کہ دامن ہر روز پھٹتا ہی رہتا ہے...... اے لیلیٰ! تیرا دیوانہ کہتا ہے کہ بپت کا مارا لاج کرے تو کہاں تک کرے؟

۱۱۔ جدائی کا درد وصل سے جاتا ہے۔ ماتھے پر چندن لگانے سے نہیں جاتا۔ بیدجی مہاراج! اب آپ ہی بتلائیں کہ آپ کا روگی اچھا ہو تو کیوں کر ہو؟

۱۲۔ جنوں کا اب یہ عالم ہے کہ اُس کے بیان تک سے الجھن ہوتی ہے...... جس طرح بیراگی بن بن مارا پھرتا ہے، اُسی طرح اپنے پیارے کی جدائی میں ہم کو بھی کہیں چین نہیں۔

۱۳۔ اے پیارے! تجھ کو کوئی کس طرح سمجھاوے کہ تیری جادو بھری آنکھ کیسی قہر ہے، اِس بے چارے دل کو دیکھ اور اپنی تلوار کو دیکھ۔ اللہ رے تیری چتونوں کا غضب۔

۱۴۔ اے اللہ! یہ ہم نے رات سپنے میں کس کا درشن کیا ہے کہ اِس وقت دن دوپہر ہے مگر آنکھوں میں دنیا اندھیر ہو رہی ہے!

۱۵۔ اے چاہنے والوں کے دشمن! تو نے تو ہمارا باسن ہی پھوڑ دیا۔ دیکھ لے کہ جدائی کے پتھر سے دل کا شیشہ چور چور ہے یا نہیں!

۱۶۔ ایک دن اتفاقیہ اُس کے پاؤں کے نیچے ہمارا مدفن آگیا تو رحم اُس کو آہی گیا۔ کہنے لگا کہ قم باذنی! اب اُٹھ جا۔ اور ہاں اے شادؔ تو نے کس کے کارن اپنی جان گنوائی ہے؟

۱۷۔ النگ...... سبزہ زار۔

شہریور...... بھادوں کا مہینہ۔

انوشہ...... شاداں و خنداں۔

خوشہ... گیہوں کے کھیت میں ایک کنواری لڑکی ہے۔ داہنا ہاتھ کندھے تک۔ ہاتھ میں مٹھی بھر گیہوں کی

بالیاں، البیلی ایسی کہ پاؤں رکھتی کہیں اور پڑتا کہیں ہے۔ سرپچھم اُتر۔ پاؤں پورب دکھن!

اہلِ نجوم نے آسمان کو بارہ حصوں (بروج) میں تقسیم کیا ہے۔ ان بارہ برجوں میں چھٹے برج کا نام ایران میں سنبلہ رکھا گیا۔ سنبلہ بمعنی خوشۂ گندم۔ ہندوستان میں کنیا رکھا گیا۔ کنیا: کنواری لڑکی۔

اِس مصرعے میں خوشہ سے مراد برج سنبلہ یعنی کنیا ہے، اِس لیے انوشہ بخوشہ فروزندہ ہور، کا مطلب یہ ہوا کہ آفتاب برج سنبلہ میں ہے۔ یعنی سورج مہاراج ایک کنیا کے پھیرے میں آ گئے۔

ہور...... آفتاب۔

موبد...... جس طرح ہندوؤں میں پنڈت اُسی طرح پارسیوں میں موبد۔

بجشنی ...... پارسیوں کی کتاب وظائف۔

نسک...... سورہ۔

ژند...... صحیفۂ زردشت۔

[رسالہ ''ندیم'' گیا۔ بہار نمبر۔ ۱۹۳۵ء]

جلترنگ

ایک دن برہما اپنے آسمانی جھروکے پر بیٹھا ہوا بائیں ہاتھ سے اپنی داہنی کلائی مل رہا تھا کہ کلائی کا میل چٹکی میں آگیا۔ میل کی گولی اس نے جھروکے سے نیچے پھینک دی۔

گولی جب چکر کاٹتی ہوئی اور آسمانی چادروں میں چھید کرتی ہوئی، بلندی سے پستی میں آئی تو دیکھتی کیا ہے کہ پورب پچھم اتر دکھن، ہر طرف تلاطم ہے، گویا پانی کے ہزاروں پہاڑ آندھیوں کے ساتھ کبڈی کھیل رہے ہیں۔ یہ دیکھتے ہی گولی سمندر کی چھاتی سے جا لپٹی۔ اُس کا سمندر کی چھاتی سے جا لپٹنا بھی گویا مداری کا ایک تماشا تھا۔ تماشا یہ کہ برہما کی کلائی کا میل سمندر سے ملتے ہی آدم زاد ہوگیا۔

اُس آدم زاد نے سمندر کے تھپیڑوں میں آنکھ کھولی تو بے بسی میں چیخنے لگا۔ اُس کی فریاد سنتے ہی سمندر میں اُس کے پاس ہی ایک درخت نمودار ہوگیا اور آسمانی جھروکے سے برہما کی آواز آئی کہ:

> تنکا سمندر سے ڈرتا کیوں ہے؟ جو تنکے کا پالن ہار وہی سمندر کا پالن ہار۔ اے وہ جو پانی میں پیدا ہوا ہے، نام تیرا آج سے واسو

ہوا!... اے واسو! سمندر کی تختی پر پتوار کے قلم سے اِس بات کو
لکھ رکھ کہ پانی تیرے لیے ہے اور تو پانی کے لیے... اے واسو!
اِسی سے ناتا کرنا، اِسی پر مرنا، اسی سے لپٹنا، جیتے جی، مرتے دم،
ایک گود سے دوسری گوڈ تک!''

آسمانی آواز خاموش ہوگئی۔ واسو نے درخت پر پناہ لی، درخت نے ساحل کا رُخ کیا۔ واسو خشکی پر اترا، درخت کاٹ کر ایک ناؤ بنائی۔ ناؤ پانی میں چھوڑ دی اور کھینا شروع کیا۔ کیوں شروع کیا؟ اس لیے کہ قسمت کی تختی پر برہما نے پہلے ہی لکھ دیا تھا کہ پانی تیرے لیے ہے اور تو پانی کے لیے!

دنیا بھر کے ملاح آج تک واسو کی شاگردی کر رہے ہیں۔

چودھویں رات تھی، مہاندی کی بیٹی گریما نے واسو کو ناؤ کھیتے دیکھا تو اُس پر ریجھ گئی۔ ماں سے کہنے لگی کہ پریم ساگر سے نیوتا آیا ہے، اب کیا کہتی ہے؟ ماں نے کہا کہ پریم ساگر کی لہر سے بچی رہنا، یہ لہر کتنوں کو الوپ کر چکی ہے۔

چودھویں رات تھی، واسو نے مہاندی کی بیٹی گریما کو ناگن کی چال چلتے دیکھا تو اس پر ریجھ گیا۔ کہنے لگا کہ سن ری لہریا بنانے والی! تو میرے پاس آتی کاہے نہیں؟ اتنا کتراکے کاہے چلتی ہے؟... الھڑ نے جواب دیا کہ مہاندی تو یہی کہتی ہے کہ پریم ساگر کی لہر سے بچی رہنا، یہ لہر کتنوں کو الوپ کر چکی ہے۔

چودھویں رات تھی، واسو نے مہاندی سے کہا کہ پریم ساگر سے نیوتا آ ہی چکا تو اب اپنی بیٹی کو جانے کاہے نہیں دیتی؟... مہاندی نے رو کر کہا کہ ''کچی جامن ڈالی کی، پکی جامن اوروں کی... جامن جب تک کچی تھی تبھی تک ڈال سے اُس کا ناتا تھا، اسی طرح گریما کل تک میری تھی، آج سے تیری ہے''۔

یہ اُس پر کیوں ریجھی؟ وہ اس پر کیوں ریجھا؟ اِس کا جواب ہوتا رہے گا۔ پہلے کوئی یہ بتا دے کہ نیند آنکھوں میں کیوں آتی ہے؟ کاجل کی کوٹھڑی میں کیوں آتی ہے، بلی کے پاؤں کیوں آتی ہے؟ کواڑ بند کر کے کیوں آتی ہے؟ اجالا ہوتے ہی کیوں

بھاگتی ہے؟ چور کے پاؤں کیوں بھاگتی ہے؟ دونوں پٹ کھول کے کیوں بھاگتی ہے؟

کیا یہ راجا اندر کی جاسوس ہے؟ گھر گھر کا بھید لینے آتی ہے۔
کیا یہ پیالوں کی گاہک ہے؟ چوری چھپے لال پانی پینے آتی ہے۔
کیا یہ انتر منتر جادو ٹونا جانتی ہے؟ آنکھوں کا جادو جگانے آتی ہے۔
کیا یہ پرستان کی شہزادی ہے؟ موتی محل میں سونے آتی ہے۔
کیا یہ ہردوار کی جاتری ہے؟ رات کی رات دھرم شالا میں ٹھہر جاتی ہے۔
کیا یہ کوئی تماشا بیں ہے؟ پتلیوں کا تماشا دیکھنے آتی ہے۔
کیا یہ نین سکھ ہے؟ آنکھوں کا دکھ دور کرنے آتی ہے۔
کیا یہ واقعی جانِ عالم ہے؟ اسی لیے سب کی آنکھوں میں جگہ پاتی ہے۔
کیا یہ موت کی چھوٹی بہن ہے؟ حقیقت کی جھلک سب کو دکھانے آتی ہے۔
کیا یہ لکھا بیسوا کی طرح ہرجائی ہے؟ آجاری ندیا کی آواز پر دوڑی آتی ہے۔
کیا یہ نومن تیل والی رادھا ہے؟ پتلی گھر میں ناچنے آتی ہے۔
کیا یہ راج گیر والی چترلیکھا☆[1] ہے؟ دیکھی اور ان دیکھی تصویریں دکھانے آتی ہے۔

جو اِن سوالات کا جواب دے، وہی اس کا بھی جواب دے کہ مہاندی کی بیٹی واسو پر کیوں ریجھی اور واسو مہاندی کی بیٹی پر کیوں ریجھا۔

یہ اُس پر کیوں ریجھی؟ وہ اِس پر کیوں ریجھا؟ یہ مہاندی کی بیٹی، وہ سمندر کا بیٹا۔ دریا کی بیٹی سمندر کے بیٹے سے چاہ نہ کرتی تو کس سے کرتی! قسمت کی تختی پر پہلے ہی سے لکھا ہوا تھا کہ پانی تیرے لیے ہے اور تو پانی کے لیے، اِسی سے ناتا کرنا... اسی پر مرنا... یہ پانی کی رانی، وہ پانی کا راجا، رانی اپنے راجا کے پاس نہ جاتی تو کہاں جاتی؟

کنواریاں اپنے اپنے میکے سے سسرال جاتی ہیں، ندیاں بھی اپنے اپنے میکے سے سمندر کا راستہ پکڑتی ہیں۔ مہاندی کی بیٹی بھی اپنے سسرال گئی تو کون سی انوکھی بات ہوئی؟... مگر ہاں، کنواریوں کی رخصتی چمن سے بہار کی رخصتی ہے اور ندیوں کی رخصتی جسم سے روح کی رخصتی ہے... بہار جاتی ہے، ہنستی ہوئی۔ مطلب یہ ہے کہ

''کڑھنا مت ہم ابھی آئے''۔ روح جاتی ہے روتی ہوئی، مطلب یہ کہ ''اب کے بچھڑے ملیں گے حشر کے دن''... مگر یہ افسانہ بھی افسانۂ زلف کی طرح کنگھی کا محتاج ہے۔

(۱)

مشاطہ کی کنگھی کہتی ہے کہ من موہنی اپنی سکھیوں کے ساتھ میکے میں شطرنج کھیل رہی ہے، اُس کو کنواری مت کہیو، بیاہ ہو چکا ہے۔ اُس کو بیاہی مت کہیو، رخصتی باقی ہے۔ دیکھنے میں یہ تو آدھی کنواری آدھی بیاہی ہے مگر اس کو کیا کیجیے کہ پانی پت کے میدان کا پورا نقشہ یہ گھر بیٹھے تیار کر لیتی ہے۔

منشی ذکاء اللہ کا بیان ہے کہ پانی پت کی پہلی لڑائی بابر نے جیتی۔

مگر خود پانی پت والوں کا بیان ہے کہ پہلی لڑائی من موہنی نے جیتی اور وہ اِس طرح:

سن ری گوئیاں!
مجھ سے پیّاں پیّاں چلا نہیں جائے
پہلا پٹھا دن سسر جو آویں
سسر سے کہہ دے... بلیا مری جائے!

منشی ذکاء اللہ کا بیان ہے کہ پانی پت کی دوسری لڑائی ہمایوں نے جیتی۔

مگر خود پانی پت والوں کا بیان ہے کہ دوسری لڑائی بھی من موہنی نے جیتی اور وہ اس طرح:

سن ری گوئیاں:
مجھ سے پیّاں پیّاں چلا نہیں جائے!
دوسرا پٹھا دن جیٹھا جو آویں
جیٹھا سے کہہ دے... درپن میں منھ دیکھ آئیں!

منشی ذکاء اللہ کا بیان ہے کہ پانی پت کی تیسری لڑائی احمد شاہ ابدالی نے جیتی۔

مگر خود پانی پت والوں کا بیان ہے کہ تیسری لڑائی بھی من موہنی نے جیتی، اور وہ اِس طرح:

سن ری گوئیاں!

مجھ سے پیاں پیاں چلا نہیں جائے۔

تیسرا پٹھا دن سیاں جو آئیں

سیاں سے کہہ دے، ڈیوڑھی میں دھونی رمائیں۔

تین لڑائیاں اور تینوں سر، پہلے سسر آیا۔ اس کو اُلٹے پاؤں بھاگنا پڑا۔ پھر جیٹھ آیا، اُس کو حکم ہوا کہ آئینے میں اپنا منہ دیکھو۔ پھر شوہر آیا، اُس بدنصیب کو حکم ہوا کہ ابھی دھونی رماؤ۔ مطلب یہ کہ زلفوں کی کال کوٹھڑی میں بندھے ہوئے پڑے رہو۔

قیدی بے چارہ آج تک بندھا ہوا پڑا ہے اور زلفوں والی آج تک اپنے میکے میں بیٹھی ہوئی پانی پت کی چوتھی لڑائی کا نقشہ تیار کر رہی ہے۔ من موہنی کے سالار جنگ ہونے میں اب کسی کو کیا عذر ہوسکتا ہے؟ جو اُس کو نہ جانتا ہو وہ اب جان لے کہ یہ وہی شہر آشوب، عطر فتنہ اور آفت کا پرکالہ ہے جس کی شان میں غالبؔ کا مشہور قصیدہ ہے کہ... ''لڑتی ہے، اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں۔''

(۲)

مشاطہ کی کنگھی کہتی ہے کہ ایک دوسری سالار جنگ، لاڈلی بیگم نام، اپنے میکے سے رخصت ہوکر سسرال پہنچتی ہے تو بے نیازی کا یہ عالم کہ وہاں فرش کی جگہ اُس کے لیے آنکھیں بچھائی جاتی ہیں مگر وہ اپنے میکے کی باسی کھچڑی اور ٹوٹی چٹائیوں کو یاد کر کے ایک آنکھ ساون دوسری آنکھ بھادوں کرتی ہے۔ بھائی میکے سے آتا ہے تو فریاد کرتی ہے۔

''چونی رے بھوسی، برنا، روٹی پکے، میرے برنا، روٹی پکے۔ اس پرکالا ناگ رہے؟''

اے بھیا! اپنی بچھڑی بہن کا حال مت پوچھ، ایک تو کھانے کو چونی بھوسی کی روٹی ملتی ہے، اُس پر گھر بھر کی آنکھیں یہ دیکھتی رہتی ہیں کہ یہ کتنا کھاتی ہے؟ کھاتی

ہے یا پھینک دیتی ہے، باہر سے کچھ منگوا کر تو نہیں کھاتی؟ ماتھے پر شکن تو نہیں ہے، کسی سے دکھڑا آلے کے تو نہیں بیٹھی ہے... گویا ہر وقت ایک کالا ناگ خزانے پر بیٹھا رہتا ہے... تمھاری بہن کو ڈسنے کے لیے!

''باوا آگے، برنا، ماتی کہیو، میرے برنا، ماتی کہیو، بھیجن ڈولی کہار رے؟''

اے بھیا! یہ چونی بھوسی اور کالے ناگ کا قصہ باوا سے مت کہنا، مردوں کو اتنی تاب کہاں؟ دیکھ لینا کہ باوا غیظ میں آکر ڈولی کہار بھیج دیں گے اور اُس پر یہاں جو ہنگامہ ہوگا، وہ تم غریب کیا جانو۔

''میا آگے، برناماتی کہیو، میرے برنا، ماتی کہیو، رو دیں چھتین پھاڑ رے۔''

اے بھیا! یہ چونی بھوسی اور کالے ناگ کا قصہ اماں سے مت کہنا، ماں کی ممتا تم کیا جانو، دیکھ لینا کہ اماں اتنا روئیں گی کہ روتے روتے چھاتی پھٹ جائے گی۔

''بھابی آگے، برنا، ماتی کہیو، میرے برنا، ماتی کہیو، بولیں برہا بول رے۔''

اے بھیا! یہ چونی بھوسی اور کالے ناگ کا قصہ بھابی سے مت کہنا، دیکھ لینا مسجد میں طاق بھرنے جائیں گی، کہیں گی کہ سسرال میں تو اِس کو کوئی پوچھتا نہیں، اور میکے میں آتی ہے تو پدمنی کے کان کاٹتی ہے۔ تمھیں بتاؤ یہ زہر کا گھونٹ کس سے پیا جائے گا؟

بھائی یہ مرثیہ سنتا ہے تو بہن کو رخصت کرا کے اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ یہ کیوں کہو کہ لاڈلی بیگم میکے پہنچ گئی۔ یہ کیوں نہیں کہتے کہ مچھلی جال سے چھوٹ کر پھر پانی میں آگئی... پھر وہی باسی کھچڑی ہے، وہی ٹوٹی چٹائیاں ہیں، بھابی کے ترکش سے بے پناہ تیر بھی آتے ہیں۔ مگر یہ تیروں کی بوچھار نہیں، پھول برس رہے ہیں، میکے کے نمک میں کچھ ایسی مٹھاس ہوتی ہے کہ لاڈلی بیگم سسرال جانے کا نام نہیں لیتی اور جاتی بھی ہے تو وہاں اُس کو میکے کی یاد چین سے بیٹھنے نہیں دیتی۔ آج زکی کی بسم اللہ ہے، کل زکیہ کا بیاہ ہے، آج رَت جگا، کل ختنہ ہے۔ مختصر یہ کہ چونی بھوسی اور کالے ناگ کا قصہ بھی شہرزاد کی کہانیوں کی طرح نئے نئے روپ بدلتا ہے۔ لاڈلی بیگم کبھی میکے

سے سسرال جاتی ہے، کبھی سسرال سے میکے آتی ہے، سورج چھپتا ہے تو چاند نکلتا ہے، چاند چھپتا ہے تو سورج نکلتا ہے۔

یہ کہانی کنواریوں کی کہانی ہوئی، چمن اور بہار کی کہانی ہوئی۔ اب ندیوں کی کہانی یعنی جسم اور روح کی کہانی شروع ہوتی ہے۔

مشاطہ کی کنگھی کہتی ہے کہ ندیاں اپنے اپنے میکے میں اٹھلاتی، زمین کو ٹھکراتی اور اپنی پازیب کی جھنکار سے جادو جگاتی ہوئی چلتی ہیں تو تماشائی کہتے ہیں کہ یہ گنگا ہے، یہ جمنا ہے، یہ سوہن ہے، یہ مہاندی ہے، یہ گریما ہے، مگر یہی البیلیاں میکے سے جہاں رخصت ہوگئیں، پھر میکا دیکھنا ان کو نصیب نہیں ہوتا۔ سسرال کی قید بے زنجیر یعنی سمندر کی بھول بھلیاں اِن کو زندگی بھر بے نام و نشان رکھتی ہے اور میکے کا سراغ کسی طرح پانے نہیں دیتی۔

زہرِ عشق کی روایت ہے کہ تاجر کی لڑکی نے اپنے محبوب سے کہا تھا:

ہم جو مرجائیں تیری جان سے دور
جا کے رہنا نہ اِس مکان سے دور
روح بھٹکے گی گر نہ پائے گی
ڈھونڈنے کس طرف کو جائے گی

روح کی بے بسی کا جب یہ عالم ہے تو ندیاں بے چاری سمندر میں گم ہوکر اپنے میکے کا سراغ کس طرح پاسکتی ہیں۔

لوگ کہتے ہیں کہ موجیں ساحل سے ٹکراتی ہیں۔ یہ کیوں نہیں کہتے کہ میکے سے بچھڑی ہوئی لڑکیاں سسرال کی چوکھٹ پر سر پھوڑ رہی ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ سمندر میں تلاطم ہے، یہ کیوں نہیں کہتے کہ وہی حواس باختہ لڑکیاں دیوانگی کے دوش پر رقص کر رہی ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ سمندر کا جھاگ ہے، یہ کیوں نہیں کہتے کہ اِنھیں لڑکیوں کے منھ سے اب کف جاری ہے۔

غلطی ہائے مضامیں مت پوچھ
لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں

سمندر کا پانی بھاپ بن کر اُڑ گیا؟... نہیں، وہی لڑکیاں بھیس بدل کر اب نیچے سے اوپر گئی ہیں۔

آسمان پر روئی کے گالے سے اُڑ رہے ہیں؟... نہیں وہی لڑکیاں اب دیوانہ وار پھر رہی ہیں کہ میکے کی جھلک کہیں سے نصیب ہو جائے۔ بہکا، ہوا کبوتر بھی بلندی پر چکر لگاتا ہے۔

برسات آ گئی؟ نہیں، اِنھیں لڑکیوں نے میکے کے سوگ میں اب صفِ ماتم بچھائی ہے۔

کالی گھٹائیں ہیں؟ نہیں، اِنھیں سوگواروں کا یہ جھرمٹ ہے۔

آج گھٹاٹوپ ہے؟ نہیں، اِنھیں ماتم داروں نے آج زلفیں کھول دی ہیں۔

ساون بھادوں کی جھڑی ہے؟ نہیں، وہی سوگوار لڑکیاں اپنا کلیجا پانی کر رہی ہیں... زمین اِس پانی کا ایک قطرہ بھی ضائع نہیں کرتی، تبرک کی طرح اپنے خاندان میں بانٹ دیتی ہے۔ اِسی کی برکت ہے کہ ناپید پیدا اور مردہ زندہ ہو رہے ہیں۔ دشت کا دامن خالی تھا، اب پھولوں سے بھرا ہے۔ کھیتوں میں جو ہے وہ دھانی جوڑا پہنے جھوم رہا ہے۔

پانی نے یہ مسیحائی کہاں سے پائی؟ یہ پانی نہیں، آنسو ہے اور یہ آنسو اُن کے ہیں جو آج تک غم دیدہ ہیں، ستم کشیدہ ہیں، ہجراں نصیب ہیں، خانماں برباد ہیں، سیہ پوش ہیں، میکے کی سوگوار ہیں... ان باتوں کا جس کو یقین نہ ہو وہ اپنے چلّو میں آبِ باراں لے کر دیکھ لے، مہاندی کی بیٹی گریما آج تک رو رہی ہے۔ یہ اُسی کے آنسو ہیں۔ میکے سے رخصت ہو کر پھر جانا نصیب نہیں ہوا۔ یہ اسی کا رونا ہے۔

یادش بخیر یہ وہی گریما ہے جو البیلے پن میں ناگن کی چال مشق کر رہی تھی اور یہ وہی چال تھی جس پر واسو مرمٹا تھا، اور یہ وہی واسو ہے جو ایک دن سمندر کی چھاتی پر پیدا ہوا تھا اور یہ وہی سمندر ہے جس میں برہما نے اپنے جھروکے سے ہاتھ کا میل پھینک دیا تھا۔

(۳)

ایک دن کسی خاص رسم کے لیے ہرن کا گوشت درکار تھا اور واسو شکار کے لیے جنگل گیا تو دیکھتا کیا ہے کہ وہاں عشق کی داستان چھڑی ہوئی ہے اور ہرن ہرنی سے راز و نیاز کی باتیں کر رہا ہے:

ہرن: جگ بیت گئے تمہارے ملن کو — ہرنی: رہنے دے!

ہرن: تجھ بنا رہیو نہ جائے — ہرنی: رہنے دے!

ہرن: باورے من کو ناہیں چین! — ہرنی: رہنے دے!

ہرن: یہ دکھوا میں کا سے کہوں؟ — ہرنی: دت وت! میں تو تیری رے!

اِدھر واسو کی آنکھیں چاہت کی رنگینیاں دیکھ رہی تھیں، اُدھر تصور نے گریما کو چپکے سے واسو کے پہلو میں کھڑا کر دیا۔ تصور کی دلالی دنیا جانتی ہے:

یہ نیاز و ناز کی بات ہے، یہ حجاب و راز کی بات ہے
کہو تم کو قدؔر نے کیا دیا کہو تم نے قدؔر کو کیا دیا
(قدؔر بلگرامی)

واسو جنگل میں جہاں کھڑا تھا، وہیں سیالی کا ایک درخت تھا، واسو نے جھٹ ایک پتا توڑا، پتے میں کچھ رکھا، پھر پتے کو بند کیا، دیکھا کہ ایک چیل اُڑی جا رہی ہے، آواز دی کہ... ''چیل چیل، ذرا سنتی جا...''۔ چیل پاس آئی تو واسو نے کہا... ''ذرا میرا ایک کام کر دے، یہ پتا لے جا اور جھپٹی ہوئی چلی جا، میری گریما کو دے دیجیے کہ یہ خاص تیرے لیے ہے، وہ سمجھ جائے گی''... چیل واسو کی امانت لے کر اُڑی تو جاتے جاتے راستے میں دوسری چیل سے ملاقات ہوگئی۔ اُس دوسری چیل نے پتا دیکھا تو سمجھی کہ کھانے کی کوئی چیز ہے، اُس نے پتے پر چنگل مارا، پہلی چیل نے بچانا چاہا، اِس چھینا جھپٹی میں پتا دو ٹکڑے ہوگیا اور اس میں جو کچھ تھا وہ بلندی سے نیچے گر گیا۔ اتفاق یہ کہ نیچے ایک ندی بہ رہی تھی اور ندی میں ایک مچھلی منھ کھولے ہوئے تھی۔ چنانچہ ہوا میں پتا دو ٹکڑے ہوا تو پتے سے جو کچھ گرا، وہ اُسی مچھلی کے منھ میں آیا۔ اِس

طرح واسو کی امانت گریما تک نہیں پہنچ سکی بلکہ وہ امانت مچھلی نے پائی۔

اس واقعے کے چند ماہ بعد واسو کے پاس ایک مچھوا آیا اور تحفے میں ایک مچھلی پیش کی، مچھلی ہنسوے پر رکھی گئی تو اُس کے پیٹ سے آواز آئی کہ ''ذرا دیکھ کے''... اب دیکھا جاتا ہے تو مچھلی کے پیٹ میں ایک لڑکا ہے، ایک لڑکی ہے... واسو نے وہ لڑکا خود لے لیا اور لڑکی مچھوے کو دے دی۔ لڑکے کا نام جلترنگ رکھا اور لڑکی کا مستیا بتی... اب یہ بھید کھلا کہ ان دونوں چیلوں میں پتے کے لیے جو لڑائی ہوئی تھی، وہ کیوں ہوئی تھی۔

جھوٹ، جھوٹ، سب جھوٹ! ہرن کا ہرنی سے شکوہ کرنا جھوٹ، واسو کا چیل کو بلانا جھوٹ، چیل کا امانت لے کے اُڑنا جھوٹ، راستے میں ایک دوسری چیل کا پتے پر چنگل مارنا جھوٹ، یہ سب جھوٹ، یہ سب من گڑھت!... مگر کیا یہ بھی جھوٹ ہے کہ ہدہد سلیمانی بلقیس یمانی کے دربار میں سفیر بنا کر بھیجا گیا؟ کیا یہ بھی من گڑھت ہے کہ ایک چیونٹی نے اپنی منطق سے ایک پیغمبر تک کو لاجواب کردیا؟ کیا یہ بھی غلط ہے کہ ہمایوں کے دربار میں ایک طوطے نے رومی خاں کو ذلیل و رسوا کیا؟...

ا۔ مکے کے قریب طائف جس کے دکھن وادیِ نمل یعنی چیونٹیوں کا جنگل ہے، ایک دن حضرت سلیمانؑ اپنی بساط پر ہوائی سفر کرتے ہوئے وادئ نمل میں اُترے تو روایت ہے کہ سمندر نام، چیونٹیوں کی ملکہ نے اپنی رعایا کو حکم دیا کہ... ''اری دیوانیو! دیکھتی نہیں کہ یہاں سلیمان کی فوج اتری ہوئی ہے، اِس میدان سے جلدی بھاگو اور اپنے تہ خانوں میں جاکر چپکی بیٹھ رہو، ورنہ سلیمانی فوج ہر طرف پھیلی ہوئی ہے اور تمھاری خیریت نہیں''۔ حضرت سلیمان نے یہ بات سنی تو چیونٹیوں کی ملکہ سمندر کو اپنے پاس بلایا، اپنی ہتھیلی پر بٹھایا اور پوچھا کہ تیری حکومت کتنی چیونٹیوں پر ہے؟ سمندر ملکہ نے کہا کہ ایک ارب اور ساٹھ کروڑ۔ اِن میں چالیس ہزار شہزادیاں ہیں اور ہر شہزادی کے پاس چالیس ہزار باندیاں۔ حضرت نے تبسم فرمایا اور پوچھا کہ اچھا یہ بتا کہ بادشاہی میری بہتر ہے یا تیری؟ ملکہ نے کہا ''میری''... حضرت نے پوچھا کیوں کر؟... ملکہ سمندر

نے کہا کہ تقصیر معاف ہو تو بندی اِس کا جواب دے۔ حضرت نے اجازت دی، تب ملکہ نے کہا: حضور کا نام سلیمان ہے اور سلیمان بمعنی ''اپنے دل کو دنیا میں مت اُلجھا'' پھر بھی حضور نے اللہ سے دعا کی تھی کہ:

''خدایا تو ہم کو ایسی سلطنت دے کہ پھر ویسی کسی کو نصیب نہ ہو''۔

چھوٹا منھ اور بڑی بات ہے، مگر حضور نے اللہ کا ہاتھ کیوں روکا؟ جیتے جی نہیں بلکہ حضور کے بعد اگر اللہ کسی اور کو بھی ایسی ہی سلطنت عطا فرمائے تو اُس میں حضور کیوں چیں بہ جبیں ہوں؟

''خدایا ہم کو ایسی انگشتری دے جس کے زیرِنگیں سارا جہان ہو''۔

چھوٹا منھ اور بڑی بات ہے، مگر اِس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ترازو کے ایک پلّے میں سلیمان کی سلطنت اور دوسرے پلے میں ایک نگین یعنی سنگ ریزہ، پھر بھی سنگ ریزے کا پلّہ بھاری رہا، یعنی سلطنت سلیمانی کی قیمت ایک پتھر کے ٹکڑے سے بھی کم ٹھہری۔

''خدایا تو ہوا کو ہمارے بس میں کردے!''

چھوٹا منھ اور بڑی بات ہے، مگر باد محکوم ہے اور سلیمان حاکم، تو مطلب اِس کا یہ ہوا کہ سلیمان کی سلطنت برباد ہے، ہوائی قلعہ ہے، بے بنیاد ہے، برباد ہے۔

باقی رہا یہ سوال کہ بادشاہی سلیمان کی بہتر ہے یا چیونٹی کی تو پھر عرض ہے کہ چیونٹی کی۔ ثبوت یہ ہے کہ:

ہوا بساط کو اٹھائے ہوئے ہے، بساط تخت کو اٹھائے ہوئے ہے، تخت سلیمان کو اٹھائے ہوئے ہے اور سلیمان چیونٹی کو اٹھائے ہوئے ہے... اِس طرح چیونٹی کی بادشاہی بہتر ہوئی سلیمان کی بادشاہی سے، زیر زیر ہے، زبر زبر ہے''۔

۲۔ سلطان بہادر، ملک گجرات کا بادشاہ تھا، اور رومی خاں اُس کی فوج کا میرآتش تھا۔ بادشاہ کے پاس ایک طوطا تھا جو آدمی کی طرح باتیں کرتا تھا اور سمجھ کر بات کا جواب دیتا تھا۔ سلطان بہادر اُس کو سونے کے پنجرے میں ہمیشہ اپنے پاس رکھتا

تھا... ہمایوں بادشاہ نے گجرات پر حملہ کیا اور جاپانیر قلعے کا محاصرہ کیا تو رومی خاں میر آتش اپنے آقا سے ٹوٹ کر ہمایوں سے مل گیا۔ گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے... قلعہ فتح ہوگیا۔ سلطان بہادر کو شکست ہوئی۔ اِس خوشی میں ہمایوں نے دربار کیا، دربار میں رومی خاں روسیہ پیش پیش تھا۔ لوٹ کا مال دربار میں پیش ہوا تو سونے کا پنجرہ بھی تھا، جس میں وہ طوطا تھا۔ طوطے نے رومی خاں کو دیکھا تو غیظ میں للکارا:

''پھٹ پاپی! رومی خاں نمک حرام۔''

غدار رومی خاں نے شرم سے آنکھیں نیچی کرلیں کیونکہ جس کو دنیا طوطا چشم کہتی ہے، وہی وفادار نکلا اور جس سے وفا کی امید تھی، وہی نمک حرام نکلا۔ آخر ہمایوں کو کہنا پڑا...

''رومی خاں! چہ کنم کہ جانور است ورنہ زبانش می بریدم''... یعنی افسوس یہی ہے کہ یہ طوطا ہے اگر آدمی ہوتا تو اِس کی زبان کھینچ لی جاتی''۔ (آبِ حیات، ص۱۸۔۱۹)

جب طوطا یہ کرسکتا ہے اور چیونٹی یہ کرسکتی ہے تو پھر واسو کی چیل نے کیا قصور کیا ہے؟... باقی رہا مچھلی کے پیٹ سے جلترنگ اور ستیابتی کا پیدا ہوجانا، تو یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ اچنبھے کی بات یہ ہے کہ:

۱۔ پتھر سے پتھر ٹکراتا ہے تو آگ نکلتی ہے اور پانی سے پانی ٹکراتا ہے تو بجلیاں کوندتی ہیں۔ پتھر سے آگ اور بادل سے بجلی کیسی؟

۲۔ رات کالی کلوٹی ہے، حبشن ہے، کالی مائی ہے مگر اس کلوٹیا کو دیکھو اور اس کی گود میں مہتاب چند اور آفتاب چند کا کھیلنا دیکھو۔ ایک شام سے صبح تک کھیلتا ہے، دوسرا صبح سے شام تک کھیلتا ہے۔ ایک پچھم دروازے سے آتا ہے۔ دوسرا پورب دروازے سے آتا ہے۔ دونوں ساتھ نہیں آتے کہ کہیں کسی کی نظر نہ لگ جائے۔ حبشن کے دو لال، دونوں لاجواب، حسن کا یہ عالم کہ آنگن سے کوٹھے تک نور ہی نور ہے۔

زمیں کا طبق، آسماں کا طبق
سنہرے روپہلے ہوں جیسے ورق
(میر حسن)

۳۔ تونبی اجگر تک کو موہ لیتی ہے، گدھا چیختا ہے تو مار کھاتا ہے، آواز آواز دونوں ایک، تونبی کے منہ سے ایسی کیوں نکلی؟ گدھے کے منہ سے ویسی کیوں نکلی؟

۴۔ سبزی سے سپیدی، سپیدی سے لالی، گھاس سے دودھ، دودھ سے خون!

۵۔ وہی پانی جو سیپ کا منہ موتی سے بھرتا ہے، سانپ کی تھیلی زہر سے بھرتا ہے۔

جب مداری کا پیشہ یہی ٹھہرا تو اس نے مچھلی کے پیٹ میں کسی یونس کو زندہ رکھا یا مچھلی کے پیٹ سے کسی جلترنگ و ستیابتی کو پیدا کر دیا، تو اس قدر اچنبھا کیوں ہے؟

نہد لعل و فیروزہ در صلب سنگ
گل لعل در شاخ فیروزہ رنگ

(سعدیؔ)

(۴)

جلترنگ کی بہن ستیابتی مچھوے کی بیٹی بن کر مچھوے کے گھر رہنے لگی اور کچھ سے کچھ ہوگئی۔ مچھوا ندی میں جال ڈالنے جاتا تو یہ بھی ساتھ لگتی، اور گھاٹ پر ناؤ کھینے جاتا تو یہ بھی ساتھ رہتی، ہر کام میں اُس کا ہاتھ بٹاتی اور سائے کی طرح ساتھ پھرتی... آٹھ ہی برس کی عمر میں اتنی مشاق ہوگئی کہ اس کے ناؤ کھینے کی ادا دیکھ کر راہی بٹوہی کہتے کہ سچ ہے، پانی کو بہنا اور ہوا کو چلنا کون سکھلائے!

مچھوا ایک دن بیمار پڑ گیا۔ اس لیے ستیابتی گھاٹ کا کام سنبھالنے گئی۔ دیکھا کہ گھاٹ پر ''پراسرمنی'' ناؤ کے انتظار میں کھڑا ہے۔ ستیابتی پاس پہنچی تو مُنی نے اُس سے کہا: بچی ہم کو اُس پار جانا ہے۔

ستیابتی: جانا ہے تو پہلے بابو جی کو اچھا کر دیجیے۔

پراسرمنی: جا کہہ دیا اچھا ہوگیا، اچھا ہی رہے گا۔

ستیابتی: مہاراج کی دیا جگ جگ رہے۔

پراسرمنی: ہاں جگ جگ رہے گی، اب ہم کو ناؤ پر آنے دے۔

ستیاپتی: جوگی جی! دیکھیے ناؤ ڈول رہی ہے، ذرا گوں سے بیٹھیے گا۔

پراسرمنی: اے سندری! ناؤ کو جھولا جھولنے دے، تو ہمارے پاس چلی آ۔

ستیاپتی: کاہے کو؟

پراسرمنی: اے کامنی! ہم تجھ کو ایک بیٹا دیں گے۔

ستیاپتی: ہم مورکھ اَن جان بیٹا بیٹی کیا جانیں؟

پراسرمنی: اے ٹھٹھولی، اِدھر آجا۔

ستیاپتی: گوسائیں جی! ہم کو ناؤ کھینے دیجیے۔

پراسرمنی: اے چندر جوتی تیرا بیٹا، سورج مکھی ہوگا، بڑا گُنی، بڑا گیانی، وید اور شاستر کو جگ میں اُجاگر کرنے والا... بول اے مدھ ماتی، اب کیا بولتی ہے؟

ستیاپتی: ہم یہی بولتے ہیں کہ مچھوے کی بیٹی مدھ ماتی نہیں ہوسکتی، اُس کے پاس مچھلی کی بسا ہند چھوڑ کے مدھ کہاں سے آیا؟

پراسرمنی: اے کنول روپی، مچھلی کی بسا ہند تیرے پاس اب پھٹک نہیں سکتی، آج سے تو چندن رانی ہے، کستوری رانی ہے، تیری باس آٹھ کوس تک جائے گی، اِس لیے آج سے تو جوجن گندھا ہے، بول اے چندن روپی! اب کیا بولتی ہے۔

ستیاپتی: ہم یہی بولتے ہیں کہ مچھوے کی بیٹی چندن رانی اور کستوری رانی ہوگئی اور اُس کی لپٹ آٹھ کوس تک جاتی ہے تو اُس سے جوگی مہاراج کو کون کام؟... ہم کو تو ابھی سات برس بھر کے آٹھواں لگا ہے۔

پراسرمنی: اے الھڑ انیلی! تیرا آٹھواں برس تیرے پاس اب ہے کہاں؟ اُس کو تو ایک کالا چور ابھی ابھی چرا لے گیا۔ لے گیا تو جانے دے، آٹھ اور آٹھ سولہ، ہم سے سولھواں برس لے لے، بول اے البیلی! اب کیا بولتی ہے؟

ستیاپتی: ہم یہی بولتے ہیں کہ اتنے بڑے مہاتما گیانی کو مچھوے کی بیٹی سے لاج کاہے نہیں آتی؟

پراسرمنی: اے لجیلی! لاج کی بات پھر پوچھیے، پہلے یہ بتلا دے کہ چندن تیری مانگ

سے کیا کہتا ہے؟

ستیا بتی: کہتا ہے، اینڈی بینڈی چال کبھی مت چلنا، یہ چال ناگن کی ہے۔ ناگن مرتی ہے چندن پر اور چندن مرتا ہے سہاگن کی مانگ پر۔ ناگن سہاگن سے ڈاہ کرتی ہے... ناگن ہاری کیسے؟ وہی بانکی ترچھی چالوں سے! سہاگن جیتی کیسے؟ وہی اپنی سیدھی مانگ سے! جب ایسا ہے تو مہاراج تم کاہے ہم کو جُل دیتے ہو؟ کاہے ایسی اَٹ پَٹ چال سکھلاتے ہو؟

پراسرمنی: اے من بسنی! اَٹ پَٹ کی بات پھر پوچھیے۔ پہلے یہ بتلادے کہ کستوری تیرے بالوں سے کیا کہتی ہے؟

ستیا بتی: کہتی ہے کہ کنویں کی رسّی بننا، پھانسی کی رسّی مت بننا۔ جب ایسا ہے تو مہاراج! کاہے ہم سے ایسا بیوہار کرتے ہو! کاہے اپنے گلے میں کالی ڈوری کا پھندا دیتے ہو؟

ہے پران ناتھ! ہماری ایک بنتی سن لو، اَماوَس کی رات میں آنکھ موند کے مت چلو۔

پراسرمنی: اے کالی ڈوری! پھانسی کی بات پھر پوچھیے۔ پہلے یہ بتلادے کہ سولھواں برس تیری آنکھوں سے کیا کہتا ہے۔

ستیا بتی: کہتا ہے کہ ندی کے اُس پار اُس پار بڑا جمگھٹ ہے، لوگ دیکھتے ہوں گے تو کیا کہتے ہوں گے؟

پراسرمنی: اے جگت رانی! کہرا ابھی آجائے گا، وہی ناؤ کے چاروں کھونٹ پہرا دے گا۔

چل رے کہرے! جھٹ پٹ آ، جگت رانی بلاتی ہے

سن رے کہرے اپنا کمل تان، جگت رانی لجاتی ہے

ندی کے اس پار اُس پار جمگھٹ ہے تو ہونے دے، کہرے کا چوکی پہرا بیٹھ گیا۔ ناؤ الوپ ہوگئی، ہم دونوں کو اب کوئی دیکھ نہیں سکتا۔ بول اے سوبھنی! اب کیا بولتی ہے؟

ستیا بتی: ہم کو یہ سب جھنجٹ اچھا نہیں لگتا۔

پراسرمنی: اے من موہنی! تیری آنکھیں تجھ کو جھٹلاتی ہیں۔

ستیابتی: مہاراج، تم ہو بڑے سیانے!

پراسرمنی: جے پانڈے جی کی پوتھی میں ہے پنڈیائن...

ستیابتی: کے انچلے میں؟... جھوٹ، جھوٹ، سب جھوٹ، تو اپنی چترائی رہنے دے۔

پراسرمنی: یہی تو تیری چترائی ہے!

ستیابتی: ہائے بھنورے! اب بھن بھن مت کر۔

پراسرمنی: اے بھنوری! پریم کی بنسی سہاون ہے۔

ستیابتی: ہونے دے۔

پراسرمنی: اے جوہی! تو سنتی کاہے نہیں؟

ستیابتی: رے بھنورے! تو جاتا کاہے نہیں!

پراسرمنی: سن ری چنبیلی! پریم نگر میں آنا... سن ری سیوتی اور پریم نگر میں رہنا... سن ری کیتکی! اور پریم نگر سے جانا... سن ری کمودنی! اپنے بس کی بات نہیں۔

ستیابتی: کاہے اپنے بس کی بات نہیں؟

پراسرمنی: یہ مت پوچھ:

پیت دکھائے کیا کیا رنگ

جل گیا جیوڑا جل گیا انگ

ستیابتی: ارے تو چھ جانتا ہے، پانچ نہیں جانتا ہے، پیت جانتا ہے، رنگ جانتا ہے، جیوڑا جانتا ہے، انگ جانتا ہے، سب جانتا ہے، یہ نہیں جانتا کہ:

جلا جو دیوا جلا پتنگ

جل گئی رانی راجا سنگ

مچھوے کی بیٹی کا پکھراج پری ہوجانا کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ اچنبھے کی بات یہ ہے کہ چولھے کا توا بھی ہنستا ہے اور کان میں بھی ہیرے کا چراغ جلتا ہے... آٹھ برس کی چھوئی موئی کا یکایک سولہ برس کی البیلی ہوجانا کوئی تعجب کی بات نہیں۔

تعجب کی بات یہ ہے بیر بہوٹی جب شہانا جوڑا پہنے ہوئے سبزہ زار میں پہلی مجلس کی چال چلتی ہے تو شہزادیاں تک رشک کرتی ہیں... پوچھتی ہیں کہ ایسی نستعلیق چال اِس فتنی نے سیکھی کس سے؟ اور وہ رنگ ریز آخر کس ملک، کس شہر، کس محلے کا رہنے والا ہے جس نے اپنی چہیتی کی ایک ناخن بھر کی پشواز رنگنے کے لیے دنیا بھر کی دلہنوں کا شباب لوٹ لیا؟

پراسر کے ایسے رِشی مہاتما نے ایک مچھوے کی بیٹی کو تاکا تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ کجلوٹی کی آؤ بھگت سب سے زیادہ مہ جبینوں کی بستی میں ہوتی ہے۔

نین کاجر پائی کے، کاڑھے باندھے کیس
ہاتھن مہندی لائی کے، باگھنی کھایا دیس

یعنی آنکھوں کا کاجل، سر کا جوڑا، ہاتھوں کی منہدی، اِن تینوں سے دنیا تین تیرہ ہے، جوڑا کبھی وہ باندھتی ہے، کبھی کھولتی ہے، کھولتی ہے تو شکار آ پھنستا ہے، باندھتی ہے تو قیدی گھٹ گھٹ کے مرجاتا ہے، باقی رہا کاجل، تو کاجل کی بات ہی اور ہے۔

نہ دو باڑھ اگر تم، اجل کی چھری کو
نسب اس کا تیغِ نظر تک نہ پہنچے
(منیؔر شکوہ آبادی)

کاجل اور زلفوں والی دراصل باگھنی ہے، چاہت کے دیس کی، اُس کے ہاتھوں میں مہندی کی لالی نہیں، اِس باگھنی نے جن کو پھاڑ کھایا ہے، اُنھیں کے خون سے اُس کی ہتھیلیاں لال ہیں۔

پراسر کے ایسے جوگی مہاتما نے ایک مچھوے کی بیٹی کو چاہا تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ محبت کے بازار میں ترازو نہیں ہوتی۔ سیر ادھ سیرہ نہیں ہوتا، بھاؤ پوچھو تو سب دھان بائیس پنسیری۔ مطلب یہ کہ دھان دھان سب برابر، مہین اور موٹا کہنے کی باتیں ہیں۔ یہاں حبشن گرجن ہے اور گرجن حبشن، آنکھ جس کو

پسند کرلے وہی پدمنی ہے:

اندریں راہ فلاں بنتِ فلاں چیزے نیست!

کل تک جو نجبہ ڈومنی تھی آج حور محل ہے، جو پیاری ڈومنی تھی آج ملکۂ ملک تاج النسا ہے۔ آنکھ جس کو پسند کرلے وہی آسمان کا تارا ہے۔ نواب ملکۂ زمانی کون تھی، ذات کی کرمن، نام دلاری، فتح مراد کی زرخرید لونڈی۔ کس کو معلوم کہ شاہ پسند چُننی کہاں ملتی ہے اور کہاں نہیں ملتی۔ چمن کو کیا معلوم کہ کلیاں کھل کر کہاں جائیں گی اور کس کے گلے کا ہار ہوں گی۔

شاہ اودھ نصیر الدین حیدر دوپہر کو اپنے محل میں سو رہا ہے، آنکھ کھلتی ہے تو پیاس معلوم ہوتی ہے، ایک کنیز پانی لے کر حاضر ہوتی ہے، بادشاہ کٹورا ہاتھ میں لیتا ہے، پانی پیتا ہے اور چند قطرے کنیز کے منھ پر چھڑک دیتا ہے۔ کنیز ایک بھرا کٹورا بادشاہ کے منھ پر اُچھل دیتی ہے۔ اُس پر بادشاہ غیظ میں پوچھتا ہے... ''تو اور میرے منھ پر پانی پھینکے؟''... کنیز کہتی ہے: ''مگر پہل تم نے کی!'' بادشاہ کہتا ہے: ''مگر کھیل کی سند نہیں''۔ کنیز کہتی ہے: ''کیا خوب! کھیل کا اقرار ہے تو پھر کھیل میں شاہی اور کنیزی کیسی؟ چوں عاشقی و معشوقی درمیان آمد، مالکی و مملوکی برخاست!

اِس صغریٰ اور کبریٰ کے بعد شاہ نصیرالدین حیدر اپنی تیغ جلال و شمشیر غضب کو نیام نہ کرتا تو کیا کرتا؟ اور جس کنیز کی شمشیر ادا، اِتنی آب دار اور سیفِ زبان، اتنی جوہر دار ہو وہ نواب قدسیہ بیگم بن کر شاہی سیج پر نہ سوتی تو کیا ٹاٹ پر سوتی؟

محبت کے بازار کا یہی سبھاؤ دیکھا کہ لاکھ جتن کرو کچھ نہیں ملتا، اور کچھ نہ کرو سب کچھ مل جاتا ہے۔ یہی وہ چوراہا ہے جہاں صدقے کا کوا چھوڑا جاتا ہے، پہلا کوا سمرقند، دوسرا کوا بخارا اور صدقہ کرنے والا حافظ شیرازی... جب بیوہار کی صورت یہ ہے تو اس پاگل خانے میں، اس جادو گھر میں، اِس کام روپ کمکھیا میں کسی کو یہ پوچھنے کا حق نہیں ہے کہ ایک مچھوے کی بیٹی پر پراسرمنی کے ایسا مہاتما کیوں مرمٹا:

محبت میں، ترے سر کی قسم، ایسا بھی ہوتا ہے

اور اُس مہاتما نے مچھوے کی بیٹی سے کچھ جھوٹ نہیں کہا تھا کہ ہم تجھ کو ایسا بیٹا دیں گے جو سورج مکھی ہوگا۔ وہ سورج مکھی بیاس جی ہے، مہابھارت جس کی یادگار، اور باپ جس کا پراسرمنی اور ماں جس کی ستیاوتی عرف جوجن گندھا اور ماموں جس کا جلترنگ۔

(۵)

ستیاوتی کا بھائی جلترنگ خود واسو کے گھر پلا اور بڑھا۔ اُن دنوں سمندر کے دیوتا برونا کے خلاف جابجا سازشیں ہورہی تھیں۔ ان باغیوں کا سردار جل تورنگ تھا، جل تورنگ۔ دریائی گھوڑا۔ اس بغاوت کی خبر جلترنگ نے برونا کو پہنچا دی، جل تورنگ دریائی گھوڑا تھا تو جلترنگ دریا کی موج تھا۔ دریائی گھوڑا ابھی راستے ہی میں تھا کہ سمندر کی لہر نے آگے بڑھ کر برونا کو خبر کردی کہ ''مہاراج دشمن سر پر ہے''... دشمن پہنچا تو برونا مقابلے کے لیے تیار تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جل تورنگ کو شکست ہوئی اور دیوتا نے اپنی سواری کا گھوڑا جلترنگ کو انعام کیا... دیوتا کا دیا ہوا گھوڑا جلترنگ کے پاس رہا، لیکن جلترنگ مرگیا تو اس کے بیٹوں میں اِس گھوڑے کے لیے لڑائی ہوگئی۔ جلترنگ کے تین بیٹے، دو رانی سے، تیسرا داسی سے۔ داسی کا بیٹا گھر سے نکال دیا گیا، اِس لیے باپ کا ترکہ صرف دو بیٹوں نے پایا، مگر تقسیم کے وقت اس گھوڑے کی باری آئی تو ہیرا ایک اور گاہک دو، جلترنگ کے دونوں بیٹوں میں اِس خاص گھوڑے کے لیے جھگڑا ہوگیا۔ دونوں نے گھوڑے کو اپنی اپنی طرف کھینچا، اِس کھینچ تان میں گھوڑا مرگیا، لیکن اِس طرح کہ گھوڑے کا سر ایک کے ہاتھ میں رہ گیا اور باقی دھڑ دوسرے کے ہاتھ میں۔ لڑنے والوں نے گھوڑے کا یہ انجام دیکھا تو دونوں روتے پیٹتے نارومنی کے پاس پہنچے اور فریاد کی کہ ہم سے بڑی نادانی ہوئی، مگر اے داناؤں کے دانا! مردہ گھوڑے کو زندہ کردینا تیرے لیے کون سی بڑی بات ہے۔ نارومنی نے کہا کہ جیسی کرنی ویسی بھرنی، سمندر کی امانت سمندر کو سونپ دو، اور پانی نہیں ملتا تو پیاس اپنی ''اوس'' سے بجھاؤ۔ دونوں نے فریاد کی کہ مہاگرو کی پہیلی کون بوجھے!... نارومنی نے کہا کہ...

''گھوڑے کی لاش پانی میں بہادو، اُس کے بدلے میں ہم سے ایک کاٹھ کا گھوڑا اور ایک اوکھلی لے لو، کاٹھ کا گھوڑا اس کا ہوگا جس کے ہاتھ میں گھوڑے کا سر ہے اور اوکھلی اُس کی ہوگی جس کے قبضے میں باقی دھڑ ہے''... اِس فیصلے کا کیا کہنا! آگ بھی خوش پانی بھی خوش۔ بڑا بھائی سمجھا کہ جیت ہماری ہوئی جبھی تو ہم کو کاٹھ کا گھوڑا ملا ہے۔ منجھلا بھائی سمجھا کہ جیت ہماری ہوئی جبھی تو ہم کو اوکھلی ملی۔ اوکھلی سے مراد گھوڑے کا دھڑ۔ اِس طرح جس نے گھوڑے کا دھڑ پایا، اُس نے دراصل گھوڑا پایا۔

(۶)

جلترنگ کے تین بیٹوں سے اُڑیسہ میں مچھووں کی تین ذاتیں ہوئیں، بڑے بیٹے کی نسل سے سیولی، منجھلے بیٹے کی نسل سے نیالی، چھوٹے بیٹے کی نسل سے گوکھا۔

بڑے بیٹے نے نارومنی سے کاٹھ کا گھوڑا پایا تھا، اِس حق سے سیولی آج تک کاٹھ کا گھوڑا بناتا ہے اور ہر سال چیت پورنیما میں ایک جشن مناتا ہے۔ اِس جشن میں گھوڑوں کا ناچ ہوتا ہے، اِس لیے جشن کا نام ''گھوڑا ناچ'' ہے۔

منجھلے بیٹے نے نارومنی سے اوکھلی پائی تھی، اِس لیے نیالی آج تک اوکھلی میں چوڑا کوٹتا ہے اور کاٹھ کا گھوڑا نہیں بنا سکتا۔

چھوٹا بٹیا جو جلترنگ کی داسی کے پیٹ سے تھا، ذات سے نکال دیا گیا تھا اور اپنے باپ کے ترکے سے محروم کر دیا گیا تھا، اِس لیے گوکھا آج تک اچھوت ہے۔ نہ اوکھلی اُس کی، نہ کاٹھ کا گھوڑا اُس کا۔ وہ اچھوت کی زندگی گزارتا ہے اور صرف گڈھوں اور چھوٹے چھوٹے نالوں سے مچھلیاں پکڑ سکتا ہے۔ مچھلیوں کے لیے جال وہ نہیں بنا سکتا، اور ندیوں میں جال ڈالنے کا اس کو کوئی حق نہیں۔ رواج اور قانون کی رُو سے صرف سیولی اور نیالی دریا میں جال ڈال سکتے ہیں اور اِسی حق سے یہ دونوں اپنے آپ کو جالیا کہتے ہیں۔ جالیا یعنی جال رکھنے والا اور ندی میں جال ڈالنے والا... جس طرح تاجروں میں سیٹھ اور زمیں داروں میں فیل نشیں، اُسی طرح اوڑیسہ کے مچھووں میں جالیا۔ جس کے پاس جتنے جال ہوں گے، اتنا ہی وہ دولت مند ہوگا۔

مچھوؤں کا قومی جشن ''گھوڑا ناچ'' ہے۔ اِس جشن کے لیے بانس کی تیلیوں کا گھوڑا بنایا جاتا ہے، اِس طرح کہ (۱) چہرے اور گردن میں تیلیوں کے بدلے لکڑی استعمال ہوتی ہے۔ (۲) باقی دھڑ تیلیوں کا، لیکن پاؤں نہیں ہوتے۔ (۳) جس طرح انگوٹھی بیچ سے خالی رہتی ہے، اُسی طرح سوار کے بیٹھنے کی جگہ بیچ سے خالی رہتی ہے، اس جگہ تیلیاں نہیں ہوتیں۔ (۴) جس طرح انگوٹھی انگلی میں پہنی جاتی ہے، اُسی طرح مچھوا اپنے سر سے تیلیوں کا گھوڑا کمر تک اتار لیتا ہے اور وہ کمر سے آگے نہیں بڑھتا، جس طرح انگوٹھی انگلی میں اٹک جاتی ہے۔ (۵) مچھوا اپنے جسم کو کمر سے پاؤں تک چھپالیتا ہے۔ (۶) مچھوا ناچتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ گھوڑا ناچ رہا ہے اور گھوڑے کی پیٹھ پر مچھوا سوار ہے۔

چیت پورنیما کے ایک دن پہلے گاؤں گاؤں مچھلیاں تقسیم ہوتی ہیں، گھر پیچھے ایک مچھلی۔ یہ اعلان ہے اِس بات کا کہ آج شام سے گھوڑا ناچ ہوگا۔ اب جشن شروع ہوتا ہے۔ سیولی اپنے مصنوعی گھوڑے پر سوار ہے، گھوڑا ناچ رہا ہے، تماشائیوں کا ہجوم ہے، شہنائی ہے، تاشہ ہے، ڈھول ہے، مجیرا ہے، ہنسی ہے، شور ہے، ہنگامہ ہے، بچے ہیں، جوان ہیں، بوڑھے ہیں، شوہر والیاں ہیں، کنواریاں ہیں... اِس انبوہ کو دیکھ کر سیولی گھوڑے کی پیٹھ پر اور اکڑ جاتا ہے۔ کہتا ہے کہ:

''ہمارا گھوڑا جلترنگ کا گھوڑا ہے۔ اگر کسی اور کے پاس جلترنگ کا گھوڑا ہو تو وہ ہمارے سامنے آئے۔ جلترنگ کی گدی پر جس کو بیٹھنے کا دعویٰ ہے، وہ اِس میدان میں آئے۔''

تب نیالی سامنے آتا ہے، کہتا ہے کہ ہوش کی باتیں کر، تیری ماں ہماری ماں، تیرا باپ ہمارا باپ، پھر یہ گھوڑا صرف تیرا کیوں کر ہوسکتا ہے، جو حق تیرا وہی حق ہمارا۔ اِس پر دونوں بھائیوں میں جھگڑا ہوتا ہے۔

اتنے میں تیسرا بھائی میدان میں آتا ہے یہ گوکھا ہے، داسی کا جنا، یہ ترکے سے محروم ہے۔ ذات سے نکالا ہوا ہے، چٹائی سے باہر۔ یہ میدان میں آتا ہے تو قیامت

آتی ہے۔ اِس کے سینے میں ہزاروں برس کی آگ ہے، جو آج تک بجھی نہیں۔ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ جلترنگ تم دونوں کی ماں کو نہیں چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا صرف ہماری ماں کو۔ ''جس کو پی چاہے وہی سہاگن'' اِس حق سے جلترنگ کا گھوڑا ہمارا ہے اور ہمیں کو ملنا چاہیے۔ سیولی کا قبضہ ناجائز ہے۔ سیولی دغاباز ہے، ڈاکو ہے، بے حیا ہے، نکٹا ہے، پھر بھی کہتا ہے کہ ہماری ناک اونچی ہے اور پھر بھی گھوڑے کی پیٹھ پر اکڑتا ہے۔ بات یہ ہے کہ سیولی خود جھوٹا ہے، اس کا دعویٰ جھوٹا اور اس دنیا میں جھوٹ ہی کا راج ہے، اس کا حال ہم سے پوچھو:

گوکھا:

چوہا توڑے بلی کو؟   بلی پھاڑے کتے کو؟

کتا مارے لاٹھی کو؟   لاٹھی کاٹے لوہے کو؟

لوہا کھائے . مٹی کو؟   مٹی کاٹے پانی کو؟

پانی کھینچے لاٹھے کو؟   لاٹھا باندھے رسّی کو؟

رسّی کاٹے چوہے کو؟   یہ بھی جھوٹ اور وہ بھی جھوٹ؟

دوڑو لوگو دیکھو لوگو!   گھوڑا چڑھنے والے کو

ایسا ڈاکا ایسی لوٹ   اونچی ناک اور اتنا جھوٹ

☆

گیدڑ باگھ کو بھبکی دے   بھینس جنے تو بکری دے

لڈو سے منھ کھٹا ہو   پانی سے اور پیاس بڑھے

پاؤں کہے ہم سنتے ہیں   کان کہے ہم چلتے ہیں

سوئی بولے تاگے سے   آنکھ ہماری دکھتی ہے

دکھتی ہے اور روتی ہے   یہ بھی جھوٹ اور وہ بھی جھوٹ

دوڑو لوگو، دیکھو لوگو   گھوڑا چڑھنے والے کو!

ایسا ڈاکا، ایسی لوٹ!   اونچی ناک اور اتنا جھوٹ!

مینا:

مینا بولی، بلّی سے
چبھ چبھ کانٹے گڑتے ہیں
تو ہے میری ہوتی کون
ہڈی توڑ اور پسلی توڑ

ڈائن! میرا ڈینا چھوڑ
بھاڑ میں جائیں تیرے دانت
جا کے اپنے چہیتوں کی
. . . .

☆

بلی بولی مینا سے
تیرے منھ سے ایسی بات
بکھ کی بات اور گوئیاں سے

میاؤں میاؤں گوئیاں رے
امرت ہوکر بکھ کی بات؟
اے من لبنی! اے من راکھن؟

☆

جس کی گوئیاں روٹھی ہو
میاؤں میاؤں گوئیاں ری
اس میں جھگڑا کاہے کا
جیسی چاہے کریا لے لے
دانتوں کی اور مونچھوں کی
سپنے والے چیچھڑے کی
کھٹے کی اور مٹھے کی
موتی چور کے لڈو کی
چوں چوں کرنے والی کی
جس کی چاہے کریا لے لے
پیاروں سے بھی پیاری تو
تیرے منھ میں سوہنی ری
تکواری اور تلکٹ ری!

پھر وہ کھیلے کس کے سنگ
ڈائن وائن پھر کہہ لینا
اے بھک جگنی! اے جی لگنی
جس کی چاہے کر یا لے لے
آنکھوں کی اور پاؤں کی
ٹوٹنے والے چھینکے کے
ریوڑی، کوڑی گٹے کی
دودھ جلیبی پڑی کی
اور کھلاڑی چوہے کی
میٹھوں سے بھی میٹھی تو
تیری بولی سہاون ری
تیری کڑوی باتیں بھی
میاؤں میاؤں گوئیاں ری

رسیا نے مدھ ماتی نے
بھر بھر لوٹیا، رس اور مدھ
میاؤں میاؤں گوئیاں ری
نانی میری کاشی کی
کاشی جی کا متھرا جی کا
یہ بھی پھیکا وہ بھی پھیکا
سن ری گوئیاں، سن ری آلی
میری تیری جوڑی ہے
اٹکن چٹکن آنگن میں
مینا بولی بلی سے
کیسی گوئیاں کس کی گوئیاں
نانی دادی کاشی متھرا
آنگن کونا کھیل اور کود
ایسا ڈاکا ایسی لوٹ!

اوکھ نے اور مدمکھی نے
کس سے پایا تجھ سے پایا!

....

دادی میری متھرا کی
لڈو چکھا، پیڑا چکھا
تیرے آگے کون ہو میٹھا
جانے دے یہ رگڑا جھگڑا
کھیل اب چل کے میرے سنگ
اندھا تھوپی کونے میں!
دُر کل موہی مٹن، پاپن!
تلکٹ، تکوا، لڈو، پیڑا
اُٹکن چٹکن اندھا تھوپی
یہ بھی جھوٹ اور وہ بھی جھوٹ
اونچی ناک اور اتنا جھوٹ

☆

دیکھو لوگو آئے آئے
بھیا جھپ جھپ کرتے آئے
ندی کنارے تیرتھ کو
بھیا بولے مائی سے
مچھلی مچھلی! منگل ہے

بھیا پنکھ پسارے آئے
آئے بگلا بھیا آئے
مچھلی مائی کے درشن کو
مچھیم مچھیم، منگلم منگلم

....

☆

جھانجھ مجیرا بجتا ہے
جھینگر مچھر گاتے ہیں

ساتوں دن اب منگل ہے
منگل منگل منگل ہے

مکھڑا تیرا دیپک جیسا
جینے دے اب جوگی کو
بھگتی تیرا آیا ہے
برندا بن سے درشن کو
رانی اپنے پرجا سے
سن ری رانی سن ری دیبی
کوئل بھونرا شاما ناگ
رائی پربت، بپت پاپ
سب کے منھ میں کالکھ ہے

آنکھ سے کاہے اوجھل ہے؟
اپنی نین کے روگی کو
گیانی دھیانی آیا ہے
کاہے روسی، ہے بھگوان
دیبی اپنے بھگتی سے

....

کجلی بدلی کوئلہ کاگ
تل کستوری کاجل رات

....

☆

سب کی کملی کالی ہے
اجلی کملی ست جگ کی
کل جگ راون ست جگ، رام

میری کملی اجلی ہے
کالی کملی کل جگ کی

....

☆

کل جگ میرا بیری ہے
کل جگ جھوٹا ست جگ سچا
رانی رانی گھونگٹ کھول

ست جگ میرا ستیا ہے
جھوٹ اور سچ کھل جائے گا

....

☆

آنکھیں دے دے اندھے کو
اندھا پیاسا مرتا ہے
تیرے دوارے مرتا ہے
اے اندرائن! اے چندرائن
مائی بولیں بھیا سے

پانی دے دے پیاسے کو
ندی کنارے مرتا ہے
اے ملکائن! اے ٹھکرائن
تیرے ہوتے یہ اندھیر؟
بھٹ اے پاپی لوبھی جوگی

کس کی رانی، کس کی دیبی؟
کیسا روگ اور کیسا جوگ؟
دوڑو لوگو دیکھو لوگو!
ایسا ڈاکا، ایسی لوٹ

کیسا درشن کیسی پیاس؟
یہ بھی جھوٹ اور وہ بھی جھوٹ
گھوڑا چڑھنے والے کو
اونچی ناک اور اتنا جھوٹ

☆

ٹھگنی بولی کنواری سے
جھاڑو پانی جھنجھٹ ہے
سوپ اور چھلنی پھینک بھی دے
پچھی کو اب آنے دے
کرتی تیری گاڑھے کی
پچھی تیری داسی ہے
پچھی چاہ کی پیاسی ہے
آس لگائے چوکھٹ پار
جائے دکھیا کس کے پاس؟

چولھا، چکی جھنجھٹ ہے
اتنا جھنجھٹ کاہے کو؟
چولھے بھاڑ میں جانے دے
ہنسلی تیری کانسے کی
اتنی پت کاہے کو
اور برہ کی ماری ہے
اور دیا کی بھوکی ہے
بھوکی پیاسی بیٹھی ہے
مار گئیاں تیری آس

☆

پچھی کو اب آنے دے
موتی مونگا آنے دے
جھومر کنگنا آنے دے
آنے دے نولکھا ہار
بجلی تیرے کانوں کی
چمکے گی اور کوندے گی
دھانی پھوٹا نکلے گا
برکھا رانی تجھ سے ملنے

آنے دے ری آنے دے
سونا جھونا آنے دے
ماتھا ٹیکا آنے دے

....

بجلی تیرے ہونٹوں کی
سوہا تجھ کو سوہے گا
سن ری بھولی! سن ری بالی
آئیں گی پھلواڑی میں

موتی لٹاتی دائیں بائیں
موتی لٹاتی اوپر نیچے
موتی لٹاتی بھر بھر تھالی
لاکھوں چھوڑ کروڑوں من
پتا پتا لوٹے گا
لوٹے گا اور جھومے گا
ڈوری ڈال میں ڈولے گی
آئے گا اور جائے گا
بالی میرا کہنا مان!
جگن مگن میں میرے سنگ
رانگا سونا ہوتا ہے
گلری پھول لٹاتی ہے
بیسیوں ندی تیرے ہاتھ
کاہے رین گنواتی ہے
پچھمی تجھ پر مرتی ہے
باؤلی! میرا کہنا مان
کنواری بولی ٹھگنی سے
گنتی تیری الٹی ہے
پہلے دو اور پیچھے ایک
یہ بھی جھوٹ اور وہ بھی جھوٹ
جو کچھ ہے سب مایا ہے
کیسی دھوپ اور کیسی چھاؤں
کجلی بن میں میلا ہے

موتی لٹاتی آگے پیچھے
موتی لٹاتی بھر بھر مٹھی
موتی لٹاتی لاکھوں من

. . . . .

بوٹا بوٹا لوٹے گا
ڈالی ڈالی جھومے گی
جھولا پینگ میں آئے گا
سکھیاں ہنس ہنس گائیں گی
بیٹھی کیا ہے جھٹ پٹ چل
دیکھ لے اپنی آنکھوں سے
گود میں لے لے بھر بھر کے

. . . . . .

دھولے ہاتھ جو دھونا ہے
بھور بھئے پچھتائے گی
پچھمن تجھ پر مرتا ہے
بیٹھی کیا ہے جھٹ پٹ چل
مارو گھٹنا پھوٹے آنکھ
الٹا تیرا پہاڑا بھی
تین تہائی تیرہ ہے
رادھا نانی کہتی تھیں
مکڑی کا سب جالا ہے
دھوکا دھوکا دھوکا ہے

. . . .

☆

کوڑھی کا اور کوڑھن کا
سب کی پیٹھ میں کوبڑ ہے
کجلی بن کا کالا منھ
بانس پہ چڑھنے جائے کون؟
جیون بوٹی، ڈس کی گانٹھ
گاڑھا اچھا ململ سے
کوٹھے اٹاری جاؤ کاہے
تاڑ کو دھڑکا بجلی کا
راجا بھوج سے گنگوا اچھا
کولھو اچھا ہاتھی سے
راج نگر کو پوچھو مت
راج سنگھاسن سُونا ہے
راجا بن بن پھرتا ہے
رانی پتے چنتی ہے
کاہے بن بن پھرتا ہے
اِس کو پوچھو پچھمی سے
پچھمی دیکھی بھالی ہے
چیر و چار بگھارو پانچ
وہ تو ایک چھچھوندر ہے
اِس سے سائی اُس سے بدھائی
ایسی جو کل موہی ہو
ساجھے کی جو ہانڈی ہو
سوتے پہرے پھرتی ہو

بھوت چڑیل اور ڈائن کا
پاپ کی گٹھری بوجھل ہے
کالکھ منھ میں لگائے کون

....

پائے بھی تو کھائے کون
آنگن اچھا کوٹھے سے
دھم سے نیچے گرنے کو
کائی سکھ سے سوتی ہے
چکٹ اچھا اجلے سے
سرسوں اچھی مونگے سے
چاند گہن کو پوچھو مت
ہنستی بستی روتی ہے
تیلی کپی بھرتا ہے
تیلن تیل بہاتی ہے
کاہے پتے چنتی ہے

....

سب کی جانی بوجھی ہے
وہ تو ایک کلچھن ہے
ماری ماری پھرتی ہے
ٹھگنی ٹھگتی پھرتی ہے
دھوکے کی جو ٹٹی ہو
اِس کی ہو کے، اُس کی ہو
سیندور بیچا کرتی ہو

اس کو کون لگائے منھ
اس سے کون بڑھائے پیٹ
جس کو تاکا اُس کو مارا
راجا بکرم پرتھی راج
سب کو بچھی کھلاڑن نے
جیت کے سب کو مارا ہے
ایسی ٹھگنی کھلاڑن کو
ایسی آگ لگاون کو
بچھی سانپ اور بچھو ہے
مرتی ہے تو مرنے دے
بچھی آپ لٹیرن ہے
بچھی آپ بھکارن ہے
یہ بھی جھالر پھندنا ہے
گلری پھول لٹاتی ہے
کیسا سونا؟ کیسا پھول
دوڑو لوگو، دیکھو لوگو
ایسا ڈاکا! ایسی لوٹ

سیولی:

کل جگ ہے یہ کل جگ ہے
گوکھا بولے ایسی بولی
کہتی ہے چمگادڑ بھی
کاٹھ بھی پوچھے آری سے
کل جگ ہے یہ کل جگ ہے

اس کو کون بٹھائے پاس

....

آنکھیں اُس کی بِس کی پوٹ
راجا بنسی، راجا ناگ
چوسر کھیل کے جیتا ہے
اندھا کرکے مارا ہے
نیوتا دینے جائے کون؟
گھر میں گھسنے دیوے کون
سانپ اور بچھو پالے کون

....

اور کسی کو دے گی کیا؟
دے گی کیا نو لکھا ہار
یہ بھی تیری باتیں ہیں
رانگا سونا ہوتا ہے
یہ بھی جھوٹ اور وہ بھی جھوٹ
گھوڑا چڑھنے والے کو
اونچی ناک اور اتنا جھوٹ

....

بونا اچھلے باون ہاتھ
ہم تو سورج بنسی ہیں
تیرے منھ میں کتنے دانت

....

گوکھا:

کل جگ ہے تو ہونے دے ....
جھوٹی باتیں جانے دے گھوڑا یہ تو میرا ہے

سیولی:

گھوڑا تو نے کس سے پایا؟ تیری ماں تو ''رکھنی'' تھی

گوکھا:

رکھنی کون اور بیاہی کون داسی کون اور رانی کون
کوئی نہ جانے پی کا بھید جانے کون پرایا بھید؟
پتھر اُس کو کہنا مت جس پتھر کے ایسے بھاگ
راجا اُس سے مانگے بھیک اُس کو جانو دیبی ہے!
دیپک اُس کو کہنا مت جس سے کھلیے سورج دیو
آنکھ موندوں راتوں کو اُس کو جانو چندرماں ہے
داسی اس کو کہنا مت جس کا باسا پی کے من میں
جس کے بس میں پی کی آنکھ اُس کو جانو رانی ہے
گوالن اُس کو کہنا مت جس کے پیچھے پاگل شیام
جس پر لٹو بنسی والا☆[۲] اس کو جانو رادھا ہے
داسی کون اور رانی کون پتھر کون اور ہیرا کون
رکھنی کون اور بیاہی کون! کوئی نہ جانے پی کا بھید
جانے سیپ نہ جانے سیپ سیپ سے پوچھو پی کا بھید
ہتھیا رانی روتی ہیں سولہ دن تک روتی ہیں
رو رو آنکھیں کھوتی ہیں کاہے اتنا روتی ہیں
مارے لاج کے روتی ہیں ......
لوہا برسے تانبا برسے چاندی برسے سونا برسے

سیپ نہ پوچھے اُس کو اِس کو　　　　مانگے سیپ سواتی بوند
کوئی نہ جانے اِس کا بھید　　　　کوئی نہ جانے پی کا بھید

☆

ایسی کون اور ویسی کون　　　　رکھنی کون اور بیاہی کون
داسی کون اور رانی کون　　　　.......

سیولی:

لاٹھی لاٹھی، لاٹھی لاؤ　　　　بھوت بھگاؤ لاٹھی سے
جس کی لاٹھی اُس کی بھینس　　　　جس کا کوڑا اُس کا گھوڑا
گھوڑا یہ تو میرا ہے　　　　سب سے اونچی میری ناک
گوکھا کیسے پائے گا　　　　نکٹا کیسے پائے گا

بھوت بھگاؤ لاٹھی سے!

اس طرح سیولی اپنی شان میں قصیدہ پڑھتا ہوا، نیالی اور گوکھا کو للکارتا گھوڑے کی پیٹھ پر اور اکڑتا ہوا، گھوڑے کو نچاتا ہوا، ناچنے میں گھوڑے کو چکر دیتا ہوا، پاؤں کے گھنگھرو بجاتا ہوا، ہزاروں کو اپنی شان دکھاتا ہوا، آگے بڑھتا ہے... یہ آگے بڑھتا ہے تو نیالی اور گوکھا اُس کو روکنا چاہتے ہیں۔ سیولی بپھر جاتا ہے، گالیوں کی بوچھاڑ ہوتی ہے، ہوا بگڑ جاتی ہے، تماشائیوں میں کنواریاں بھی ہیں، یہ بھاگنا چاہتی ہیں۔ انبوہ میں بھاگنے کی راہ نہیں ملتی۔ شوہر والیاں شرم سے آنکھ نیچی کرلیتی ہیں۔ گالی بکنے والوں پر اِس کا کوئی اثر نہیں۔ آج معافی کا پروانہ ہے جس کو گالیوں کی تاب نہ ہو وہ یہاں سے چلا جائے۔ آج سب معاف ہے حتیٰ کہ بلوہ بھی۔☆[۳] آج سیولی اپنے گھوڑے پر سوار ہے، بیٹا اپنے باپ کی گدی پر بیٹھا ہے۔

باپ کون؟...　　　　وہی جلترنگ جس نے سمندر کے دیوتا برونا سے انعام میں گھوڑا پایا تھا۔

جلترنگ کون؟...　　　　وہی ستیابتی کا بھائی جس نے دیوتا کی مدد کی تھی۔

ستیاپتی کون؟... وہی الھڑ البیلی جس نے پراسرمنی سے کہا تھا کہ اماوس کی رات میں آنکھ موند کے مت چل۔

پراسر کون؟... وہی جس نے ناؤ پر مچھوے کی بیٹی کو پریم کی بنسی سنائی تھی۔

مچھوا کون؟... وہی جس نے واسو کو تحفے میں ایک مچھلی پیش کی تھی اور اس مچھلی کے پیٹ سے دو بچے ہوئے، لڑکا جلترنگ اور لڑکی ستیاپتی عرف جوجن گندھا۔ اِسی ستیاپتی کا سپوت بیاس جی، جس کی یادگار مہابھارت۔

واسو کون؟... وہی جس نے جنگل میں ہرن اور ہرنی کی چاہت دیکھی تھی اور چاہت کی رنگینی دیکھتے ہی درخت کا ایک پتا توڑا تھا اور کوئی چیز اس پتے میں رکھی تھی اور اُڑتی چیل اپنے پاس بلا کر وہ پتا اُس کو دیا تھا اور کہا تھا کہ یہ امانت میری گریما کو پہنچادے۔

گریما کون؟... مہاندی کی بیٹی جو واسو پر ریجھی ہوئی تھی اور جس نے ماں سے کہا تھا کہ پریم کا نیوتا آگیا ہے، اب کیا کہتی ہے؟

مہاندی کون؟... جس طرح رانیوں میں مہارانی، اسی طرح ندیوں میں مہاندی، وہی مہاندی جس نے اپنی بیٹی گریما سے کہا تھا کہ پریم ساگر کی لہر سے بچی رہنا۔ یہ لہر کتنوں کو الوپ کرچکی ہے۔

پریم ساگر کون؟... وہی جہاں چودھویں رات تھی اور ایک ناؤ تھی، اور ناگن کی چال چلنے والی گریما تھی، اور ناؤ کا کھینے والا واسو تھا، وہی واسو جو مداری کا ایک تماشا تھا۔

مداری کون؟... وہی برہما جس نے اپنے جھروکے سے ایک دن اپنی کلائی کا میل سمندر کو سونپ دیا تھا اور سمندر نے اُس کو آدم زاد کردیا تھا۔ اُسی آدم زاد کا نام واسو اور واسو کا بیٹا جلترنگ! جلترنگ، پانی کی لہر!

حواشی:

۱۔ چتر لیکھا: صوبۂ بہار میں راج گیر مشہور مقام ہے۔ کرشن جی کے زمانے میں راج گیر کا نام ''گیری برج'' تھا اور راجا اس کا بانا سور تھا۔ باناسور کی بیٹی راج کماری اوشا گیری برج میں رہتی تھی۔ راج کماری اوشا نے ایک مرتبہ خواب میں کسی اجنبی کو دیکھا، آنکھ کھلی تو دیکھتی کیا ہے کہ سینے میں دل نہیں ہے۔ اپنی سہیلی سے حال بیان کیا۔ سہیلی نے کہا کہ سچی ہے تو چور کا نام بتلا، دل تیرا آخر لیا کس نے؟ راج کماری نے کہا کہ ''چور آتا ہے، چوری کرنے یا نام بتلانے؟''... تب سہیلی نے جوانانِ عالم کی ایک منتخب فہرست تیار کی، اور انھیں چیدہ اشخاص کی تصویریں کھینچیں، مرقع تیار ہوگیا تو سہیلی راج کماری کے پاس پہنچی اور کہا کہ... ''سچی ہے تو اب اپنے چور کو پہچان!''... یہ کہہ کر ایک ایک تصویر راج کماری کے ہاتھ میں دی... راج کماری کے ہاتھ میں تصویروں کی شامت آگئی۔ تصویریں سامنے آتی گئیں اور جھنجھلاہٹ میں راج کماری ایک ایک کو پھاڑتی گئی:

یہ نہیں	یہ بھی نہیں	تو کیا جانے؟	یہ بھی نہیں
وہ بات کہاں	یہ بھی نہیں	وہ رس کہاں	یہ بھی نہیں
وہ آنکھیں نہیں	یہ بھی نہیں	وہ پلکیں نہیں	یہ بھی نہیں
چل ہٹ	یہ بھی نہیں	تو جھوٹی ہے	یہ بھی نہیں
تو پگلی ہے	یہ بھی نہیں	اب مت چھیڑ	یہ بھی نہیں
تو جاتی کیوں نہیں	یہ بھی نہیں		

ارے چور! چور! چور... چور پہچانا گیا تو چوری کا مال بھی برآمد ہوا، یعنی دل، جو اب تک غائب تھا، اپنی کوٹھری میں پھر ٹک ٹک کرنے لگا۔

چور کی تصویر دیکھتے ہی راج کماری کا دل دھڑکنے لگا تو سہیلی تاڑ گئی اور بولی کہ راج کماری! تجھ کو ٹھنٹھولی کون کہتا ہے؟ تو تو بڑی سیانی نکلی! دھن ہے اُس چوہیا کو جس نے بلی کو تھپکار کر راجا کے بھنڈار میں ڈاکا ڈالا۔ ارے کچھ جانتی ہے کہ یہ تصویر کس کی ہے؟ یہ تصویر انی رودھ کی ہے! رتی کا لال! کرشن جی کا پوتا... اور سچ پوچھ تو کرشن جی کا کنٹھ مالا... دھن ہے تجھ کو کہ کنیا ہوکر تو کرشن مہاراج کے کنٹھ سے مالا کاڑھ لائی۔

جس دن راج کماری اوشا نے اپنے خواب کی تعبیر اور اپنے درد کی دوا پائی، اُسی دن سے اِس سہیلی کا نام چتر لیکھا ہوگیا۔ چتر لیکھا بہ معنی تصویر۔ ظاہر ہے کہ وہ سہیلی مصور تھی نہ کہ تصویر۔ دنیا میں کسی باکمال کو وہ عزت نصیب نہیں ہوئی جو اس سہیلی کو ہوئی۔ مثلاً کالی داس شاعری میں یکتا سہی مگر نام اُس کا کالی داس ہی رہا، اس نام سے پتا نہیں چلتا کہ وہ شاعر تھا یا تنبولی۔ مگر اُس فتنۂ روزگار سہیلی کا نام ہی چتر لیکھا ہوگیا، یعنی مجسم تصویر۔ مصوری ہو تو ایسی ہو!... اور اُس تصویر کا کیا کہنا جس نے آگ بجھائی بھی اور لگائی بھی۔ راج کماری کو انی رودھ سے ملادیا اور گیری برج کو متھرا سے لڑادیا... لگائی بجھائی اس کو کہتے ہیں۔

۲۔ جس پر لٹو بنسی والا... رادھا ندی سے پانی بھر کر اپنے گھر جارہی ہے، راستے میں آنکھیں اُس سے چار ہوتی ہیں جو جانے نہیں دیتا، ایک قدم بڑھانے نہیں دیتا، تب رادھا کہتی ہے:

ٹھاڑے رہو بانکے یار

گگریا میں دھر آؤں   چندریا پہن آؤں   کر آؤں سولہ سنگار   ٹھاڑے رہو بانکے یار

اِسی طرح ایک مرتبہ عاشق معشوق سے، یا معشوق عاشق سے پوچھتا ہے کہ تو نے ہمارا ''لٹو'' کیوں چوری کیا؟ رادھا پوچھتی ہے، لٹو کیسا؟ کرشن کہتا ہے، وہی جو تو چھپائے ہوئے ہے۔ رادھا کہتی ہے، ہم نے تیرا لٹو دیکھا تک نہیں۔تب کرشن چور کے پاس سے اپنا لٹو برآمد کرتا ہے اور پوچھتا ہے، اب کیا کہتی ہے۔

چوری کا مال کہاں سے برآمد ہوا؟ یہ پوچھنے کی بات نہیں اور کہنے کی بات نہیں، لیکن اُڑیا زبان کے ایک شاعر نے یہی بات جو پوچھنے اور کہنے کی نہیں تھی، کھول کر بیان کردی اور نظم کا نام ''نٹو چوری'' رکھا۔ اُڑیا زبان میں نٹو وہی ہے جو اردو میں لٹو۔ اِس شاعر کا نام کھیرو چندرا ئے چودھری تھا، یہ اڑیسہ میں ہیڈ ماسٹر تھا، نظم اِس قدر عریاں تھی کہ مقدمہ چلا اور مطبوعہ کتاب ضبط ہوگئی۔

۳۔ آج سب معاف ہے حتیٰ کہ بلوہ بھی... اڑیسہ ضلع کٹک میں، راج کنجگ نام مہاراجا بروردان کی ایک ریاست ہے۔ اِس ریاست میں ایک موضع کالیا پاٹ ہے جہاں مچھوؤں کا بہت بڑا جتھا ہے۔ تقریباً ۱۹۱۳ء میں بابو راجندر کمار باسو، راج کے منیجر کے زمانے میں گھوڑا ناچ ہوا تو کالیا پاٹ کے مچھوؤں یعنی سیولی، نیالی اور گوکھا قوموں میں فوج داری ہوگئی۔ اِس بلوے کی آواز پوری جگناتھ اور بنارس کے پنڈتوں تک پہنچی۔ پوری جگناتھ میں موکا منذب نام پنڈتوں کی ایک جماعت ہے جس کا فیصلہ اٹل ہے۔ کلیا پاٹ کے مچھوؤں نے، یعنی نیالی اور گوکھا نے موکا منذب کی عدالت میں مقدمہ دائر کیا کہ:

الف: جلترنگ کے بیٹے تین، لیکن جلترنگ کا گھوڑا ایک۔ اِس ایک کے لیے تینوں میں لڑائی ہوئی۔ بڑے بیٹے نے گھوڑا زبردستی لے لیا اور اس طرح باقی دو بیٹے باپ کے ترکے سے محروم ہوگئے۔ چنانچہ منجھلے بیٹے کی نسل نیالی اور چھوٹے بیٹے کی نسل گوکھا آج تک اِس گھوڑے پر قبضہ نہیں پاسکی۔

ب: اب سوال یہ ہے کہ جلترنگ کا گھوڑا صرف بڑا بیٹا کیوں پائے گا؟ اور باقی دو بیٹوں کا حق کیوں مارا جائے گا۔

ج: مظلوم نیالی اور گوکھا کو اِس گھوڑے پر قبضہ دلوایا جائے۔ ظالم سیولی اپنے ظلم سے آج تک باز نہیں آتا۔

ہوشیار پنڈتوں نے جواب دیا کہ یہ دعویٰ ہزاروں برس کے بعد دائر ہورہا ہے، اِس لیے دعویٰ تمادی ہوگیا۔ جلترنگ کے مرتے ہی یہ دعویٰ کیوں نہیں دائر کیا گیا تھا؟

[پہلی اشاعت: بعنوان ''جل ترنگ کے تین بیٹے''۔ رسالہ ''ندیم'' پٹنہ۔ جولائی اگست ۱۹۳۳ء۔
دوسری اشاعت، بعد نظر ثانی: بعنوان ''جل ترنگ'' رسالہ ''مہرنیم روز'' کراچی، خاص نمبر ۱۹۶۸ء]

دیر و حرم کا افسانہ

(۱)

ایک مسلمان نے کسی دہریے سے پوچھا کہ تو خدا کو کیوں نہیں مانتا تو دہریے نے جواب دیا کہ تمھارا خدا ماننے کے قابل ہو تب کوئی مانے یا یوں ہی مان لے! تم جب چھیڑتے ہو تو سنو:

زہرا بائی پیدا ہوئی اور بڑھی تو اُس کی آنکھوں کو دیکھ کر شرابی ہوشیار اور ہوشیار شرابی ہوگئے۔ مگر اُسی محلے میں شریفن پیدا ہوئی تو دونوں آنکھوں سے اندھی۔ اندھی شریفن کو انکھیارے کمینوں نے زندگی بھر نہ پوچھا۔ تمھارا خدا اگر انصاف ور تھا تو اُس نے شریفن کو اندھا پیدا کر کے فاقے کیوں کرائے اور زہرا بائی کو چشمِ مے گوں دے کر بادۂ عشرت کیوں پلایا؟

عین طوفان میں ایک بچہ تباہ شدہ کشتی کے تختے پر پیدا ہوتا ہے۔ ماں فوراً مرجاتی ہے۔ سمندر کا تلاطم اُس ٹوٹے ہوئے تختے کو ساحل پر لگادیتا ہے۔ بچہ صحیح سلامت رہتا ہے اور مہِ نو کی طرح بڑھتا ہے۔ اُس کا عروج بہشت شداد سے پوچھ لو۔ مگر ایک دوسرا بچہ سیٹھ کروڑی چند (عرف لاولد) کے یہاں پیدا ہوتا ہے اور شفاء الملک کی نگرانی میں دیا جاتا ہے، لیکن شفاء الملک بیٹھے کے بیٹھے رہ گئے اور نوزائیدہ دم توڑ چکا۔ اگر تمھارا خدا رحیم ہے تو لاولد سیٹھ کے جگر میں ناسور کیوں ہے؟

یہ کیا ہے کہ جو بچہ طوفان کی گود میں تھا، وہ بچا لیا گیا اور جو بچہ شفاء الملک کی گود میں تھا، وہ چھین لیا گیا؟

مصر کے فراعنہ اپنی شادی زیادہ تر اپنی بیٹیوں اور بہنوں سے کرتے تھے اور جب یہ نعمتیں اُن کو میسر نہ ہوتیں تب کہیں باہر سے لڑکی لاتے تھے، وہ اِس خیال سے کہ باہر کی لڑکی آئے گی تو کہیں ایسا نہ ہو کہ اُس کے مائکہ والے سازش کر کے تختِ مصر کو اپنے خاندان میں منتقل کرلیں اور کبھی اِس خیال سے کہ دنیا بھر کی آسایش جب اپنی لڑکی اور بہن کو خود دے سکتے ہیں تو پھر کسی داماد یا بہنوئی کی تلاش میں گدائی کیوں کی جائے اور کبھی اِس خیال سے کہ اپنے خانہ باغ کی چڑیا باغِ اغیار کی ہزار داستان سے اچھی ہے۔ بہرکیف اِس فلسفے کا نتیجہ یہ ہوا کہ فرعون☆[1] نے اپنی شادی سگی بہن یا بیٹی سے کی تو اُس کا بیٹا فرعون اپنی ماں کا سگا بھائی اور اپنی پھوپھی کا بیٹا ہوا۔ اور خود فرعون اپنے بیٹے کا نانا اور اپنے بھانجے کا باپ ہوا۔ اور فرعون کی ماں اپنے شوہر کی نواسی ہوئی... یہ فرعونیت تمھارے خدا کو اگر بھائی نہ تھی تو اُس نے اِن کتّوں کو تختِ مصر پر لوٹنے کیوں دیا؟ میرا روئے سخن جامِ فرعونیت کے اُس تلچھٹ کی طرف نہیں ہے جس کو عہدِ موسوی کے افسانہ گو کہتے ہیں کہ تمھارے خدا نے دریائے نیل میں بہا دیا تھا۔ سوال یہ ہے کہ بیسیوں فراعنہ جو صدیوں تک اپنی بہنوں اور بیٹیوں سے شادیاں کرتے رہے اور جن کی نجاست سے دنیا نجس ہوگئی، ایسے گدھ مصر وحبش کی شاہنشاہی کے لیے کیوں چھوڑ دیے گئے؟

واہ رے تمھارا خدا کہ ابرہہ میں سرکوبی کے لیے ابابیلیں اور ابابیلوں کے چنگل میں کنکریاں بھیجتا ہے مگر ۶۴ھ میں جب خود کلمہ گویوں نے مکے کا محاصرہ کیا، خانۂ کعبہ کو نقصان عظیم پہنچایا اور مدینے میں مسجدِ نبوی کو گھوڑوں کا اصطبل بنایا اور انصار کو چن چن کر مارا اور ۱۴۵ ہجری میں جب خلیفۃ المنصور☆[2] نے مدینے کا ناکا کر کے قحط کرا دیا اور امام ابوحنیفہ کو قید خانے میں جھونکا اور امام مالک کو کوڑے لگائے اور ۳۱۷ ہجری میں جب ابوطاہر☆[3] نے عین حج کے دن حاجیوں کو ذبح کیا اور خانۂ کعبہ کو

نجس کیا اور سنگِ اسود کو اکھاڑ کر بائیس برس تک بیت اللہ کو بے چراغ رکھا، اِن موقعوں پر تمھارا خدا ابابیلوں اور کنکریوں سے مطلق کام نہیں لیتا۔ آخر کیوں؟ میزبان نے اپنے مہمان حاجیوں کو ذبح ہونے سے کیوں نہ بچا لیا؟ صاحب خانہ نے گھر کو تاراج ہونے کے لیے بے پناہ کیوں چھوڑ دیا؟

یہودیوں نے حضرت عیسیٰؑ[4] کو طمانچے لگائے، منہ پر تھوکا اور سولی پر چڑھایا، تمھارا خدا کہاں تھا کہ ایسے وفادار غلام کی ذلت دیکھتا رہا۔ تمھارے رسول کے راستے میں کانٹے بچھائے گئے، بدن پر اونٹ کی انتڑیاں ڈالی گئیں، زہر دیا گیا، تمھارا خدا کہاں تھا کہ اُس نے اپنے حبیبؐ کو اُسی طرح نہ بچا لیا جس طرح افسانہ گو کہتے ہیں کہ اُس نے جناب خلیلؑ کو آتشِ نمرود سے اور جناب موسیٰؑ کو دریائے نیل سے بچا لیا؟... تمھارے رسولؐ کے نواسے کا سر کاٹ کر نیزے پر چڑھایا گیا اور پھر دربارِ عام میں یزید کے سامنے تحفتاً پیش ہوا اور یزید نے لب ہائے شہید سے گستاخیاں کیں! تمھارا خدا اُس وقت کہاں تھا کہ اپنے فدائیوں کی رسوائی دیکھتا رہا اور کیوں نہ ایسا ہوا کہ غضب الٰہی نے اُسی وقت یزید اور یزید کے درباریوں پر بجلی گرادی؟

کیا فرماتے ہیں ہستیِ موہوم کا کلمہ پڑھنے والے اِس باب میں کہ بنی اسرائیل چیختے رہ گئے کہ اے موسیٰ! تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو اپنے خدا کو سامنے لاؤ مگر جب جوش میں آکر موسیٰ نے نقاب پھاڑنا چاہا تو اُن کا خیالی نقاب پوش للکار اٹھا کہ دور باش! حضرت موسیٰ کی اِس شکستِ فاش کے بعد اب کس کا منہ ہے کہ خدا کی ہستی کا دعویٰ کرے؟ مدعی ست اور گواہ چست! اگر خدا تھا تو بنی اسرائیل کے سامنے کیوں نہ آیا اور اب بھی ہے تو میرے سامنے کیوں نہیں آتا؟

(۲)

کلمہ گو نے دہریے سے کہا کہ ہم تیری باتوں کا جواب یوں دیں گے کہ کسی مدرسے میں چند طلبہ اردو زبان سیکھتے تھے، صَرف ونحو اور بالخصوص فنِ عروض کی بیسیوں کتابیں درس میں تھیں۔ سالانہ امتحان میں جب طلبہ شریک ہوئے اور اردو کا پرچہ

سامنے آیا تو اس میں سوال تھا کہ:

مندرجۂ ذیل الفاظ میں املا کی جو غلطیاں ہوں ان کو درست کر کے غیرمرتّب الفاظ سے ایک شعر کہو:

ذد۔ ضعد۔ دیکھے۔ کہ۔ حم۔ حے۔ بے۔ کور۔ کر۔ کو۔ مادر۔ تح

بلیغب۔ کیا۔ مانیں گے۔ چلطے۔ یکیں۔ نہن۔ اوص۔ ہیں۔ رکھ

اِس سوال کو دیکھ کر طلبہ نے قہقہہ مارا اور یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے کہ یارو! گر ہمیں مکتب و ہمیں ملا، کار طفلاں تمام خواہد شد۔ قافیے کا پتا نہیں، ردیف کا پتا نہیں، بحر کا پتا نہیں، مضمون کا پتا نہیں، الفاظ کی بے سر و سامانی یہ ہے جیسے میدانِ جنگ سے بھاگتی ہوئی فوج کا توشہ خانہ۔ پھر فرمائش یہ ہے کہ شعر کہو۔ یا تو سوال چننے والا پاگل ہے یا نہیں تو کوئی جتاتی مذاق ہے، ایسے ہذیان کا جواب دینا عقل مندوں کا کام نہیں ہے۔

ہو بہو یہی حالت منکرینِ خدا کی ہے۔ طلبہ نے اردو کے پرچے کو ہذیان سمجھ کر اُس کا جواب دینا اپنی شان کے خلاف سمجھا اور دہریوں نے خود اپنی ہستی کو ارتقائی ہذیان سمجھ کر خدا کی ہستی سے انکار کر دیا۔ مگر طلبہ اگر صبر سے کام لیتے تو اُن کو معلوم ہو جاتا کہ املا کی غلطیاں صرف نو ہیں... (ذد۔ ضعد۔ حم۔ حے۔ تح۔ بلیغب۔ چلطے۔ یکیں۔ اوص) جن کی صحت کی جائے تو الفاظ یہ ہوں گے: ''ضد۔ زاد۔ ہم۔ ہے۔ یہ۔ بالغیب۔ چلتے۔ یقیں۔ اوس''۔ باقی رہا غیرمرتّب الفاظ کو ترتیب دینا تو گھڑی ساز کی دکان میں سیکڑوں پرزے منتشر رہتے ہیں مگر وہ آناً فاناً میں سب کو ترتیب دے لیتا ہے۔ اِسی طرح ناظم جس کا پیشہ یہی ہے کہ خیالات کی منتشر فوج کو بروقت ترتیب دیا کرے، اُس کے لیے مشکل نہیں کہ چند منتشر الفاظ کو ترتیب دے کر ایک شعر نظم کر دے۔ پس طلبہ کا امتحان اِسی بات کا تھا کہ وہ فنِ عروض کی کنگھی سے اِس زلفِ پریشاں کو سلجھا سکتے ہیں یا نہیں؟ قہقہے نے سب کام بگاڑ دیا، ورنہ غیرمرتّب الفاظ کو مناسب ترتیب دینے سے جو شعر ہوتا وہ یہ ہے:

یہ کیا ضد ہے کہ بے دیکھے نہیں مانیں گے اُس کو ہم

یقیں بالغیب رکھ کر کورِ مادر زاد چلتے ہیں

یعنی عجائب خانے میں رکھنے کے قابل وہ بچہ ہے جو دونوں آنکھوں سے اندھا پیدا ہوا، کیوں کہ اس کی زندگی کا ہر ورق گلستانِ سعدی سے زیادہ سبق آموز ہے۔ ماں باپ کی صورت، آسمان زمین کی صورت، اپنے مکان کے در و دیوار کی صورت، بستی والوں کی صورت، آگ مٹی اور پانی کی صورت، آج تک اُس نے دیکھی نہیں، پھر بھی نادیدہ ہر شے کا اُس کو یقین ہے۔ آگ کو مٹی نہیں سمجھتا، مٹی کو پانی نہیں سمجھتا اور پانی کو آگ نہیں سمجھتا۔ کبھی وہ عذر نہیں پیش کرتا کہ ماں کو ماں، باپ کو باپ کیوں مانیں، جب کہ آج تک ہم نے اُن کو دیکھا نہیں ہے۔ سڑکوں پر نکلتا ہے تو اُس کا ہر قدم یقین بالغیب کا نتیجہ ہے۔ نشیب و فراز سے بچتا ہوا جاتا ہے، اِس لیے نہیں کہ نشیب و فراز آنکھوں سے دیکھ رہا ہے بلکہ اِس لیے کہ اپنے عصا اور راستہ بتانے والوں کو وہ جھوٹا نہیں سمجھا۔ کسی نے ٹوک دیا کہ آگے کنواں ہے تو یہ سنتے ہی وہ اپنا رخ بدل دیتا ہے۔ حجت نہیں کرتا، منطق نہیں شروع کر دیتا۔ پس ایک کورِ مادر زاد کی زندگی شاہد ہے اس بات کی کہ کسی چیز کا ماننا اُس چیز کے دیکھنے پر منحصر نہیں ہے۔ ایک مریض کہتا ہے کہ میرے بدن میں درد ہے۔ طبیب اُس درد کو دیکھ نہیں سکتا، مگر نادیدہ پر یقین رکھتا ہے اور درد کی دوا دیتا ہے۔ اِسی طرح سقراط، رستم، حاتم طائی، بابل و نینوا کے شاہی محلات، پانی پت کی لڑائیاں، لیلیٰ مجنوں کا مکتب میں الف بے پڑھنا، بابر کا ہمایوں پر صدقے ہوکر مر جانا، ہارون رشید کا بھیس بدل کر راتوں کو نکلنا، سکندر کی تلوارِ خوں آشام، فرہاد کا تیشہ، بت شکن محمود کا نعرۂ اللہ اکبر، نمرود کی سرکوبی کرنے والا مچھر اور امیر علی ٹھگ کا رومال، یہ سب چیزیں، یہ سب لوگ، یہ سب مناظر، قبرستانِ ماضی میں آج مدفون ہیں۔ کوئی نہ ان کو دیکھتا ہے نہ دیکھ سکتا ہے۔ مگر نادیدہ سب کو یقین ہے! کوئی یہ عذر پیش نہیں کرتا کہ پانی پت کی لڑائی اور فرہاد کا تیشہ جب میری آنکھوں نے کبھی نہیں دیکھا تو ہم اُن کو مانیں کیوں، مگر ہاں جب خدا کے ماننے کی باری آتی ہے تو بنی اسرائیل، کفارِ مکہ اور دہریے چیخ اٹھتے ہیں کہ واہ وا جب اُس کو دیکھا نہیں تو مانیں کیوں؟ مگر یاد رہے کہ کوہِ طور پر صدا یہی آئی تھی کہ ''لن ترانی!'' اور کفارِ مکہ کو

جواب یہی ملا تھا کہ ہم کو دیکھنا ہو تو ''ہماری نشانیاں'' دیکھ لو! خاک کو عالمِ پاک سے یا مخلوق کو خالق سے کوئی نسبت نہیں، مگر یہ کیا ہے کہ مخفی زیب النسا کے نادیدہ عاشقوں نے جب اُس کی زیارت چاہی تھی تو اُس نے بھی صاف کہہ دیا تھا کہ ''ہر کہ دیدن میل دارد، در سخن بیند مرا!''

۹۹۷ ہجری کا تاریخی واقعہ ہے کہ شہنشاہ اکبر جب کشمیر گیا تو وہاں شاہ عارف حسینیؒ[☆۵] سے ملاقات ہوئی۔ شاہ عارف ہمیشہ نقاب پوش رہتا تھا۔ اِس لیے اکبر نے ابوالفضل اور حکیم ابوالفتح گیلانی کو اُس کی خدمت میں بھیجا۔ دونوں نے پہنچ کر عرض کی۔ ''شاہا! کیا مضائقہ ہے اگر نقاب اٹھا دو، ہم بھی تمھارا جمال دیکھ لیں''۔ عارف حسینی نے نہ مانا اور کہا: ''ہم فقیر لوگ ہیں، جانے دو، بہت مت ستاؤ''۔ حکیم ابوالفتح گیلانی شوخ و بے باک تھا، ہاتھ بڑھا کر چاہا کہ نقاب کھینچ لے، شاہ عارف حسینی اِس گستاخی پر جامے سے باہر ہوگیا اور بولا: ''میں مجذوم یا معیوب نہیں، لے دیکھ میرا منھ، مگر نتیجہ اِسی دو ہفتے میں دیکھ لے گا''۔ یہ کہہ کر نقاب پھاڑ کر پھینک دیا۔ ابھی دو ہفتے بھی نہ گزرے تھے کہ کشمیر سے واپسی میں حکیم ابوالفتح گیلانی دردِ شکم اور اسہال میں گرفتار ہوگیا۔ اکبر کا ماتھا ٹھنکا۔ شاہ عارف حسینی کا غصہ دھیما کرنے کے لیے کچھ روپے بھیجے کہ تبت کے محتاجوں میں تقسیم فرمادیجیے۔ مگر یہ پیش بندی کچھ کام نہ آئی اور مرض اتنا بڑھا کہ ابوالفتح گیلانی نے راستے ہی میں انتقال کیا۔ تاریخ وفات نکلی تو یہ نکلی کہ ''خدایش سزا دہاد'' ۹۹۷ھ۔

پس جب زیب النسا اور شاہ عارف حسینی کے جیسے خاک نشینوں کا دماغ یہ تھا کہ اپنے تماشائیوں کو مستحق دیدار نہ سمجھا تو پھر جو واقعی جانِ عالم ہے، بے نیاز ہے، یگانہ و یکتا ہے، جسم و مکان کے قیود سے مبرا ہے، ہر اوّل سے اوّل ہے، ہر آخر سے آخر ہے، لم یلد ولم یولد ہے، خود آرا ہے، وہ ہم خاک نشینوں کو مستحقِ دیدار کیوں سمجھے؟ اور سمجھے بھی تو یہاں طاقت دیدار کس میں ہے؟ اِسی لیے طالبِ دیدار کی تنبیہ کے لیے دنیا میں کورِ مادر زاد بھیج دیا گیا۔ کیوں کہ اُس کی زندگی کی پوری عمارت صرف

ایمان بالغیب پر کھڑی ہے اور یہ عمارت زندہ گواہ ہے، اِس بات کی کہ بغیر دیکھے ہوئے کسی شے کو کیوں کر مانا جاسکتا ہے! اگر خدا کا ماننا، اُس کے دیکھنے پر منحصر ہوتا تو دنیا میں جتنے اندھے ہیں، اُن کو معافی کا پروانہ مل جاتا، وہ یہ منطق پیش کرتے کہ ساری دنیا خدا کو مان رہی ہے تو آنکھ سے دیکھ کر مانتی ہے، میرے پاس جب آنکھ ہی نہیں تو ہم کیوں کر دیکھیں اور کیوں کر مانیں؟ اِس منطقی عذر سے بچنے کے لیے اگر خدا ساری دنیا کو آنکھیں دے دیتا یعنی کسی کو اندھا نہ پیدا کرتا اور خود اپنے آپ کو فضائے آسمانی میں چاند سورج کی طرح ہمیشہ کے لیے معلق کردیتا تاکہ ساری دنیا ہر وقت اُس کو دیکھتی رہے اور انکار کا موقع کسی کو نہ ہونے پائے تو بھی اُن تمام لوگوں کو معافی کا پروانہ مل جاتا جو کورِ مادر زاد نہ تھے۔ مگر بعد میں چوٹ کھا کر یا امراض کی وجہ سے یا بڑھاپے میں اندھے ہوگئے۔ اِن میں سے ہر شخص یہ اعلان کردیتا کہ کل تک ہم خدا کو دیکھتے تھے، اِس لیے مانتے تھے، آج دیکھ نہیں سکتے، اِس لیے مان نہیں سکتے۔

اب سوال یہ ہے کہ خدا کو ہم دیکھنا بھی چاہیں تو کس طرح دیکھیں؟ رنج، راحت، سردی، گرمی، نیکی، بدی، وقت، روح، درد، غصہ، رحم، ستم کی شکل و صورت آج تک کس نے دیکھی ہے؟ صرف آثار و نتائج سے پتا چلتا ہے کہ جو مچھلی جال میں تڑپ رہی ہے، اُس میں ابھی روح ہے اور جو تڑپ کر سرد ہوچکی ہے، اُس میں اب روح نہیں ہے، مگر روح بذاتِ خود کیا ہے؟ یہ انسانی آنکھوں نے آج تک نہیں دیکھا۔ جب روح کی لطافت و نزاکت یہ ہے تو روح کا پیدا کرنے والا اپنے کو دکھاتا تو کس طرح دکھاتا اور ہم دیکھتے تو کس طرح دیکھتے؟ کیا اُن آنکھوں سے جو شیر کے سامنے جھپک جاتی ہیں؟ کیا اُن آنکھوں سے جو مہرِ نیم روز کے سامنے خیرہ ہوجاتی ہیں؟ کیا اُن آنکھوں سے جو کوہِ طور پر ایک نظرِ غلط انداز تک سے شکست کھاگئیں؟ یہی جواب ہے میرا، تیرے اِس سوال کا کہ اگر خدا تھا تو بنی اسرائیل کے سامنے کیوں نہ آیا، اور اب بھی ہے تو میرے سامنے کیوں نہیں آتا:

جو دکھلائیں تو غش ہوں سب، نہ دکھلائیں تو منکر ہوں
وہ یکتائی پہ اپنے حسن کی، خود ہاتھ ملتے ہیں

یہی وجہ ہے کہ آسمانی کتابوں نے اعلان کر دیا کہ چشمِ ظاہر خدا کو دیکھ نہیں سکتی، جس کو دیکھنے کی تمنا ہو وہ چشمِ باطن سے اُس کو دیکھ لے۔ حسرتِ دیدن پوری کیوں کر ہو جب آلۂ دیدن ہی ناقص ہے۔ اِس لیے مجبوراً اُس آلے کو چھوڑ کر کسی دوسرے آلے سے کام لینا ہوگا اور وہ دوسرا آلہ وہی چشمِ باطن و گوشِ باطن ہے، جس کی طرف تمام الہامی کتابیں اشارہ کر رہی ہیں کہ کاتب کو دیکھنا ہو تو اُس کا مکتوب دیکھ لو۔ مگر اِس نابینائی کا کیا جواب ہے کہ دہریوں نے جب مکتوب دیکھا تو خبط ہوگئے اور جھلّی میں چلا اٹھے کہ بھائیو! یہ مکتوب سراسر ہذیان ہے اور ایسے کاتب کو ماننا ہم لوگوں کی شان کے قطعی خلاف ہے۔ جب پوچھا کہ ہذیان کیوں کر ہے تو کہنے لگے کہ کاتب نے زہرا بائی کو چشمِ غزالاں دے کر فاتح اور شریفن کو چشمِ کور دے کر مفتوح کیوں کیا؟ اور خانۂ کعبہ کو ابرہہ کے چنگل سے بچانے کے لیے اگر ابابیلوں کی فوج بھیجنا ضرور تھا تو وہی فوج ابوطاہر کی سرکوبی کے لیے کیوں نہ بھیجی گئی، جب وہ بیت اللہ کو تاراج کر رہا تھا؟ مگر یاد رہے کہ سالانہ امتحان دینے والے طلبہ بھی اردو کے پرچے کو ہذیان سمجھ کر قہقہہ مارتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے تھے، حالاں کہ وہ سوال ہذیان نہ تھا بلکہ غلط املا اور غلط ترتیب قصداً تھی۔ قصداً اِس لیے کہ ممتحن کو اِسی بات کا امتحان لینا تھا کہ اِن غلطیوں کو درست کر کے کون کون صحیح جواب دیتا ہے اور سوال کو ہذیان سمجھ کر کون کون اُٹھ جاتا ہے۔ اے خدا کی ہستی سے انکار کرنے والے! یہ قفسِ دنیا بھی دارالامتحان ہے۔ اشرف المخلوقات کا امتحان ہو رہا ہے، اوراقِ زمین و آسمان اور اِس مجموعۂ منتشر کے تمامی مکتوبات امتحان کے سوالات ہیں، اور اِن سوالات میں بھی جابجا اِملا کی غلطیاں اور الفاظ کی بے ترتیبی قصداً چھوڑ دی گئی ہیں۔ اِملا کی غلطیاں یہ ہیں کہ ممتحن نے کسی کو اندھا پیدا کیا، کسی کو گونگا بہرا، کسی کو اپاہج، کسی کو بونا، کسی کو دیوانہ، کسی کے ہاتھ گھٹنوں تک پہنچا دیے، کسی کے ہونٹ اُلٹ دیے، کسی کی ناک چپٹی کر دی، کسی کی گردن کوتاہ کر دی اور کسی کے کان دراز کر دیے۔

عمر خیام کہتا ہے کہ ماہِ صیام کے تمام ہونے پر جب اور لوگ عید کا چاند دیکھ

رہے تھے، اُس وقت ہم ایک کمھار کی دکان پر کھڑے تھے، سامنے طرح طرح کے مٹی کے پیالے سجے رکھے تھے، اتنے میں ایک پیالہ پوچھ بیٹھا کہ بھائیو! کوزہ کون ہے اور کوزہ گر کون ہے؟ دوسرے پیالے نے جواب دیا کہ ''خاموش! کیا تم سمجھتے ہو کہ کمھار نے کھیت کی روندی ہوئی مٹی گوندھ کر اپنی تمام صناعی اِس پر اِس لیے صرف کی ہے کہ اس عجیب و غریب پیالے کو توڑ کر پھر کھیت کی مٹی کر دے؟ ہرگز نہیں''۔ تیسرے پیالے نے کہا کہ ''لاریب! کوئی کیسا ہی شوریدہ مزاج ہو مگر یہ نہیں کرے گا کہ جس جام سے بادۂ عشرت پی چکا ہو، اُس جام کو دے پٹکے۔ تب کمھار پر اِس بات کا شبہہ کیوں ہے کہ جن پیالوں کو خود اپنا دل بہلانے کے لیے اِس شوق و محبت سے وہ بنا چکا، اُنھیں پیالوں کو بعد میں جھنجھلا کر وہ چکنا چور کر دے گا''۔ یہ سن کر اور پیالے تو خاموش ہو گئے مگر ایک بدصورت پیالہ بول اٹھا کہ ''بھائیو! تم لوگ خوب صورت ہو، تمھارے گاہک ایک نہیں ایک لاکھ، مگر ہم ایسے بھونڈوں کو کون پوچھے، دنیا ہم پر ہنستی ہے، خدارا بتاؤ کہ ہم کو بناتے وقت کیا کمھار کے ہاتھوں میں رعشہ تھا؟ اگر کمھار کا ہاتھ اُس وقت تھرایا نہیں تھا تو ہم بدصورت کیوں ہو گئے''؟ کمھار کی دکان میں جو بحث چھڑی تھی، اُس کا جواب امیر مینائی یوں دیتا ہے:

شبیہ مدِنظر ہے کس کی؟ کہ کوئی صورت نہیں اترتی
مٹا دیے صانعِ ازل نے ہزاروں نقشے بنا بنا کر

یعنی روزِ آفرینش سے آج تک اتنی تصویریں جو خاک میں ملائی گئیں، اُس کا راز یہ ہے کہ مصور کی مرضی کے مطابق آج تک کوئی تصویر اتری ہی نہیں۔ مصور غریب ابھی مشق کر رہا ہے۔ ہر صبح قلم ہاتھ میں لیتا ہے اور ہر شام کاغذ کو جھنجھلا کر پھاڑ دیتا ہے۔ عمر خیام کی یہ رندانہ جرأت کہ پیالہ جب ٹیڑھا کبڑا ہے تو ضرور کمھار کے ہاتھوں میں رعشہ تھا، اور امیر مینائی کی یہ شاعرانہ جودت کہ تصویریں جب ہر صبح و شام پھاڑ کر پھینکی جاری ہیں تو ضرور مصور اپنے فن میں ابھی کچا ہے، یہ دونوں شانِ ایزدی میں سراسر گستاخیاں ہیں۔ کیوں کہ بھول چوک، ہاتھ کانپ جانا، خیال بٹ جانا، تصویر ٹھیک

نہ اترنا، اِن الفاظ کا اطلاق صاحبِ کن فیکون کی ذات پر ہو ہی نہیں سکتا:

دہد نطفہ را صورتے چوں پری
کہ کردہ است بر آب صورت گری

پس تصویر اگر بھونڈی ہے، تو قصداً بھونڈی ہے، اور پیالہ اگر ٹیڑھا ہے تو قصداً ٹیڑھا ہے۔ قصداً اس لیے کہ مصور اور کمھار کو امتحان لینا منظور ہے۔ زہرا بائی کی طرح شریفن کو بھی وہ چشمِ غزالاں دے سکتا تھا مگر قصداً نہیں دیں تاکہ اسی کے ذریعے سے فرزندانِ آدم کا امتحان ہوجائے۔ چنانچہ اِس امتحان کے لیے جب شریفن و زہرا بائی بیک وقت دنیا کے سامنے پیش ہوئیں تو ظاہر پرست نے باعصمت کو ٹھکرا دیا اور فاحشہ کو گلے لگا لیا۔ ہرن کے شکار کے پیچھے ایک اندھی کو کچل ڈالا۔ حالاں کہ وہ اندھی فرزندانِ آدم کے رحم و کرم کی زیادہ مستحق تھی، بہ نسبت اُس کے جو چشمِ غزالاں رکھتی تھی۔ اِس غلط اِملا کو کسی نے درست نہ کیا۔ آنکھ والوں نے یہ بھی نہ سوچا کہ شریفن کی طرح ہمیں اندھے پیدا کیے جاتے تو اُس وقت کیا ہوتا، اور یہ کہ آنکھیں جب ہم کو دی گئی ہیں تو اِس شکرانہ نعمت میں ہم کو دنیا کے تمام نابیناؤں پر لطف و کرم کرنا چاہیے یا نہیں؟ فرزندانِ آدم نے جب نابینا شریفن کو ٹھکرادیا تو اِس کے معنی یہ ہوئے کہ اِس خاص امتحان میں سب کے سب ناکام ہوئے، مگر خود شریفن کے امتحان کی جب باری آئی، یعنی اندھے ہونے کے جرم میں جب کسی نے اُس سے عقد نہ کیا تو اُس وقت اُس نے گم راہی پر فاقے کو ترجیح دی اور عصمت بیچ کر کبھی منہدی نہ لگائی... ان اللہ مع الصابرین... اِس لیے شریفن اِس امتحان میں کامیاب رہی۔ اے خدا کی ہستی سے انکار کرنے والے! اِس دارالامتحان میں جتنے اپاہج، اندھے، لولھے، لنگڑے، دیوانے اور بدصورت ہیں، سب کے سب امتحان کا ایک ذریعہ ہیں، جو اپاہج پیدا کیے گئے، ان کے صبر و تسلیم کا اور جو تن درست اور صاحبِ جمال پیدا کیے گئے، اُن کے لطف و کرم اور انکسار کا، بیک وقت امتحان ہو رہا ہے۔ اِس امتحان کی سرگزشت شیراز کا ایک طالب علم یوں بیان کرتا ہے... ”ہرگز از دورِ زماں نہ نالیدہ ام و روئے از

گردشِ ایام درہم نہ کشیدہ مگر وقتے کہ پایم برہنہ بود و استطاعت پائے پوشی نہ داشتم، بہ جامع کوفہ درآمدم دل تنگ، یکے را دیدم کہ پائے نہ داشت، سپاسِ نعمت حق بجائے آوردم و بر بے کفشی صبر کردم"۔☆[٦] ننگے پاؤں پھرنے کی شکایت کیوں کی جائے، جب اوروں کے پاس پاؤں ہی نہیں۔ مگر اِسی آزمایش میں فرزندانِ آدم کے پاؤں ڈگمگا جاتے ہیں... "آوردہ اند کہ فقیہے دُختر داشت بہ غایت زشت رو، بجائے زنان رسیدہ و باوجود جہاز و نعمت، کسے در مناکحتِ اُو رغبت نہ می کرد۔ فی الجملہ بہ حکم ضرورت باضریرے (نابینائے) عقدِ نکاحش بستند۔ و آوردہ اند کہ حکیمے در آں تاریخ از سراندیپ آمدہ بود کہ دیدۂ نابینا را روشن ہمی کرد۔ فقیہہ را گفتند چرا داماد خود را علاج نہ کنی؟ گفت، ترسم کہ بینا شود دخترم را طلاق دہد"۔☆[٧] اُس فقیہ کو تجربہ ہو چکا تھا کہ لڑکی سنِ بلوغ سے کوسوں آگے بڑھ گئی مگر بدصورتی کے جرم میں دنیا نے اُس کو پوچھا نہیں، خدا خدا کر کے ایک نابینا داماد ملا تو وہ داماد کہاں کا ایسا خدا ترس و خداشناس تھا کہ آنکھیں پا کر اپنی منکوحہ سے وہی سلوک نہ کرتا جو آنکھ والی دنیا کر چکی ہے؟ اِس لیے اندھے داماد کو زندگی بھر اندھا ہی رکھنا خوب تھا۔

الغرض جس طرح اِملا کی غلطیاں قصداً ہیں، اُسی طرح الفاظ کی بے ترتیبی بھی قصداً ہے۔ ممتحن نے اپنے سوالات میں الفاظ کی بے ترتیبی یہ رکھی ہے کہ ابرہہ کی شکست کے لیے ابابیلیں بھیجیں مگر ابوطاہر کو سنگِ اسود اکھاڑنے دیا۔ جناب عیسیٰ ابن مریمؑ کو طمانچے کھانے کے لیے، خاتم النبیینؐ کو کانٹوں پر چلنے کے لیے اور امام الصابرین حسینؑ ابن علیؑ کو ریگ تفتہ پر ذبح ہونے کے لیے چھوڑ دیا۔ مگر فراعنۂ مصر کو صدیوں تک تختِ مصر کی حکمرانی نصیب فرمائی۔ ایک بچے کو بادشاہ کے گھر پیدا کیا، دوسرے کو فقیر کے گھر میں، ایک کو متقی کے گھر میں، دوسرے کو ٹھگ کے گھر میں، ایک کو طوفان کی گود سے بچالیا اور دوسرے کو شفاء الملک کی گود سے چھین لیا:

حسن ز بصرہ، بلال از حبش، صہیب از روم
ز خاکِ مکہ ابوجہل، ایں چہ بوالعجبی است

مگر اے خدا کی ہستی سے انکار کرنے والے! بساطِ شطرنج پر مہروں کی ترتیب صرف کھیل کے پہلے درست رہتی ہے، کھیلتے وقت وہ ترتیب کہاں؟ بازی جس وقت شروع ہوگئی، اُس وقت پیادوں کی قطار اور شاہ کے مصاحبین یمین و یسار کی صف بندی ناممکن ہے۔ کھیل کے وقت فرزیں کے داہنے کبھی پیادہ ہے اور کبھی رُخ، رُخ کے بائیں کبھی پیل ہے اور کبھی اسپ، اور اسپ کبھی بازی کو زیر و زبر کررہا ہے اور کبھی خودنیستی کی خدمت میں پیش ہوگیا۔ اِسی طرح ''اِنِّی جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَہ'' کے اعلان کے بعد جب بساطِ کونین پر مہرے چلنے شروع ہوگئے تو اب وہ اگلی ترتیب و صف بندی کیوں کر قائم رہتی؟ شجرِ ممنوعہ والی جنت میں ہرگز ایسا نہ تھا کہ ایک اپاج و نابینا ہو اور دوسرا تن درست و توانا، ایک گدائے فاقہ کش ہو اور دوسرا صاحبِ تاج و تخت، ایک اسماعیل ذبیح ہو اور دوسرا ہلاکو خاں... اُس جنت میں جو تھے وہ ہم پایہ و ہم سنگ تھے! مگر ہاں جس دن وہ جنت چھن گئی اور مشیتِ ایزدی نے آدم و حوا کو، دارالامتحان میں بھیج دیا، اُسی دن سے وہ تمام بے ترتیبیاں قصداً شروع کر دی گئیں، جو آزمایش کے لیے اشد ضروری سمجھی گئیں۔ اجتماعِ ضدین اور بے ترتیبی آزمایش کے لیے اگر اشد ضروری نہیں ہے تو فرعون کی داڑھی جب اُس کے متبنّیٰ (حضرت موسیٰ علیہ السلام) نے نوچی تھی اور اِس نوچنے پر اُس کو شبہہ ہوا تھا کہ یہ بچہ کہیں وہی تو نہیں ہے جس کے بارے میں نجومیوں نے خبر دی تھی کہ میرا خاتمہ کردے گا اور اِس لیے جب فرعون نے اِس بچے کا امتحان لینا چاہا تو اُس نے ایک تھالی میں آتشیں لعل اور دوسری تھالی میں جلتے ہوئے انگارے اِس بچے کے سامنے کیوں رکھے تھے، یقیناً اِسی آزمایش کے لیے رکھے تھے کہ یہ بچہ اگر فہمیدہ ہے تو انگاروں کی طرف ہاتھ نہ بڑھائے گا اور اگر واقعی ناسمجھ ہے تو انگاروں کو ہاتھ میں لے لے گا... اے خدا کی ہستی سے انکار کرنے والے! پھر یہ کیا ہے کہ اس دارالامتحان میں اجتماعِ ضدین کو دیکھ کر تو چیخ اٹھتا ہے کہ اگر خدا ہوتا تو اس قسم کی بدنظمی کیوں ہونے پاتی؟ تیری باتیں اس ملک الشعرا☆[۸] سے ملتی جلتی ہیں جو ایک مرتبہ خود مرضِ چشم میں گرفتار ہوا تو عرق کی چند

بوتلیں لے کر دکان کھول بیٹھا اور تختی لٹکا دی کہ ''یہاں آنکھوں کا علاج ہوتا ہے، قیمت فی شیشی ایک آنہ''۔ اتفاقاً ایک پردیسی مریض اِس دواخانے میں داخل ہوا تو ملک الشعرا کی اُبلی ہوئی خونِ کبوتر آنکھوں کو دیکھ کر اُس نے ایک شیشی عرق کے لیے دو آنے پیسے دیے۔ ملک الشعرا نے جھنجھلا کر کہا، کیا تجھ کو معلوم نہیں ہے کہ ایک شیشی عرق کی قیمت صرف ایک آنہ ہے؟ خریدار نے جواب دیا کہ ''ایک آنہ زاید اِس لیے ہے کہ حضور بھی اپنی دکان سے ایک شیشی عرق خرید لیں اور اپنی آنکھوں کا علاج کر لیں''۔ معلوم نہیں ملک الشعرا نے اُس ایک آنہ پیسے سے اپنی آنکھوں کا علاج کیا یا نہیں۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ دہریوں نے آج تک اپنی آنکھوں کا علاج نہیں کیا... منطق یہ پیش ہوتی ہے کہ خدا ہوتا تو سامنے ضرور آتا، جب کہا گیا کہ سامنے آنے کی وہ چیز نہیں اور خود تم حضوری کے قابل نہیں، تو عذر یہ ہے کہ بغیر دیکھے ہوئے کیوں کر مانیں، جب کہا گیا کہ نقش پا دیکھ کر پہچان لو، تو کہنے لگے کہ یہ نقش، نقش بر آب ہے، فرضی ہے، موہوم ہے، الٹا سیدھا ہے، بالکل بے ربط ہے۔ یہ کیا کہ حضرت عیسیٰ طمانچے کھائیں اور فرعونی کتے تختِ مصر پر لوٹیں؟

کلمہ گویوں کا جواب یہ ہے کہ اِس قسم کی بے ترتیبی و بے ربطی قصداً ہے، کیوں کہ انکارِ سجدہ کے بعد سے جب شیطان ہمیشہ اسی دھن میں ہے کہ آج رشوت دے کر فرزندانِ آدم کو کسی طرح اپنا کرلو، تا کہ کل یہ کہنے میں آئے کہ ایسے کم ظرفوں کو سجدہ نہ کرنا ہی خوب تھا، تو ایسی حالت میں مشیتِ ایزدی نے بھی یہی چاہا کہ فرزندانِ آدم شیطان کی رشوت قبول کرنے نہ کرنے کا فیصلہ خود ہی کر لیں۔ نسلِ آدم اپنے اعمال و افعال میں خودمختار چھوڑ دی گئی ہے۔ پرندوں کی طرح ہم فضائے آسمانی میں اُڑ نہیں سکتے، مگر دارالامتحان کی سرزمین پر جس طرف چاہیں جاسکتے ہیں اور خانۂ دل میں جس قسم کے خیالات کو جگہ دینا چاہیں دے سکتے ہیں۔ اگر نسلِ آدم اپنے افعال میں مجبور کی جاتی تو پھر میزانِ محشر اور تخلیقِ بہشت و دوزخ کی ضرورت ہی نہ تھی، کیوں کہ مجبوروں سے باز پرس کرنا صریح ظلم ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ لڑکے جو سنِ تمیز کو نہ پہنچے ہوں

یا وہ لوگ جو اپنے حواس میں نہ ہوں، قیودِ مذہب سے آزاد کردیے گئے ہیں۔ اُن کے علاوہ ہر شخص اپنے فعل کا خود ذمے دار ہے کیوں کہ ہر شخص آزاد ہے۔ اِس دارالامتحان میں دیر و حرم کے دروازوں پر ایک ایک تختی لٹکی ہوئی ہے، دیر کی تختی پر بابِ جہنم کندہ ہے۔ راستہ چلنے والوں کے پاؤں بالکل آزاد کردیے گئے ہیں۔ کسی کے پاؤں میں بیڑیاں نہیں ہیں۔ جس کو جس طرف جانا ہو، جاسکتا ہے۔ مگر کس طرف جانا چاہیے اور کس طرف نہ جانا چاہیے، اِس کا اشتہار ہمیشہ ہمیشہ ہوتا رہا ہے۔ عرش نشیں کی سرکار سے ہزاروں قاصد زبانی اور تحریری پیام لا چکے ہیں، گلی گلی منادی کر دی گئی ہے۔ اس اعلان کے بعد بھی ابوجہل حرم کو چھوڑ کر دیر کی طرف جائے تو اُس کی ذمے داری خود ابوجہل پر ہے نہ کہ اللہ یا اُس کے رسولوں پر۔ دہریوں کا اعتراض ہے کہ ابوجہل اگر دیر کی طرف جارہا تھا تو اللہ نے اپنے بندے کو شیطان کے پنجے سے زبردستی چھڑا کیوں نہیں لیا۔ گلہ بان کیسا ہے کہ بکریاں شیر کی طرف جارہی ہیں اور وہ لاٹھی کے زور سے بکریوں کو روکتا نہیں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ پسرِ نوح کو اگر گود میں اٹھا کر زبردستی کشتیِ نوح پر بٹھلادیا جاتا تو پھر امتحان امتحان نہیں باقی رہتا۔ امتحان لینے والے کو یہی تو دیکھنا مقصود ہے کہ کون کون بہ رضا و رغبت اس کی طرف آتا ہے اور کون کون دیدہ و دانستہ ابلیس کی طرف جاتا ہے۔ لَا اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ! یہی وجہ تھی کہ حضرت نوح علیہ السلام نے اتمامِ حجت کے لیے بہ تکرار آواز دی کہ بیٹا! میری کشتی پر اب بھی چلا آ۔ شیطان کی رشوت مت لے۔ مگر بیٹے نے کشتی پر آنے سے جب قطعی انکار کر دیا تو حضرت نوح علیہ السلام نے بھی خموشی اختیار کرلی۔ حضرت نوح اُس وقت سرکاری کام میں تھے۔ سرکاری حکم یہی تھا کہ جو شخص اپنی خوشی سے تمھاری کشتی پر نہ آئے، اُس کو زبردستی مت بٹھلانا۔ اگر یہ حکم نہ دیا جاتا اور پسرِ نوح کو شیطان کے پنجے سے چھڑا کر جبریہ کشتی میں سوار کردیا جاتا تو پھر عبدیت و بغاوت میں کوئی امتیاز باقی نہ رہتا۔ دودھ میں مکھی پڑجاتی اور معصومیت کو معصیت کے ساتھ پہلو بہ پہلو بیٹھنا پڑتا۔ امتحان کے وقت جبر و تشدد ہو نہیں سکتا۔ اگر ہوسکتا تو شداد ابن عاد جس وقت معماروں سے اوّل

اوّل باغِ ارم کی فرمایش کر رہا تھا، اُسی وقت اُس سے جبریہ توبہ کرائی جاتی یا فوراً روح قبض کرلی جاتی، مگر اِن دونوں صورتوں میں امتحان ادھورا رہ جاتا۔ جبریہ توبہ سے امتحان کی اصل و غایت اس لیے فوت ہوتی کہ بہت فرق ہے اُس کتے میں جو اپنے مالک کی آہٹ پاکر خود بخود اُس کے پاس دوڑا جاتا ہے، اور اُس بکری میں جو لاٹھی اور گلے کی رسّی کے زور سے قصاب کے پیچھے پیچھے چلتی ہے... اور فوری قبضِ روح کا حکم دیا جاتا تو دنیا شکایت کرتی کہ باغِ ارم کا محض خیال ظاہر کرنا اور چیز ہے، باغ کا تعمیر کرنا اور چیز ہے۔ غریب شداد نے اپنے خیال پر ابھی عمل کہاں کیا تھا کہ اُس کی روح قبض کرلی گئی... یہی وجہ تھی کہ شداد نے اپنے کفرانِ نعمت کی اور ہمارے اللہ نے اپنے امتحان کی جب تک تکمیل نہ کرلی، اُس وقت تک قبضِ روح کا حکم نہیں دیا گیا۔ اِن دونوں باتوں کی تکمیل اُس وقت ہوئی جب خدائی کا دعویٰ کرنے والا شداد باغِ اِرم کے دروازے پر داخل ہورہا تھا۔

اے خدا کی ہستی سے انکار کرنے والے! ہمارے خدا نے شداد کو طوفان کی گود سے بچا کر اور سیٹھ کروڑی چند کے نوزائیدہ کو شفاء الملک کی گود سے چھین کر دہریوں کے منھ پر دو طمانچے لگائے ہیں۔ کیا بات تھی کہ شفاء الملک کا علم سینہ و سفینہ اور سیٹھ کا گنجِ فراواں جسم و روح میں وصل قائم نہ رکھ سکا۔ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ! قادرِ مطلق کی قدرت کا نظارہ جس کو کرنا ہو، وہ اوّل کی بقا اور ثانی کی فنا دیکھ لے۔ باقی رہا یہ اعتراض کہ ہمارا اللہ جب رحیم ہے تو لاولد سیٹھ کے جگر میں ناسور کیوں ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ ''گندم از گندم بروید جو ز جو''۔ سیٹھ کہتا پھرتا ہے کہ میرے دھرم میں جیو مارنا اس قدر پاپ ہے کہ کھٹمل بھی ہم کو کاٹے تو ہم اُس کو ماریں نہیں بلکہ اٹھا کر باہر پھینک دیں۔ کیوں کہ اپنی زبان کے چٹخارے کے لیے بے زبانوں کا ذبح کرنا خاص مسلمانوں کی شان ہے۔ مگر رحم دل سیٹھ کا دھرم دیکھنا ہو تو اُس کا بہی کھاتا دیکھ لو کہ کس طرح قتلِ عام ہو رہا ہے۔ دیکھ لو کہ سود در سود کی شمشیرِ بے نیام سے کس طرح ہزاروں لاکھوں کے سر قلم ہو رہے ہیں۔ کس طرح یتیموں، بیواؤں، فاقہ کشوں اور دیگر

قرض خواہوں کی قبریں کھود کر رحم دل سیٹھ اِن قبروں پر جابجا مندر اور دھرم شالے بنوا رہا ہے۔ اور دیکھ لو کہ خود اپنے گھر میں چراغ جلانے کے لیے کس طرح وہ ایک جانشین کی تمنا کر رہا ہے۔ ایسے مکار قاتل کی سزا اگر یہ کی گئی کہ جانشین گود میں بٹھلا کر چھین لیا گیا تو اُس میں ظلم کیا ہوا؟ سیٹھ نے خلق اللہ پر ظلم کیا اور خلق اللہ کی آہ نے سیٹھ کی گود سے اس کا بچہ چھنوا لیا، کیوں کہ اِسی بچے کے لیے سیٹھ دولت جمع کر رہا تھا۔

ہمارے اللہ کا قانونِ عدل وانتقام دیکھنا ہو تو دیکھ لو کہ مزدوروں اور فاقہ کشوں کے جھونپڑوں سے نعمتِ اولاد کی یہ فراوانی ہے کہ وہاں پاؤں پھیلا کر کوئی سو نہیں سکتا اور اغنیا اور بادشاہوں کے محلات میں بچوں کا یہ قحط ہے کہ جانشینی کے لیے زیادہ تر غیروں کے بچے گود لیے جاتے ہیں۔ یہ کیوں؟ اِس لیے کہ غربت و امارت، امتحان کا صرف ایک ذریعہ ہے، یعنی جو غریب ہے اُس کے صبر کا اور جو امیر ہے، اُس کے شکر کا، بیک وقت امتحان ہو رہا ہے۔ قارون کو گنجِ بے پایاں دیا گیا مگر اُس نے احسان فراموشی کی اور اِس لیے شداد کی طرح وہ بھی سزایاب ہوا۔ خاتم النّبیینؐ نے اپنی غربت و فاقہ کشی پر الفقر فخری کا اعلان کیا اور اِس لیے انعام میں ''خیرالبشر'' کا تمغا پایا۔ ''گندم از گندم بروید جو ز جو۔'' شیطان کی رشوت قبول کرنے نہ کرنے کا فیصلہ ہر شخص خود کرتا ہے۔ لااکراہ فی الدین۔ پس فراعنہ نے رشوت قبول کر لی، مگر جناب عیسیٰ نے خدا کی راہ میں خود طمانچے کھا کر شیطان کو طمانچے لگائے ہیں۔

اگر خدا، جناب عیسیٰ کو طمانچے کھانے کے لیے، حضرت خیرالبشرؐ کو کانٹوں پر چلنے کے لیے اور جناب سیّد الشہدا کو ریگ تفتہ پر ذبح ہونے کے لیے چھوڑ نہ دیتا تو اے خدا کی ہستی سے انکار کرنے والے! آج دنیا کو کس طرح پتا چلتا کہ فدائیوں کی شان کیا ہے اور شیطان کی رشوت کس کس نے قبول نہیں کی۔ اور ہمارا اللہ اپنے ہر فدائی کو حضرت ابراہیمؑ کی طرح آتشِ نمرود سے، حضرت موسیٰؑ کی طرح تعاقبِ فرعون سے اور حضرت عیسیٰ کی طرح صلیب جہود سے، اگر بچا لیتا تو شیطان اُس وقت یقینی چیخ

انھتا کہ واہ وا تلوار کی جھنکار اور چیز ہے، تلوار کا گلے پر چلنا اور چیز ہے۔ ہر شخص جب حضرت اسماعیل کی طرح چھری سے بچالیا گیا تو فرزندانِ آدم کے امتحان کی تکمیل کب اور کس پر ہوگی؟ پس فدائیانِ ماسبق کے امتحانات کی تکمیل جب ساحلِ فرات و دربارِ یزید و قید خانۂ دمشق میں ہورہی تھی، اُس وقت تکمیل میں نقص رہ جاتا، اگر فوج الٰہی و فوج ابلیس کی باہمی زور آزمائیوں میں تائیدِ الٰہی آکر ذرا بھی دخل دے دیتی اور پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تسلیم و رضا، نیاز و عبدیت، دعویٰ الفقر فخری و طلاقِ دنیا یک قلم ناممکن العمل ہوجاتے۔ دارالامتحان میں پھر جو بھی آتا وہ یہی کہتا کہ علاء الدین کا چراغ ہم کو بھی مل جاتا تو ہم بھی رات بھر میں موتی محل تیار کردیتے۔ مسلمانوں کے خدا نے بے شک اپنے ایک فدائی کو آتشِ نمرود سے بچالیا اور دوسرے فدائی کو شمشیرِ شمر کا شکار ہونے دیا تاکہ فرزندانِ آدم باغِ ابراہیم کی سند پاکر وعدۂ باغِ جنت کو مشکوک نہ سمجھیں اور سرفروشیِ حسین کی سند پاکر تسلیم و رضا کو ناممکن العمل نہ سمجھیں، مگر یاد رہے کہ اِن زبردست اسناد و نظائر کے ہوتے ہوئے جب یزید نے شیطان کی رشوت قبول کرلی اور اصحابِ فیل کا انجام ہونے کے بعد بھی جب ابوطاہر نے بیت اللہ کو تاراج کیا تو اللہ نے بھی یزید و ابوطاہر کی جرأت و ہمت دیکھ کر دونوں کی رسّی دراز کردی۔ ورنہ نمرود والا مچھر اور اصحابِ فیل والی ابابیلیں ہمارے اللہ کے پاس ہر وقت موجود ہیں۔ خود ابلیس کے ساتھ بھی یہی رویہ اختیار کیا گیا تھا۔ چنانچہ بزمِ قدس سے نکالے جانے کے بعد وہ جہنم کی چہار دیواری میں بالکل محبوس نہیں کردیا گیا بلکہ اُس کی رسّی اتنی دراز کردی گئی کہ بھیس بدل کر جنت آدم میں وہ باریاب بھی ہوا، شجرِ ممنوعہ کا راز بھی فاش کرسکا، اور اس دارالامتحان میں آدم و حوا کی تشریف آوری کے وقت سے اُس کو اِس کی بھی اجازت ہے کہ جب تک امتحان ہوتا رہے، وہ نسلِ آدم کو رشوت دے کر یہ بھی مشاہدہ کرتا رہے کہ ''کون کتنے پانی میں ہے''۔ اور ''کون کتنے پانی میں ہے''۔ زلیخا کے دستِ ہوس اور پائے ناز، چشمِ فسوں ساز و جبینِ نیاز، سنِ شباب و کمندِ التجا کی متحدہ زور آزمائیاں ایک طرف اور ایک پردیسی غلام کی ''نہیں نہیں'' دوسری طرف:

کیوں کر اُس کی نگہِ ناز سے جینا ہوگا
زہر دے، اُس پہ یہ تاکید کہ پینا ہوگا

کاجل کی کوٹھری سے کورا نکل آنا اور قعرِ دریا میں تختہ بند ہونے کے بعد بھی دامن تر نہ کرنا، واقعہ یہ ہے کہ ماہِ کنعاں کی روحانی معراج تھی! اور اِسی مشاہدے نے آشکارا کردیا کہ مٹی اشرف المخلوقات کیوں گردانی گئی اور ملائکہ اُس کے آگے سجدہ کرنے پر کیوں مجبور کیے گئے۔ کون کتنے پانی میں ہے؟... سپہ سالار علی بیگ خاں لکھنوی،[☆۹] عباس ایرانی سے کہتا ہے کہ اس مرتبہ عشرۂ محرم میں ہم کو ایک یزید کی ضرورت ہے، تم کو قبول ہو تو دو ہزار کی تھیلی حاضر ہے۔ عباس ایرانی لکھنؤ کا ایک معمولی دکان دار، دو ہزار کا نام سن کر فوراً راضی ہوجاتا ہے۔ عشرۂ محرم شروع ہوتا ہے۔ لکھنؤ کا عشرہ اور وہ بھی آصف الدولہ کے زمانے کا! لاکھوں کا مجمع ہے جس میں عباس ایرانی کے بیسیوں بھائی بند اور روز کے ملنے والے بھی موجود ہیں۔ اتنے میں عباس ایرانی یزید کے بھیس میں آتا ہے، اور سامان تو پہلے ہی سے موجود ہیں، عباس کے آتے ہی دربار دمشق کی سماں بندی شروع ہوجاتی ہے۔ دیکھو دیکھو وہ ناقے آرہے ہیں، ناقوں پر فاقہ کش بیبیاں ہیں، سرننگے ہیں، چادریں چھن چکی ہیں۔ ساحلِ فرات سے پیاسی آرہی ہیں، تلواروں کے سائے میں ہیں۔ ناقے کی مہار ایک بیمار کے ہاتھ میں ہے، بیمار پاپیادہ ہے، پاپیادہ ہے مگر پا بہ زنجیر ہے، زنجیریں بھاری ہیں۔ جھنکار زنجیروں کی سنائی نہیں دیتی، قہقہوں کی آواز سب پر بالا ہے۔ آج یوم العید ہے۔ تماشائی گویا سیلِ دریا ہیں۔ بلند نیزوں پر شہیدوں کے سر ہیں، ایک نیزے پر شباب الجنۃ (کے سردار) کا سر ہے۔ یہ سر تحفتاً دربار میں پیش ہوتا ہے۔ کس طرح پیش ہوتا ہے؟ ایک طشت میں۔ کہاں رکھا جاتا ہے؟ تاج دارِ دمشق کے پیروں کے پاس۔ تاج دار کیا کرتا ہے؟ بید کی چھڑی سے ٹھکراتا ہے؟ کس چیز کو ٹھکراتا ہے؟ لب ہائے شہید کو۔ کیوں ٹھکراتا ہے؟ تاکہ قبرِ مدینہ کی دیواریں ہٹ جائیں۔ کیوں ہٹ جائیں؟ اس لیے کہ صاحب قبر مطہر اِنھیں لبوں کے بوسے لیا کرتے تھے!

اِس سماں بندی کے بعد اب ایرانیوں کو تاب کہاں؟ ہر گوشے سے "بکُش بکُش، بزن بزن" کے نعرے بلند ہوتے ہیں۔ بے خودی میں سیکڑوں تلواریں بے نیام

ہوتی ہیں، بجلی کی طرح یزید کے سر پر چمکتی ہیں، مصنوعی یزید خود اپنے بھائی بندوں کو شمشیر بہ کف دیکھ کر چلاتا ہے: ''ہاں ہاں میں یزید نہیں، تم لوگ پاگل ہو، میں عباس ہوں عباس، شہیدِ کربلا کا ماتم دار ہوں، دشمن نہیں، ٹھہرو ٹھہرو، میں عباس ہوں، اچھی طرح پہچان لو، یزید نہیں ہوں، عباس عباس، عبا.....''۔ مگر سیکڑوں تلواریں اُس عباسی یزید کو چشم زدن میں قیمہ کر ڈالتی ہیں... اللہ رے یزید کی نحوست! جس کسی نے ایک گھنٹے کے لیے بھی تفریحاً یزید بننا چاہا، اُس کو مزہ مل گیا کہ اِس نام کی برکت کیا ہے۔

کون کتنے پانی میں ہے؟... دمشق کی جامع مسجد میں نمازِ جمعہ کے لیے نمازی آچکے ہیں۔خلیفہ ولید ثانی☆۱۰ کی خدمت میں آدمی پر آدمی جاتے ہیں کہ یاامیرالمومنین! اب صرف آپ ہی کا انتظار ہے، امیرالمومنین جواب دیتے ہیں کہ چلو ہم فوراً آئے۔ خدا خدا کرکے امیرالمومنین مسجد میں تشریف لاتے ہیں۔ ہزاروں نمازی صف بہ صف ایستادہ ہیں۔ امیرالمومنین امامت شروع کرتے ہیں۔ امامت ختم ہوتی ہے۔ اب نمازی مصافحے کے لیے آگے بڑھتے ہیں۔ امیرالمومنین کو کسی کی دل شکنی منظور نہیں۔ امیرالمومنین بھی اپنا ہاتھ مصافحے کے لیے بڑھاتے ہیں... ایں! یہ ہاتھ تو واقعی چومنے کے قابل ہیں، پنجۂ مرجان، مخملی ہتھیلیاں، پتلی انگلیاں، نازک کلائیاں صاف بتا رہی ہیں کہ ہاتھ کسی زلیخا یا عیش بائی کے ہاتھ ہیں۔ ''حضرت امیرالمومنین خود نیامدہ اند، امّا برائے عزت افزائیِ بیت اللہ و تفریحِ نماز گزاراں، معشوقۂ خود را فرستادہ اند''... نمازی اب سر پیٹ رہے ہیں۔مگر سر پیٹنے سے کیا ہوتا ہے۔ امیرالمومنین کی معشوقہ، امیرالمؤمنین کے حکم سے، امیرالمومنین کے بھیس میں آئی بھی اور نمازِ جمعہ پڑھا کر اب واپس بھی جا رہی ہے!

کون کتنے پانی میں ہے؟... مہاراجہ شتاب رائے،☆۱۱ عظیم آباد کا نائب ناظم، ایک مرتبہ جنرل اسمتھ سے ملنے کے لیے باڑھ جاتا ہے۔ باڑھ میں ایک مندر کے پشت پر خیمہ زن ہوتا ہے، مندر کے چالاک برہمن تاک کر خدمت میں کب حاضر ہوتے ہیں جب شتاب رائے جنرل اسمتھ سے ملنے کے لیے پالکی میں بیٹھ رہا ہے۔

شگون کا وقت ہے۔ برہمن دست بستہ عرض کرتے ہیں: ''مہاراج! آنند، آنند! جہاں پر تم کھڑے ہو وہ جگہ مہاپتر ہے۔ خود مہا دیو جی کے چرن اس کو چھو چکے ہیں، آج پورنیما ہے، پجاریوں پر بھی مہاراج کی دیا ہو''۔ شتاب رائے جواب دیتا ہے: ''یہ باتیں تم اُس سے کرنا جو یہاں تیرتھ کو آیا ہو، یا مندر میں درشن کا بھوکا ہو، ہم کو تم سے یا تمھارے مندر سے کیا کام''۔ یہ کہہ کر پالکی میں بیٹھ جاتا ہے اور کسی کو ایک ایک کوڑی نہیں دیتا۔

مہاراجہ شتاب رائے جب کوئی نیا محل تعمیر کرتا ہے تو بھائی بند دوست احباب تقاضا کرتے ہیں کہ برہمنوں کو بھوج دے کر محل کی نیو اور اپنا دھرم مضبوط کرلو... شتاب رائے جواب دیتا ہے کہ گرجاں طلبی مضائقہ نیست، مگر اپنے مکان کو ہم نجس نہیں کرسکتے، برہمنوں کو بھوج دینا ایسا ہی فرض ہے تو گنگا کا کنارہ موجود ہے، روپے ہم سے لے لو۔ مہاراجہ شتاب رائے کا سخن تکیہ اٹھتے بیٹھتے ''واللہ باللہ'' ہے، ہر سال مشکل کشا کا دسترخوان چنتا ہے، ماہِ صیام میں شب ضربت آتی ہے تو کھیر اور مٹھائیوں پر فاتحہ دے کر تمام شہر میں تقسیم کرتا ہے اور اپنے دونوں لڑکوں کا ختنہ کراتا ہے۔ اِس کھلم کھلا بغاوت پر خاندان بھر میں کہرام مچتا ہے، تالیفِ قلب کے نسخے تجویز ہو رہے ہیں۔ مرلی دھر، رائے قتل داس اور سرو سنگھ احباب خاص اصرار کرتے ہیں کہ شہر میں ایک برہمن آیا ہوا ہے، رشی ہے، مہاتما ہے، درشن کے قابل ہے، تم بھی چلو۔ شتاب رائے مجبوراً ساتھ ہو لیتا ہے۔ گرگِ باراں دیدہ برہمن مہاراجہ شتاب رائے کو دیکھ کر اپنا وار یوں شروع کرتا ہے: ''مہاراج ہم نے تمھارا جنم پترا دیکھ کر ایک بچار کیا ہے، نام بہت سندر ہے، رات دن تم اِسی نام کا مالا جپا کرو''۔ شتاب رائے شیشے کا جواب پتھر سے دیتا ہے: ''جوگی مہاراج! اللہ کے ایک ہزار ایک نام ہیں، اِنھیں ناموں میں سے ایک نام اپنے لیے ہم پہلے ہی بچار چکے ہیں''۔ برہمن گھبرا کر پوچھتا ہے کہ آخر وہ کون سا نام ہے۔ شتاب رائے کہتا ہے کہ وہ نام بتانے کا نہیں۔ برہمن کہتا ہے کہ جب بتانے کا نہیں تو جپنے کا بھی نہیں ہے۔ شتاب رائے کہتا ہے، اچھا سنو، وہ نام

''رحیم'' ہے۔ نبض شناس برہمن قہقہہ مار کر کہتا ہے: ''مہاراج! رام اور رحیم تو ایک ہی پرماتما کے دو نام ہیں۔ شتاب رائے ہیرے کو ہیرے سے کاٹتا ہے: ''گروجی مہاراج! اب آگے نہ بڑھنا، رام کو رحیم سے کیا نسبت؟ رام کا نام سنتے ہی وسترتھ یاد آجاتا ہے، رام بیٹا اور وسترتھ باپ، مگر اللہ کے نام میں جھالر پھندنا کچھ بھی نہیں، اس نام میں کسی رشتے ناتے کی بو تک نہیں''۔

کون کتنے پانی میں ہے؟... پنڈت دیا شنکر کی مثنوی ''گلزارنسیم'' پڑھ کر برہمن لوگ مارے غصے کے بھبوت ہو رہے ہیں۔ پنڈت سے پوچھتے ہیں: ''ایں! خیر تو ہے! تیرے منھ سے حمد، نعت اور منقبت کیسی؟ اللہ، رسولؐ، پنجتنؓ کے رشتے جوڑنے کے کیا معنی؟'' پنڈت دیا شنکر آخر شاعر ہے، فی البدیہ کہتا ہے: ''مہاراج! اس میں چیں بہ جبیں ہونے کی کیا بات ہے؟ میری مثنوی کا مطلع پڑھیے:

ہر شاخ میں ہے شگوفہ کاری

ثمرہ ہے قلم کا حمدِ باری

یعنی اپنے ''ہر'' کا نام ہم نے پہلے لے لیا تھا، تب حمد باری شروع کی۔ برہمنوں کے ماتھے پر اب ایک شکن نہیں، سب خوش خوش گھر واپس جارہے ہیں، مگر پنڈت دیا شنکر قلم ہاتھ میں لے کر اُس کو یوں مخاطب کرتا ہے: ''ارے سنتا ہے؟ یہ رسائیِ فکر اور گلوخلاصی ثمرہ ہے، حمد باری کا۔ اللہ کی حمد نہ کہتے ہوتے تو اُس وقت یقینی شہ مات تھی!''

''کون کتنے پانی میں ہے؟...'' بکسر کی لڑائی کو دس برس ہوچکے ہیں۔ شجاع الدولہ تختِ اودھ کی بہاریں دیکھ رہا ہے۔ یکایک قریبِ ناف پر ایک پھوڑا[☆۱۲] نمودار ہوتا ہے۔ پھوڑا کیا ہے ایک چھوٹا تربزہ ہے۔ پھوڑا پھوٹتا ہے۔ اطبا کہتے ہیں کہ یہ لاعلاج ہے۔ آخر یہ پھوڑا ہوا کیوں کر؟ چشم دید گواہ کہتے ہیں کہ حافظ رحمت خاں سپہ سالار روہیل کھنڈ جب مارا گیا تو شجاع الدولہ نے اُس کی بیوی بچوں کو حرم سرا میں نظر بند کیا۔ مرحوم کی ایک لڑکی تھی، دوشیزہ، سترہ کا سن، کشیدہ قامت، صاحب جمال، باعصمت! شجاع الدولہ نے ہم آغوشی چاہی، ناجائز و جبریہ ہم آغوشی۔ لڑکی جب خلوت

میں طلب ہونے لگی تو ماں نے بلاکر کہا: "بیٹی! یاد رکھنا کہ تیری رگوں میں سپہ سالار حافظ رحمت خاں کا خون ہے! تو اِس لیے پیدا نہیں ہوئی تھی کہ کسی کی داشتہ بن کر رہے، بالخصوص اُس کی داشتہ جو تیرے باپ کا قاتل ہے"۔ دوشیزہ نے اپنی زلفوں میں ایک زہر آلود چاقو چھپالیا اور خلوت میں حاضر ہوئی۔ شجاع الدولہ نے بسترِ عیش پر شجرِ ممنوعہ سے پھل توڑا، مگر اِسی عالم میں دوشیزہ کے زہر آلود چاقو نے عیش پسند کو غم کا سبق پڑھایا۔ عیش پسند نے اِسی کرب و اذیت میں خواجہ سراؤں کو اشارہ کیا۔ تین خواجہ سراؤں نے دوشیزہ کو خنجر سے فوراً ٹھنڈا کر دیا، آیندہ کے خدشوں سے بچنے کے لیے دو ہزار بیگمیں شاہی محل سے شہر بدر کی گئیں۔ اِن دو ہزار میں چار سو ایسی تھیں جنھیں سات برس کی مدت میں یعنی دو ہزار پانچ سو پچپن راتوں میں صرف دو بار شجاع الدولہ کی ہم بستری نصیب ہوئی تھی۔ الغرض چشم دید گواہ کہتے ہیں کہ یہ پھوڑا اُسی زہر آلود چاقو کی یادگار ہے، مگر اور لوگ کہتے ہیں کہ نہیں، آج سے ایک برس پہلے ایسا ہی زخم پشت یا شانے پر نمودار ہوا تھا... شجاع الدولہ نے پانچ لاکھ روپے کی نذر مانی تھی اور جب صحت یاب ہوا تھا، تو نذر اتار بھی دی گئی... شجاع الدولہ پر کیا ہے، اُس کے باپ اور نانا کو بھی یہی عارضہ تھا اور اِسی میں دونوں فوت بھی ہوئے۔ پس یہ پھوڑا کسی زہر آلود چاقو کا اثر نہیں ہے بلکہ باپ اور نانا سے ترکے میں ملا ہے۔ کوچہ و بازار میں اُس طرف یہی روایتیں مشہور ہو رہی ہیں اور اس طرف شاہی محل میں اندھیرا ہو رہا ہے۔ پھوڑا اپنے شباب پر ہے۔ اِس شباب کو زوال نہیں۔ شجاع الدولہ پریشان ہوکر فیض آباد جاتا ہے۔ وہاں کی آب و ہوا بے فیض ثابت ہوتی ہے۔ یہاں بھی وہی پھوڑا ہے اور وہی جاں کندنی ہے۔ ۲۲ر ذیقعدہ روز پنج شنبہ ۱۱۸۸ ہجری اِس جاں کندنی سے نجات ہوتی ہے۔

کون کتنے پانی میں ہے؟... شجاع الدولہ کو غسلِ میت[☆۱۳] دیا جا رہا ہے۔ غسل و کفن ہو چکا، اب جنازہ محل کے باہر آگیا ہے۔ جنازہ کہاں جا رہا ہے؟ گلاب باغ جا رہا ہے۔ یہ باغ کہاں ہے؟ چار میل کے فاصلے پر۔ جنازے کے ساتھ کون کون ہیں؟

مرزا علی خاں اور سالار جنگ ہیں، وزرائے سلطنت اور مشاہیر فوج ہیں، شاہی خاندان اور متوسلینِ خاندان ہیں، غرضے کہ فیض آباد کی ٹھیکری ہے، ہاتھی گھوڑوں کی قطار پیچھے ہے، کیا یہ سب لوگ چار میل تک پیدل ہی جائیں گے؟ دو میل کی مسافت طے ہوچکی، مگر دیکھ لو شانہ بدلنے کے لیے لوگ اب بھی ٹوٹے پڑ رہے ہیں... ایں! یہ ماتم داروں کی صف چیرتے ہوئے کون بدتمیز چلے آرہے ہیں؟ یہ بدتمیز قاصد ہیں مرزا امانی کے۔ مرزا امانی کون؟ مرزا امانی عرف آصف الدولہ۔ جس کا جنازہ جارہا ہے، اُسی کا سپوت بیٹا۔ کیا آصف الدولہ اپنے باپ کے جنازے کے ساتھ نہیں ہے؟ ساتھ ہوتا تو ہرکارے کیوں بھیجتا۔ آخر ساتھ کیوں نہیں ہے؟ اپنی سعادت مندی کا ثبوت دے رہا ہے۔ ہرکارے کیوں بھیجے ہیں؟ مرزا علی خاں اور سالار جنگ کو پیام آیا ہے کہ جنازہ چھوڑ کر میرے پاس فوراً چلے آئیں۔ یہ دونوں آصف الدولہ کے کون ہیں؟ سگے ماموں ہیں! ماموں ہرکاروں سے کیا کہہ رہے ہیں! کہہ رہے ہیں کہ جنازہ جب تک گلاب باغ نہ پہنچ لے ہم کیوں کر چھوڑیں اور چھوڑیں بھی تو خلق اللہ کیا کہے گی... ایں! اب یہ دوسرے ہرکارے صفِ ماتم کو چیرتے ہوئے کیوں آئے ہیں؟ یہ حکم لے کر آئے ہیں کہ دونوں ماموں اگر یوں نہ آئیں تو پکڑ کر لاؤ۔ تب؟ دونوں ماموں مجبوراً جنازے کو چھوڑ کر جارہے ہیں اور خلق اللہ انگشت بہ دنداں ہے۔ ماموں بھانجے میں کیا گفتگو ہورہی ہے؟ بھانجا اپنے دونوں ماموں سے کہہ رہا ہے کہ باپ کا غم ہوتا رہے گا، پہلے آپ لوگ ہم کو جانشین قرار دے لیجیے۔ پھر؟... پھر یہی کہ دونوں ماموں کانوں پر ہاتھ رکھ رہے ہیں کہ اتنی عجلت کیوں ہے؟ مگر بھانجا کہتا ہے کہ واہ! نمازِ میت کے بعد ہی گلاب باغ میں اگر میرا چھوٹا بھائی مرزا سعادت علی جانشین قرار دے دیا گیا تو پھر ہم کیا کرلیں گے؟ تب؟ تب یہی کہ مرزا علی خاں سالار جنگ اور کرنل کلیس مجبوراً آصف الدولہ کے سر پر شاہی عمامہ باندھ رہے ہیں، فوجی باجا تخت نشینی کا اعلان کر رہا ہے۔ جنازے کے ساتھ جتنے مشاہیر تھے، سب دربار میں بلا لیے گئے ہیں۔ صرف غربا و مساکین نمازِ میت کے لیے چھوڑ دیے گئے ہیں۔ اِس طرف سپوت بیٹا مشاہیرِ سلطنت

کی نذریں لے رہا ہے اور اُس طرف باپ کی لاش پیوند خاک ہو رہی ہے۔ مرزا امانی عرف آصف الدولہ تختِ اودھ پر بیٹھ کر کیا کرتا ہے؟ سب سے پہلا کام یہ کرتا ہے کہ اپنے پالکی بردار کہار کو ''راجا مہرا'' کا خطاب دے کر امورِ سلطنت میں شریک کرتا ہے!

کون کتنے پانی میں ہے؟... جنگ پلاسی میں سراج الدولہ کی طرف سے میر مدن دھاوا کر رہا ہے، اتنے میں ایک توپ کا گولہ آتا ہے، اور میر مدن کی ران غائب۔ میر مدن کا انجام دیکھ کر سراج الدولہ اپنی ٹوپی میر جعفر خاں سپہ سالار کے پاؤں پر رکھتا ہے کہ اب میری جان اور آبرو تمھارے ہاتھ میں ہے۔ میر جعفر خاں کہتا ہے کہ اب اِس وقت تو شام ہوئی کل صبح دیکھا جائے گا۔ اب یہی گفتگو ہو رہی ہے کہ اتنے میں موہن لال، سراج الدولہ کی طرف سے آگے بڑھ گیا، اُس کو بڑھتا دیکھ کر میر جعفر خاں حکم دیتا ہے کہ ''موہن لال بھاگ آؤ۔'' سراج الدولہ میر جعفر کا منھ تکتا ہے۔ میر جعفر خاں جواب دیتا ہے کہ ''حضور میری تو یہی رائے ہے''۔ موہن لال کو بھاگتا دیکھ کر فوج کے پاؤں اکھڑ جاتے ہیں۔ سراج الدولہ اب میدان میں بے یار و غم گسار اکیلا کھڑا ہے، مجبوراً میدان چھوڑتا ہے، رات بھر چلتا ہے، آٹھ بجے صبح کو منصور گنج محل میں پہنچتا ہے۔ افسرانِ فوج کو حکم دیتا ہے کہ کم سے کم میری ذاتی حفاظت کے لیے محل میں پہرے کا سامان کردو۔ ایک سپاہی نہیں آتا۔ اِس عالم میں تین بجے رات کو محل سے پوشیدہ فرار ہوتا ہے۔ بھگوان گولہ سے ہوتا ہوا ناؤ پر راج محل کے دوسرے ساحل پر پہنچتا ہے۔ صرف ایک گھنٹے کے لیے اترتا ہے کہ کھچڑی☆[۱۴] پکا کر تین دن کا فاقہ توڑے۔ تین برس کی بچی جو ساتھ ہے وہ بھی فاقے سے ہے۔ سراج الدولہ چولھا سلگانے بیٹھتا ہے، قریب میں شاہ دانا کا جھونپڑا ہے۔ شاہ دانا فاقہ کشوں کے پاس آتا ہے۔ دیکھ کر سر پیٹتا ہے، کہتا ہے کہ حضور فقیروں کا نان و نمک قبول ہو۔ نان و نمک حاضر کرنے کے لیے شاہ دانا اپنے جھونپڑے میں واپس جاتا ہے، وہاں پہنچ کر میر قاسم اور میر داؤد کو خفیہ خبر بھیجتا ہے کہ... ''جلد آؤ! تمھارا شکار اِس وقت میرے دام میں ہے''... شکاری پہنچتے ہیں... سراج الدولہ صید ہو کر مرشدآباد آتا ہے۔ دوپہر کا وقت ہے، میر جعفر خاں اب شاہِ بنگالہ ہے، بھنگ کے نشے میں بے ہوش پڑا ہے۔ اُس کا بیٹا میرن حکم دیتا ہے کہ سراج الدولہ کو بغل کے کمرے میں بند کرو۔ پھر میرن اپنے

مصاحبینِ خاص میں سے محمدی بیگ کو قیدی کے کمرے میں بھیجتا ہے۔ جلاد کے ہاتھ میں ننگی تلوار دیکھ کر سراج الدولہ عرض کرتا ہے کہ وضو کے لیے تھوڑا سا پانی دے دو کہ ''نمازِ توبہ'' پڑھ لیں۔ محمدی بیگ توبہ کا دشمن ہے، اِس لیے پانی دینے سے انکار کرتا ہے۔ سراج الدولہ چلاتا ہے۔ ''پانی پانی۔ ایک گھونٹ پانی، خدا کی راہ میں''... شمر اُس کی پیاس بجھاتا ہے، مگر صرف آبِ شمشیر سے۔ سراج الدولہ اِسی جاں کندنی میں در و دیوار سے کہتا ہے: ''بس بس! ہم چلے! الفراق، اے دنیا الفراق! آج حسین قلی خاں کا خون بے باق''۔ جلاد اپنی شمشیرِ خوں آشام سے لاش کو پارچہ پارچہ کرتا ہے۔ میرن اس نعشِ صد پارہ کو ہاتھی پر رکھوا کر مرشدآباد کے بازاروں میں گشت کے لیے بھیجتا ہے۔ فیل بان اپنی کسی ضرورت سے ہاتھی کو اتفاقیہ بازار میں ٹھہراتا ہے، مگر ہاتھی جس دروازے کے سامنے اُس وقت رکتا ہے، وہ خدا کی شان کہ حسین قلی خاں کا دروازہ ہے۔ ہاتھی رکتا ہے اور نعشِ صد پارہ سے خون کے چند قطرے ٹھیک اُسی جگہ پر گرتے ہیں، جہاں آج سے دو برس پہلے شام کے وقت سراج الدولہ نے حسین قلی خاں کا خون بہایا تھا۔ بے شک حسین قلی خاں کا خون آج بے باق ہوگیا۔ ہاتھی اب آگے بڑھتا ہے، اُس محل سے گزرتا ہے جہاں سراج الدولہ کی ماں آمنہ بیگم ہے۔ کسی نے آمنہ بیگم سے کہہ دیا کہ... ''بی بی! تم کو بسنت کی کچھ خبر بھی ہے؟ جوان بیٹے کی لاش گشت کے لیے جارہی ہے''۔ آمنہ بیگم چیخ مارتی ہوئی ننگے پاؤں، ننگے سر، زنان خانے سے بازار میں دوڑی آتی ہے۔ بیٹے کی لاش پر گر کر بلائیں لیتی ہے۔ آمنہ بیگم کی فغان و سینہ کوبی سے بازار میں زلزلہ آگیا۔ خلقِ خدا ماتم کر رہی ہے۔ شقی القلب خادم حسین اپنی چھت سے یہ تماشا دیکھ رہا ہے۔ اپنے عصا برداروں کو دوڑاتا ہے۔ عصا بردار بازار میں آتے ہیں اور آمنہ بیگم کو تھپڑ، گھونسے اور لاٹھیوں سے مار کر بیٹے کی لاش سے چھڑاتے ہیں۔ اب ہاتھی آگے بڑھتا ہے۔ اِدھر نعشِ صد پارہ گشت ہو رہی ہے اور اُدھر میر جعفر خاں بھنگ کے نشے سے ہوش میں آتا ہے۔ خبر ہوتی ہے کہ سراج الدولہ قید ہوکر آگیا، میرن کو رقعہ لکھتا ہے کہ... ''بیٹا قیدی بھاگنے نہ پائے، خبردار''... میرن حاملِ رقعہ سے کہتا ہے کہ... ''ابا جان سے کہہ دیجیو کہ آپ کا بیٹا آپ سے زیادہ تیز ہے''۔

کون کتنے پانی میں ہے؟... سراج الدولہ کے بعد اُس کے چھوٹے بھائی مرزا مہدی[☆۱۵] کی باری آتی ہے۔ پندرہ برس کا لڑکا، نہایت حسین، دو تختوں میں داب کر مار

ڈالا جاتا ہے۔ اِس کے بعد آمنہ بیگم اپنی بڑی بہن گھسیٹی بی بی کے ساتھ قید کر کے ڈھاکا بھیجی جاتی ہے۔ جسارت خاں، گورنر ڈھاکا کو میرن خط بھیجتا ہے کہ اِن دونوں کو وہیں دریا میں ڈبا دو۔ جسارت خاں جواب دیتا ہے کہ گورنری کو سات سلام، مگر یہ اندھیر[۱۶☆] ہم سے نہ ہوگا۔ تب میرن اُس کو لکھتا ہے کہ اچھا حاملِ رقعہ کے ساتھ اِن دونوں کو میرے پاس مرشدآباد بھیج دو۔ جسارت خاں دونوں کو حاملِ رقعہ کے ساتھ کر دیتا ہے۔ میرن کا قاصد دونوں کے ساتھ ناوٗ پر سوار ہوتا ہے۔ جب ناوٗ ایک سنسان مقام پر پہنچتی ہے تو قاصد کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں کیوں کہ اب اُس کو میرن کے پوشیدہ حکم کو بجا لانا ہے۔ کہتا ہے کہ... ''بی بیو! آج تمام دن تم لوگوں نے کچھ کھایا نہیں ہے۔ بہتر ہے کہ فاقہ شکنی کرلو اور اجلے کپڑے بدل لو، کیوں کہ یہ آخری سفر ہے''۔ آخری سفر کا نام سن کر گھسیٹی بی بی اور آمنہ بیگم تھرا جاتی ہیں۔ پھر چھوٹی بہن سنبھل کر بڑی بہن سے کہتی ہے کہ ''سنو جی! موت سے ڈرنا کیا، جو آتا ہے مرنے کے لیے آتا ہے، عید مناوٗ کہ اس خونِ ناحق سے ہم دونوں کے گناہوں کی گٹھری خود بخود میرن کے سر پر چلی جائے گی۔ موت کی موت، کفارے کا کفارہ اور انتقام کا انتقام، ایسی موت تو قسمتوں سے ملتی ہے''۔ یہ کہہ کر دونوں بہنیں وضو کرتی ہیں، کفن کی جگہ اجلے کپڑے پہنتی ہیں، خاکِ شفا ملتی ہیں، دعائے توبہ پڑھتی ہیں، پھر میرن کے قاصد سے کہتی ہیں کہ ہم دونوں اب تیار ہیں، بھیا! تم اپنا کام کرلو''۔ قاصد ہچکچاتا ہے۔ یہ کہہ کر دونوں بہنیں ہاتھ پھیلا کر بہ آواز بلند توبہ مانگتی ہیں کہ: ''خدایا! اپنی گنہ گار کنیزوں کی آواز سن، جس رکابی میں میرن آج کھا رہا ہے، وہ رکابی تیری کنیزوں کی ہے، کنیزیں گنہ گار ہیں تو تیری، محسن کش میرن کی سرکوبی کے لیے اپنے قہر کی بجلی بھیج اور اپنی کنیزوں کا انتقام لے''۔ اِس مناجات و فریاد کے بعد دونوں بہنیں قبلہ رُو ہوتی ہیں، کلمہ پڑھتی ہیں، خاکِ شفا کو بوسہ دیتی ہیں اور ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر بیک وقت دریا میں کود پڑتی ہیں...

کون کتنے پانی میں ہے؟... جس شب کو دریائی موجوں نے گھسیٹی بی بی اور آمنہ کو اپنی آغوش میں لیا، اُسی شب کو تقریباً تین سو کوس کے فاصلے پر میرن اپنے مصاحبینِ خاص کے ساتھ دریا کے کنارے خیمہ زن ہے۔ شروع برسات ہے، بادل کی گرج اور موسلادھار پانی سے عاجز ہوکر گیارہ بجے رات کو اپنے بڑے خیمے میں سے

ایک مختصر دلیر خانی خیمے[17] میں پناہ کے لیے آتا ہے۔ اس چھوٹے خیمے میں آ کر میرن ابھی پلنگ پر لیٹ ہی رہا تھا کہ اتنے میں بجلی خیمے کو چیرتی ہوئی آتی ہے اور اُس کے سر پر گرتی ہے، اب دیکھا جاتا ہے تو پلنگ کے سرہانے پٹی جل کر راکھ ہوگئی ہے مگر خود میرن کا جسم راکھ نہیں ہے، بلکہ سر میں چھ سوراخ اور پیٹھ پر چھ سات کوڑوں کے نشان ہیں۔ اخفائے موت کے لیے یہ لاش صبح کو ہاتھی پر گشت کرائی جاتی ہے، وہ اِس طور پر کہ دونوں پاؤں ہودج سے باہر لٹک رہے ہیں تاکہ دیکھنے والے سمجھیں کہ میرن بیمار ہے اور سو رہا ہے۔ مگر دیکھنے والے فوراً سمجھ جاتے ہیں کہ یہ بیمار نہیں مردہ ہے اور یہ مردہ اُسی کا ہے جس نے آج سے تین برس پہلے سراج الدولہ کی نعشِ صد پارہ ہاتھی پر گشت کرائی تھی۔ کیا خوب سودا نقد ہے، اِس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے...

کون کتنے پانی میں ہے؟... میرن کا باپ میر جعفر شاہ بنگالہ، ۷۴۔۷۵ برس کا بڈھا، بسترِ علالت پر پڑا ہے۔ جسم مبروص ہے۔ شعبان کی چودھویں، سہ شنبہ کا دن ۱۱۷۸ ہجری ہے۔ آثارِ موت نمایاں ہیں۔ مہاراجہ نندکمار عیادت کو آیا ہوا ہے۔ معلوم ہوا کہ نواح مرشدآباد میں... کرت کونا مندر... ہے، اُس مندر میں دیوتاؤں[18] پر جو جل چڑھایا جاتا ہے، آبِ حیات ہے۔ میر جعفر خاں حکم دیتا ہے کہ دیوتاؤں کا اُلش فوراً حاضر کیا جائے۔ مندر سے آبِ حیات آتا ہے۔ دیوتاؤں کا پانی میر جعفر خاں کی آخری پیاس بجھاتا ہے۔ آخری پیاس اِس لیے کہ یہ آبِ حیات حلق سے اترتا ہے اور میر جعفر دریائے ممات میں غرق ہوجاتا ہے۔

اے خدا کی ہستی سے انکار کرنے والے! شیطان کی ریشہ دوانیوں کا اندازہ کرنا ہو تو اِن اسناد و نظائر کو دیکھ لے۔ قیافہ شناس ابلیس صورت دیکھ کر سمجھ جاتا ہے کہ کون کتنے پانی میں ہے اور پھر جس کو جیسا پاتا ہے، ویسی ہی رشوت دیتا ہے۔ کسی سے کہتا ہے کہ تُف ہے تمھاری صیدافگنی پر کہ رحمت خاں کی پارسا لڑکی اب تک شکار نہیں ہوئی۔ کسی سے کہتا ہے کہ شاید تم نے مکڑیوں کا جال کبھی دیکھا نہیں کہ مکڑیاں گھر بیٹھے کس طرح بادشاہت کرتی ہیں۔ پس جنازے کے ساتھ گلاب باغ جانے سے کہیں بہتر یہ ہے کہ جنازے کے ساتھ جتنے لوگ ہیں، اُنھیں کو اپنے پاس پکڑوا بلاؤ... کسی سے کہتا ہے کہ خضر و سکندر کو شرمانا ہو تو کرت کونا مندر سے دیوتاؤں کا اُلش منگوا کر پی لو۔ کسی سے کہتا ہے کہ بہشتِ شداد کی تمنا ہو تو علی وردی خاں شاہ بنگالہ کی صاحب زادیوں اور

نواسوں کے سینے پر چڑھ کے بہشت کا دروازہ کھولو۔ کسی سے کہتا ہے کہ امیرالمومنین کسی کا غلام نہیں ہے کہ نمازِ جمعہ پڑھانے کے لیے ہر آٹھویں دن مسجد دوڑا جائے، طلبی کے لیے اگر آدمی پر آدمی آرہا ہے تو کیوں نہیں تم اپنی محبوبہ کو اُس وقت امامت کے لیے بھیج دیتے ہو؟

کہاں پھر جوانی، کہاں پھر یہ جوش
غفور است ایزد تو ساغر بنوش

کسی سے کہتا ہے عشرۂ محرم کا ڈراما مؤثر ہو نہیں سکتا جب تک یزید کا انتظام نہ کیا جائے۔ خبردار! یزید کی تلاش میں تم روپے کا منہ مت دیکھنا، دو ہزار میں بھی کوئی آدمی مل جائے تو غنیمت جاننا۔ کسی سے کہتا ہے کہ بھائی ایک گھنٹے کے لیے یزید بن جانے میں آخر نقصان کیا ہے؟ ایمان میں خلل کیوں آنے لگا؟ کیا امام حسین تم سے گلہ کرنے آئیں گے؟ ارے دو ہزار کی رقم اِس وقت مفت مل رہی ہے، اِس کو لے لے، بعد میں عاقبت سنوار لینا۔

اللہ کے بندے جب شیطان کی رشوت قبول کرلینے کا تہیہ کرتے ہیں تو بالعموم اُن کی رسّی اور دراز کردی جاتی ہے تاکہ اسی ذریعے سے اور لوگوں کی آزمایش ہوسکے۔ چنانچہ یزید نے جب شیطنت اختیار کرلی تو یزید کے ساتھ دیگر بندگانِ خدا کا بھی امتحان ہوگیا یعنی ابلیس پرست شمر کی طرح ہزاروں لاکھوں نے یزید کا ساتھ دیا۔ لیکن خدا پرست حُر کی طرح چند آدمیوں نے امام الصابرین کا ساتھ دیا۔ فوجِ ابلیس کو وقتی عروج اور فوجِ الٰہی کو وقتی زوال یقینی ہوا، مگر اِسی عروج و زوال میں ایک بہت بڑا امتحان پنہاں تھا:

اسپِ تازی شدہ مجروح بزیرِ پالاں
طوقِ زرّیں ہمہ در گردنِ خر می بینم

دہریے اِس طریقۂ امتحان سے ناواقف ہیں، اِس لیے فوجِ الٰہی کی وقتی شکست کو دیکھ کر فوراً خدا کی ہستی سے انکار کردیتے ہیں اور انکار کی وجہ یہ پیش کرتے ہیں کہ اگر خدا موجود تھا تو اپنے فدائیوں کی ذلت کیوں دیکھتا رہا۔ کلمہ گویوں کا جواب یہ ہے کہ جس خدا نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو طمانچے کھانے کے لیے چھوڑ دیا تھا، اُسی خدا نے امام الصابرین کو بھی ریگِ تفتہ پر ذبح ہونے کے لیے مصلحتاً چھوڑ دیا

تھا، تاکہ دیکھے: فوجِ الٰہی کی شکست دیکھ کر ابلیس کے جھنڈے کے نیچے کون کون جا کر پناہ لیتا ہے۔

حواشی:

۱۔ ہسٹری آف سے رے سنز، مصنفہ جسٹس امیر علی، ص۸۹۔۸۸

۲۔ ایضاً، ص۲۲۳

۳۔ ایضاً، ص ۲۹۸

۴۔ انجیل۔

۵۔ دربارِ اکبری، ص۶۶۱۔۶۵۹

۶۔ گلستان سعدی، باب سوم

۷۔ گلستان سعدی، باب دوم

۸۔ اورینٹل بایوگرافی مؤلفہ مسٹر بیل، مطبوعہ لندن ایلن کمپنی، ص۲۸۰ و ۳۷۰۔ ملک الشعرا کا تخلص شیخی تھا۔ سلطان مراد اول (آلِ عثمان) کے دربار میں تھا۔

۹۔ سیر المتاخرین، جلد چہارم، ص۶۸، حاشیہ

۱۰۔ ہسٹری آف سے رے سنز، مصنفہ جسٹس امیر علی، ص۱۹۶

۱۱۔ سیر المتاخرین، جلد سوم، ص ۶۴۔۶۱

۱۲۔ سیر المتاخرین، جلد چہارم، ص ۶۲۔۶۰ نیز حاشیہ ص۶۸۔۶۷

۱۳۔ سیر المتاخرین، جلد چہارم، ص ۷۱۔۶۸

۱۴۔ سیر المتاخرین، ایضاً

۱۵۔ سیر المتاخرین، جلد دوم، ص۲۵۱

۱۶۔ ایضاً ص ۳۶۹۔۷۱

۱۷۔ سیر المتاخرین، جلد دوم، ص ۶۶۔۳۶۵، ۷۳۔۳۷۱

۱۸۔ مرشد آباد نگر سے کرت کونا مندر صرف ایک کوس ہے۔ مشہور ہے کہ دَکھا نام ایک دیوتا نے اپنے یہاں دعوت میں سب دیوتاؤں کو مدعو کیا مگر اپنی بیٹی ستی کو اور داماد شیو جی کو فہرست سے چھانٹ دیا۔ بیٹی ناخواندہ مہمان بن کر اپنے باپ کے گھر گئی بھی تو دیوتاؤں کی برادری نے اُس کی طرف رخ نہ کیا۔ اسی غم میں ستی نے خودکشی کر لی۔ شیو جی کو اس کی خبر ہوئی تو وہاں دوڑا گیا اور اپنی بیوی کی لاش کندھے پر رکھ کر ناچنا شروع کیا۔ اس رقص سے اہلِ محفل کے ہوش اُڑ گئے۔ دنیا میں زلزلہ آ گیا، مجبور ہو کر سب دیوتاؤں نے مل کر بشنو دیوتا سے فریاد کی کہ شیوجی اگر یوں ہی ناچتا رہا تو دنیا پاش پاش ہو جائے گی۔ یہ سن کر بشنو نے ستی کی لاش کو جو شیوجی کے کندھے پر تھی، اپنے رتھ کے پہیوں سے ٹکڑے ٹکڑے کرنا شروع کیا، نہ رہے گا بانس، نہ بجے گی بانسری! لاش کے ۵۲ ٹکڑے ممالک ہند و آسام میں ۵۲ مقامات پر گرے، مثلاً کمروپ کھیا میں اندام نہانی کٹ کر گرا اور دیوگھر میں جہاں بیج ناتھ کا مندر ہے، دل کٹ کر گرا اور بقیہ حصے کالی گھاٹ (کلکتہ) اور دُرگا باڑی (بنارس) وغیرہ میں گرے۔ اس لاش کے سر پر جو تاج تھا، اس کا ٹکڑا اُس مقام پر گرا جہاں اب کرت کونا مندر ہے، کرت بہ معنی تاج، کونا بمعنی ٹکڑا... کرت کونا... یعنی تاج کا ٹکڑا...

[''علی گڑھ میگزین'' علی گڑھ۔ تعطیلات نمبر ۱۹۲۴ء]